بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہار حقیقت

بجواب

(خلافت و ملوکیت)

جلد اول

مصنفہ

مفکر اسلام مولانا مفتی محمد اسحاق صدیقی ندوی

ملنے کا پتہ

ضیاء برادرس بک ایجنٹ

اظہارِ حقیقت

بجوابِ

خلافت و ملوکیت

جلد اوّل

مصنّفہ

مولانا محمد اسحٰق صدیقی ندوی

سابق مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشرین

دارالکتب امدادیہ ۳۴۲/۸ عزیز آباد، کراچی

مصنف	مولانا محمد اسحٰق صدیقی ندوی
بار اول	۳۰۰۰ (تین ہزار)
طابع	آئیڈیل پیکیجز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
کتابت	سید امیر حسین مجلات رقم
ناشر	دار الکتب امدادیہ ۳۴۲ عزیز آباد کراچی
قیمت	[illegible]

فہرستِ مضامین

حرفِ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْد

خاتم النبیین سید المرسلین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و رسالت پر قرآن مجید میں جو دلائل قاہرہ قائم کئے گئے ہیں ان میں آنحضورؐ کے تلامذہ یعنی صحابہ کرامؓ کی سیرت مقدسہ اور ان کے بے مثال کردار کو ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب مبین میں صحابہ کرام کی مدح و ستائش اتنی کثرت و تکرار کے ساتھ وارد ہوئی ہے کہ صرف قرآن مجید سے ان کی سیرت مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ دلیل فطرت انسانی کو اپیل کرتی ہے کیونکہ استاد کی کامیابی شاگردوں کے کمال میں نظر آتی ہے جس استاد کے سب شاگرد کامل و مکمل ہوں اس کے کمال میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں باقی رہتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر صحابی اپنی جگہ ایک دلیل نبوت ہے۔ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کو مجروح کرنے کے معنی ایک دلیل نبوت و رسالت کو کمزور کرنے کے ہیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی قائم کی ہوئی دلیل نبوت کمزور نہیں ہوسکتی۔ اس کا نتیجہ صریح ہے کہ جس نے کسی صحابی کو مجروح کیا وہ غلطی پر ہے اس کی جرح سے وہ صحابی تو مجروح نہیں ہوتے لیکن وہ خود مجروح ہو جاتا ہے۔

صحابۂ کرام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّلین تلامذہ، آپ کی رسالت کے اوّلین مبلغ اور آنحضورؐ کے بعد آپ کے نمائندہ تھے۔ پوری امت کو دین حق انہیں حضرات کے ذریعہ سے پہنچا، زمانہ رسالت کے بعد صحابہ کرام متفرق ہو گئے تھے۔ دنیا کے مختلف اطراف و جہات میں دین اسلام اور شریعت محمدیہ

کی دعوت و تعلیم کے لیے پہنچ گئے تھے۔ فرض کیجیے کہ کسی مقام پر ایک ایسے صحابی پہنچتے ہیں، جن کی سیرت اور جن کے کردار میں مقررہ معیار کے لحاظ سے پستی ہے (معاذ اللہ) تو ایسی بستی کے رہنے والے ان کے معلم جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ کیا ان لوگوں کے دل میں آنحضورؐ کی وہی عظمت پیدا ہوگی جو ہونا چاہئے؟ یقیناً وہ یہ سمجھیں گے کہ اصلاح باطن کے لئے آنحضورؐ کی صحبت مقدسہ بھی کوئی یقینی علاج نہیں ہے۔ اور جب ایمان باضافۂ بعض اعمال صالحہ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا مجموعہ بھی اصلاح باطن میں کمال اور قرب الٰہی کا مرتبہ دلانے سے قاصر ہے تو صرف ایمان اور جزوی عمل صالح سے کوئی محروم صحبت کس طرح ان مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے؟ پھر کیا وہ دوسرے صحابہ کرام کے متعلق شک شبہ میں مبتلا ہوں گے؟ یقیناً انہیں یہ خیال ہوگا کہ جیسا کیرکٹر ان صاحب کا ہے ممکن ہے کہ ایسا ہی ان صحابیوں کا بھی ہو جنہیں ہم نے نہیں دیکھا ہے۔ اس طرح پوری شریعت ان کی نگاہ میں مشکوک و مشتبہ ہو جائے گی کیونکہ شرع شریف صرف قولاً نہیں منتقل ہوئی ہے بلکہ عملاً بھی منتقل ہوئی ہے۔ اگر وہ ایک صحابی کا عمل خلاف شریعت دیکھیں گے تو دوسرے نادیدہ اصحاب کے متعلق بھی انہیں یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے بلکہ ہوگا کہ شاید ان سے جو عمل منقول ہے وہ شریعت کے مطابق نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ آنحضورؐ کی شان "تزکیہ" کے بارے میں بھی انہیں یہ خیال پیدا ہوگا کہ کامل نہ تھی ورنہ یہ ایک صحابی ان کا مظہر بننے سے کیوں محروم رہتے۔[عله] آپ نے دیکھا کہ صرف ایک صحابی کا دامن چھوٹنے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ "العروۃ الوثقیٰ" پر ہماری گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں دامن رسول بھی ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ اسی سے قیاس کر لیجیے کہ اگر ہم صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت کے متعلق سوءِ ظن

عله بطور مثال دیکھیے کہ اگر جماعت اسلامی کا ایک فرد بھی کسی جگہ برے کردار کا اظہار کرے تو کیا پوری جماعت بدنام نہ ہوگی۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

قائم کرلیں اور انہیں حب جاہ، حبِّ مال، دنیا داری، بددیانتی، خیانت وغیرہ امراض خبیثہ میں مبتلا سمجھیں تو نتائج کس قدر ہولناک ہوں گے۔

مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" ایک خاص جماعت صحابہ کے ساتھ خصوصاً اور عام صحابہ کے ساتھ عموماً سوءِ ظن پیدا کرتی ہے۔ اور ان کی تصویر ایسے ٹیڑھے زاویہ سے پیش کرتی ہے کہ جو قاری ان کے بیانات کو صحیح سمجھ لے اس کے دل میں صحابۂ کرام کی عظمت بمنزلۂ صفر ہوجاتی ہے بلکہ مرتبہ صحابیت کی کوئی اہمیت و عظمت اس کے دل میں نہیں باقی رہتی۔ اس کا کیا اثر اور نتیجہ ہوسکتا ہے؟ اس کا اندازہ ہر ذی فہم کرسکتا ہے۔

راقم السطور کی کوشش اسی "خلافت و ملوکیت" کے زہر کے ازالہ کے لئے تریاق مہیا کرنے کے مرادف ہے۔ کتاب کی جلد اول پاکستان میں قریباً ڈیڑھ سال ہوئے شائع ہوچکی ہے۔ ترمیم و اضافے کے ساتھ دوبارہ پیش کی جارہی ہے، جلد ثانی پہلی بار شائع ہورہی ہے۔

اسے لکھنے سے مقصد محض جواب دینا نہیں ہے بلکہ واقعات و مسائل کی تحقیق اور صحیح مسلک اہلسنت کا اظہار حقیقی مقصد ہے۔ مخالفین صحابہ کے پروپیگنڈے اور ہماری غفلت کی وجہ سے تاریخی واقعات اور ان سے تعلق رکھنے والے بہت سے مسائل کے بارے میں خود اہل سنت بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں، اور صرف عوام نہیں بلکہ علماء کی خاصی تعداد بھی شیعی افکار سے متاثر نظر آتی ہے۔ الحمد للہ کہ ان غلط فہمیوں کا پردہ چاک کر کے حقائق کا روشن چہرہ بے حجاب کر دیا گیا ہے۔ اگر حقیقت کو دیکھ کر بھی کوئی رُو گردانی کرے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

یہ واضح کردوں کہ مجھے جماعت اسلامی سے بحیثیت جماعت کوئی مخالفت نہیں ہے۔ میں تو ان افکار باطلہ کا مخالف ہوں جو مودودی صاحب نے پھیلائے ہیں، وہ اس ضلال کا سرچشمہ ہیں اس لئے ان کا مخالف ہوں، مگر میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ جماعت میں دو قسم کے افراد ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو

ان کی کورانہ تقلید میں مبتلا اور ان کے زیغ و ضلال میں ان کا ہم نوا ہے۔ میں مجبور ہوں کہ انہیں بھی مودودی صاحب ہی کی صف میں بٹھاؤں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ان کے افکار باطلہ اور خیالات فاسدہ سے شدید اختلاف رکھتا ہے لیکن انہیں ایک سیاسی قائد قرار دے کر ان کے پیچھے چل رہا ہے۔ اول الذکر گروہ میرا مخاطب نہیں ہے، البتہ ثانی الذکر گروہ سے چند مخلصانہ اور خیر خواہانہ گذارشیں کرتا ہوں۔

۱۔ کتاب کو جماعتی عصبیت سے بالاتر ہو کر انصاف کی نظر سے دیکھیں اس کے ساتھ حق تعالیٰ جل شانہٗ سے حق واضح ہونے کی دعا بھی کریں ان شاء اللہ مسلک اہل سنت کی صداقت روشن ہو جائے گی اور جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ مسلک اہل سنت والجماعت ہی کی ترجمانی ہے۔

۲۔ سیاست دین سے خارج نہیں مگر کل دین بھی نہیں ہے بلکہ دین کا ایک شعبہ ہے۔ دینی سیاست اور لادینی سیاست میں یہ فرق ہے کہ مومن سیاست کو دینی اور ایمانی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے یعنی کسی سیاسی اقدام سے پہلے وہ یہ سوچتا ہے کہ شرعاً یہ اقدام جائز ہے یا نہیں؟ پھر یہ سوچتا ہے کہ اس اقدام کا اثر ہماری دینی زندگی پر کیا پڑے گا؟ دنیاوی مفاد و مصالح پر اس کی نظر اس کے بعد جاتی ہے اور ان کی رعایت پر ہمیشہ دینی مصالح و مقاصد کی رعایت کو مقدم رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ سیاسی حوادث کو بھی اسی زاویہ سے دیکھتا ہے اور اسی معیار پر پرکھتا ہے۔ بخلاف اس کے لادینی سیاست کا پیرو ان امور پر ہمیشہ دنیاوی مصالح و مقاصد پیش نظر رکھ کر کرتا ہے۔ دینی مصالح و مقاصد سے اسے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

لیکن اگر کوئی شخص پورے دین کو سیاسی زاویۂ نظر سے دیکھنے لگے تو یہ قلب موضوع بہت خطرناک بے ترتیبی ہوگی جس کا نتیجہ گمراہی کی صورت میں نکلے گا۔

آپ حضرات غور فرمائیں تو محسوس ہوگا کہ مودودی صاحب نے جماعت کو یہی معکوس زاویۂ نظر دیا ہے۔ انہوں نے سیاست کو دینی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی تعلیم دینے کے بجائے پورے دین کو سیاسی

زاویۂ نظر سے دیکھنا سکھایا ہے ۔ یہ ایسا ٹیڑھا زاویۂ نظر ہے جس سے اسلام کی بہت سی حقیقتیں نظر ہی نہیں آتیں ، اور جو نظر آتی ہیں وہ بھی بسا اوقات اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ یہ خالص شیعی زاویۂ نظر ہے ۔ آپ شیعہ مذہب کا مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ثقلین کو ہدایت کرنا اور بندوں کا تعلق اپنے معبود سے قائم کرنا نہیں تھا بلکہ اپنے خاندان کی حکومت و خلافت قائم کرنا تھا (معاذ اللہ)

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر آپ مودودی صاحب کی دعوتی تحریروں کا مطالعہ پھر ایکبار کریں تو آپ کو یہی زاویۂ نظر بہت معمولی اور غیر اہم فرق کے ساتھ ان کے یہاں بھی نظر آئے گا چاہئے یہ تھا کہ " سیاست " کو " دین " کی روشنی میں دیکھا جاتا مگر انہوں نے " دین " کو " سیاست " کی روشنی میں دیکھا ۔

۳ ۔ مودودی صاحب نے اسلامی حکومت کے قیام کے کام پر آپ سب کو جمع کیا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ۱۳ سو برس کے زمانہ میں وہ صرف بارہ تیرہ سال اپنی صحیح شکل میں قائم رہی ۔ حضرت عثمانؓ ہی کے زمانہ سے اس میں تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا ۔ حضرت علیؓ نے اصلاح کرنا چاہی مگر ناکام رہے حضرت حسنؓ نے بھی صرف چھ ماہ کی کوشش کے بعد اس سے دستکشی اختیار کر لی ۔ ان کے بعد ان کی اصطلاحی " ملوکیت " کا دور شروع ہو گیا اور خلافت کا ایسا خاتمہ ہوا کہ آج تک وہ عنقا ہے گویا اسلامی حکومت کے تیرہ سو سال میں زیادہ سے زیادہ تیس ۳۰ سال قائم رہی ۔ اس میں بھی خاصا زمانہ ایسا گزرا جس میں اس کا کمال رخصت ہو چکا تھا اور اس کی ناقص شکل باقی رہ گئی تھی ۔ اس نظریہ سے کیا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ " اسلامی حکومت " نظری طور پر بہت اچھی ہے لیکن اس کا عملی وجود غیر ممکن ہے ؟ پھر جب وہ عملاً غیر ممکن ہے تو اس کے لئے جد وجہد کرنا اضاعت وقت نہیں ہے تو اور کیا ہے ؟ مہربانی فرما کر اس سوال پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اسلامی حکومت کا نعرہ لگانے کے بعد صحابہ کرام کو مجروح کرنا کیسے برگ شاخ

دین می برید" کا مصداق بن جاتا ہے یا نہیں ؟

اس کے بعد یہ بھی سوچیے کہ مودودی صاحب آپ کو کدھر لئے جا رہے ہیں ؟ اسلامی حکومت کی جانب یا شیعیت کی جانب ؟

اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اس احسان عظیم کا شکر کیسے ادا ہو کہ انہوں نے محمود عباسی پر معاصی کو صحابۂ کرام اور مسلک اہل سنت والجماعت کی حمایت اور ان کی جانب سے دفاع کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی قبروں کو انوار رحمت سے پُر کر دیں جن کی کفش برداری کے طفیل میں میرے ایسے ہیچمدان اور عاصی کو اس خدمت عظیمہ کی توفیق ارزانی فرمائی گئی ہے رفع اللہ درجاتہم

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

ادارہ دار الکتب امدادیہ بھی مستحق شکریہ ہے جس نے اس کی نشر و اشاعت کر کے دین کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ترقی و کامیابی عطا فرمائیں۔ دعا ہے کہ محب مخلص جناب سید حسن صاحب کو اللہ تعالیٰ اپنے مقبولین میں شامل فرما کر اجر جزیل عطا فرمائیں اور فلاح دارین سے نوازیں کہ انہوں نے جملہ اخراجات طباعت کی کفالت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کتاب کو قبول فرمائیں اور اسے سبب ہدایت اور مقبول بنائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ
وَعَلٰى اَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّاتِهٖ اَجْمَعِيْنَ ؁

احقر
محمد اسحاق صدیقی ندوی
عفی اللہ عنہ

۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ

اظہارِ حقیقت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا
مُحَمَّدٍ وَّاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

○

ذرہ حقیر بن مہر بنایا نہ جائے گا
عرشِ بریں کو فرش پہ لایا نہ جائیگا

چشمِ حسود گرچہ ہو سو بار خونفشاں
خندیدہ گل کو خار بنایا نہ جائیگا

ہر چند زشت رو کے لئے غم فزا ہے
الزام آئینہ پہ لگایا نہ جائیگا

جو گل ہو لطفِ احمدِ مرسل سے باغ باغ
اس پر خزاں کا داغ لگایا نہ جائیگا

نورِ صحابہ حرکتِ اعدا پہ خندہ زن
"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

○

خاتم النبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم جب دین حق لیکر دنیا میں تشریف لائے تو اس کی تابانی کے سامنے ہر مذہب و دین کا چراغ ماند اور بے نور ہو گیا "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کا وعدۂ الٰہی پورا ہوا اور دلائل و براہین کے میدان میں باطل نے ایسی سخت شکست کھائی کہ میدان چھوڑنا ہی پڑا۔ اس کے ساتھ حق تعالٰے نے سیاسی غلبہ بھی عطا فرمایا۔ گویا باطل ذہنی و فکری میدان اور جنگ کے میدان دونوں ہی میں منہزم اور ذلیل و خوار ہوا۔ تاہم شیطان اپنی فکر سے غافل نہ رہا۔ اسلام سے دشمنی و عداوت کی جو آگ اہل باطل کے سینوں میں بھڑک رہی تھی اور جس کی حدت و تمازت میں پیہم شکستوں نے اور اضافہ کر دیا تھا، ان کی فکر کے لئے قوت محرکہ بن گئی اور انہوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے بلکہ بزعم خود اسے مٹانے کے لئے نفاق اور مکر و فریب کا راستہ تجویز کیا۔

یہود جنہیں قرآن مجید نے "مفسدین" کی سند عطا کی ہے اور جو فتنہ پردازی، فساد انگیزی اور ذلیل سے ذلیل قسم کی فریب کاری میں اقوام عالم کے درمیان ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں اس راستہ کے دریافت کرنے والے اور شاید سب سے پہلے اس پر گامزن ہونے والے تھے۔

خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس زمانہ میں ذلیل و مخذول یہودی سردار عبد اللہ ابن ابی ابن سلول نے اسلام کے خلاف ایک خفیہ تحریک شروع کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ بظاہر مسلمانوں کے ساتھ ملے رہو اور اپنے اسلام کا اظہار کرتے رہو لیکن خفیہ طور پر اسے جتنا نقصان پہنچا سکتے ہو پہنچاؤ۔ منافق مذکور کی سرکردگی و قیادت میں یہ پارٹی کبھی تو مسلمانوں کو دین کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا

کرنے کی سعی لاحاصل کرتی تھی کبھی اطراف و جوانب کے کفار کو مدینہ طیبہ پر چڑھائی کرنے کیلئے اُبھارتی تھی۔ کبھی مسلمانوں کے اندر جماعتی یا نسلی عصبیت ابھار کر یا اور کسی ذریعہ کو کام میں لا کر تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنا چاہتی تھی۔ کبھی یہ بد باطن منافق مسلمانوں پر غلط اتہامات لگا کر ان کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود سید الاولین و آخرین صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کے لئے غلط خبریں مشہور کرتے تھے۔ حد ہو گئی کہ انہیں منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ زوجہا وعلیہا الصلوٰۃ والسلام پر بہتان باندھنے سے بھی دریغ نہ کیا اور ایک سر تا پا غلط افترا کیا۔

منافقین کی اس جماعت نے خفیہ تدبیروں اور فریب کارانہ چالوں کے ذریعہ پوری پوری کوشش کی کہ دین اسلام کی ترقی و اشاعت رک جائے اور آئندہ نسلوں تک پہنچنے سے پہلے یہ آب حیات شک و بے اعتمادی، تحریف و تبدیلی، تفرقہ و خلاف کے ریگستانوں میں پہنچکر خشک ہو جائے۔

منافقین خوب سمجھتے تھے کہ نبی کریم ؐ جیسے صاحب خلق عظیم کی شخصیت عظیمہ کو بدنام کرنا اور آنحضور ؐ کے آفتاب عظمت کو افترا پردازیوں کے غبار سے چھپا دینا تو اس وقت ناممکن ہے لیکن یہ البتہ ممکن ہے کہ آئندہ نسلوں یا دور افتادگان کی نظروں میں جن کا علم محض خبر و روایت پر مبنی ہوتا ہے حضور ؐ کی شخصیت عظیمہ کا وقار کم کرا دیا جائے۔ اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کی شکست کے زخموں کے لئے بہت تسکین بخش مرہم ثابت ہو گا۔ لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ صحابۂ کرام کی مقدس و مطہر جماعت تھی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی، علوم نبویہ کو پہنچانے کا بے پناہ شوق، کلمۃ الحق کو بلند کرنے اور اس پر جان نثار کرنے کا بے پناہ جذبہ، اسی کے ساتھ ان کی پاکیزہ، بے داغ متقیانہ نورانی زندگی جس کی وجہ سے ہر صحابی مستقل طور پر نبوت محمدیہ علیہ الف الف تحیہ کی ایک یقینی دلیل و برہان تھا، ایسے حقائق تھے، جو

منافقین کی ہمتوں کو پست کئے دیتے تھے اور ان کا رہوار فکر اس مرحلہ پر آکر رک جاتا تھا۔

لیکن یہود کے مفسد دماغ نے باعانت ابلیس رجیم اس دیوار کو توڑنے کی تدبیر بھی سوچ لی۔ ان کے ابلیسی ذہن نے انہیں سکھایا کہ خود صحابہ کرامؓ ہی کی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کرو۔ افترا پردازی، غلط بیانی، واقعات کی غلط توجیہات اور دروغ بیانی کے ذریعہ سے صحابہ کرام کی مقدس ہستیوں کو اس قدر مجروح و بے اعتبار کر دو کہ دور افتادہ حضرات اور آئندہ نسلیں ان کی طرف سے اچھی طرح بدظن ہوجائیں۔ ان پر اعتماد ختم ہونے کے بعد چند نتائج خود بخود سامنے آجائیں گے۔

۱۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان تربیت و تزکیہ کا معجزہ مشکوک و مشتبہ ہوجائیگا (معاذ اللہ) آنحضورؐ کا یہ معجزہ ایسا ہے کہ مخالفین اسلام بھی اسے اعجاز اور حیرت انگیز خارق عادت کارنامہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اگر صحابہ کرامؓ کو مجروح قرار دے کر اس معجزہ کو عالم بدہن چھپایا جاسکے تو اسلام کی جانب غیر مسلموں کی کشش بھی ختم ہوجائے گی اور خود مسلمانوں کے دلوں میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور وقعت کم ہوجائے گی یہ دونوں نتیجے منافقین کے پیش نظر تھے۔

۲۔ پورا دین مشکوک و مشتبہ ہوجائے گا، اس لئے کہ اس کے ناقل اول تو صحابہ کرام ہی ہیں اگر ان پر اعتماد باقی نہ رہا تو گویا اس زنجیر کی پہلی کڑی ٹوٹ گئی جو امت کو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ کرتی ہے۔ اس کے بعد سب کڑیاں خود بخود بیکار ہوجائیں گی۔ اور تسلسل و اتصال ختم ہوجائے گا۔ نہ قرآن مجید امت کے ہاتھوں میں رہے گا نہ سنت نبوی کا دامن۔ چنانچہ غالی شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں جس کی بنیاد یہی صحابہ پر بے اعتمادی ہے یہ نتیجہ بھی منافقین کے پیش نظر تھا۔

۳۔ وحی ربانی اور صاحب وحی دونوں کا مشاہدہ کرنے والے خود نبی اعظم سے براہ راست دین کو سیکھنے والے صحابہ کرام ہی تھے۔ وہ سب سے زیادہ دین کو سمجھنے والے تھے، ان پر بے اعتمادی کے بعد آدمی ان کے واسطے کے بغیر قرآن و حدیث کو محض ان کے الفاظ سے سمجھنے کی کوشش کریگا۔

اور یہ چیز اسے غلط فہمیوں میں مبتلا کر دے گی۔ چنانچہ جتنے فرق باطلہ اس وقت موجود ہیں اور جو دنیا سے جا چکے ہیں۔ صحابۂ کرام پر بے اعتمادی ان سب میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ صحابۂ کرام کو اپنا مقتدا بنا کر اور ان کے قول و عمل کی امداد سے جو شخص کتاب و سنت کو سمجھنے کی کوشش کرے گا وہ کبھی گمراہی سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس اگر صحابہ کے قول و عمل کو نظر انداز کر کے اور ان پر بے اعتمادی کے ساتھ کتاب و سنت پر نظر کی جائے تو غلط فہمی کا قوی اندیشہ ہے۔ صحابۂ کرام پر سے اعتماد زائل کر کے منافقین آئندہ نسلوں کے لئے بدعت و ضلال اور تفریق و اختلاف کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے

ان مذموم مقاصد کے پیش نظر منافقین نے صحابۂ کرام کو بدنام کرنے اور انہیں (معاذ اللہ) ذلیل و رسوا کرنے کی پوری پوری کوشش کی قرآن مجید اور احادیث نبویہ ہمارے اس قول کے شاہد ہیں بطور نمونہ ایک دو آیتیں پیش کرتا ہوں۔

هم الذين يقولون لا تنفقوا على من عند رسول الله حتى ينفضوا ولله خزائن السموت والارض ولكن المنافقين لا يفقهون ه	یہی (منافقین) وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں (یعنی صحابۂ کرام) ان پر کچھ خرچ نہ کرو تاکہ وہ منتشر ہو جائیں حرف اللہ ہی کی ملک ہیں سب خزانے ہیں آسمانوں اور زمین کے مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔
(پ۲۸ المنافقون)	

مطلب یہ تھا کہ معاذ اللہ صحابۂ کرام آنحضورؐ کا ساتھ مال و منال کے لالچ کی وجہ سے دے رہے ہیں اگر انہیں دینا دلانا بند کر دو گے تو سب بھاگ کھڑے ہوں گے۔ گویا صحابۂ کرام کے اخلاص کا انکار کر کے ان پر حریص اور لالچی خود غرض اور دنی الطبع ہونے کا الزام لگایا تھا۔

دوسری جگہ منافقین کے ایک دوسرے الزام کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

والذین یلمزون المطوعین من المومنین فی الصدقت والذین لایجدون الاجھدھم فیسخرون منھم سخر اللہ منھم ولھم عذاب الیم۔ (پ۱۰ التوبہ)

یہ (منافقین) ایسے ہیں کہ نفل صدقات دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں اور خاصکر ان لوگوں پر اور تمہارا ہے جنہیں بجز محنت مزدوری کی آمدنی کے کچھ میسر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے تمسخر کی سزا خاص طور پر دے گا اور وہ ایسے ان کے طعن کے بدلے میں بھی ان کے لئے دردانگیز عذاب ہوگا۔

تمسخر و استہزا کر کے انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہی رہتے تھے مگر اسی پر بس نہ کرتے تھے بلکہ موقع مل جاتا تو کھلم کھلا انہیں ذلیل کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔

کتاب مبین کا بیان ہے:

یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل (پ۲۸ المنافقون)

یہ (منافقین) کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس ہوئے تو ہم میں جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔

اپنے زعم باطل میں وہ عزت والے تھے اور صحابہ کرام (معاذ اللہ) ذلیل تھے۔

یہ چند آیتیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ قرآن مجید اور احادیث میں بکثرت منافقین کی صحابہ دشمنی کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اس مقدس جماعت کو بدنام کرنے کی سعی ناکام سے ان کا مقصد کیا تھا۔ اس کی وضاحت سطور سابقہ میں کی جا چکی ہے۔

دوسرا دور

دوست بن کر دشمنی کی تحریک جس کا بانی عبداللہ ابن ابی ابن سلول تھا نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں بالکل ناکام رہی اور بانیٔ تحریک نا شاد و نامراد دنیا سے گیا اور عذاب الیم میں گرفتار رہوا۔ اس نے ہزار جتن کئے اور طرح طرح کی فریب کاریاں اپنے یہودی دماغ سے اختراع کیں۔ دوسرے یہودی اہل الرائے سے مشورے بھی کئے مگر وحیٔ ربانی ان کے مکروفریب کا مکروہ چہرہ بے نقاب کردیتی تھی یا خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے نورِ نبوت سے ان کے کید و دجل کو معلوم فرمالیتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ لوگ خوب پہچان لئے گئے اور ذلیل و رسوا ہوئے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ایک مدت تک اس پارٹی کی دال نہیں گلی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی قوت پارہ پارہ ہوچکی تھی۔ ان کا لیڈر مرچکا تھا یہ خوب پہچانے جاچکے تھے اور منتشر بھی ہوچکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریک بالکل ختم ہوچکی ہے کہ لیکایک اس گروہ میں ایک مجدد پیدا ہوا جس نے اس تحریک نفاق کی تجدید کرکے اسے ایک نئی زندگی عطا کردی۔

عبد اللہ ابن سبا[1]

یہ ایک یہودی تھا جس کے سینہ میں اسلام کی دشمنی اور عداوت کے شعلے بھڑک رہے تھے از راہِ نفاق اس نے مسلمان ہونے کا اظہار کیا اور مسلمان بن کر مذہب شیعہ کی بنیاد ڈالی جس کی خشتِ اول صحابۂ کرام سے دشمنی اور عداوت تھی۔ مسلمانوں کو دینی و دُنیوی نقصان پہنچانے کے لئے اسے بھی وہی تدبیریں پسند آئیں جو اس کے پیش رو عبد اللہ ابن ابی ابن سلول اور اس کی پارٹی نے ایجاد کی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ موثر صحابۂ کرام کی تذلیل و تنقیص نظر آئی، اس نے اسی پر سب سے زیادہ زور دیا اور اس بنیاد پر ایک پورے مذہب سبائیت کی عمارت تیار کردی۔

سبائیت، شیعیت کی صورت میں نمایاں ہوئی لیکن فتنہ انگیزی کی ضرورت پڑنے پر اس

---

[1] ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری ایک نئی مصنف نے سب سے پہلے اس کی شخصیت کو فرضی قرار دیا۔ ہندوستان کے چاپلوس مقلد مصنفوں نے بھی اسے صحیح مان کر دہرانا شروع کیا ہے ہم اس کے متعلق تشفی بخش بحث انشاء اللہ آئندہ مناسب موقع پر کریں گے۔

نے خارجیت کا لباس بھی پہن لیا۔ موقع آیا تو اعتزال کی عبا میں رفض کو پنہاں کیا کبھی باطنیت کا خرقہ پہن کر فاتحانہ کے ذریعہ ظلمت و ضلال پھیلانے کی کوشش کی۔ غرض یہ کہ عبد اللہ ابن ابی ابن سلول نے جو پیج دانگا یا تھا اور جس کی آب یاری عبد اللہ ابن سبا نے کی۔ اس میں بہت سی شاخیں پھوٹیں مگر رفض سب میں مشترک رہا اور یہ یہ ہے کہ اسلام میں جتنے فتنے آج تک پیدا ہوئے ہیں سب کی اصل یہی فتنہ سبائیت ہی ہے جو شخص بھی دینی نقطۂ نظر سے اسلامی تاریخ کے حصۂ فتن کا مطالعہ کرے گا وہ ہمارے اس قول کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔

ابن سبا کے بعد مختلف ادوار میں اس پارٹی میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو اپنے ماحول کے لحاظ سے اس فتنہ کی تجدید و تقویت کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فتنہ آج تک باقی ہے اور اس نے جس قدر نقصان مسلمانوں کو دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے پہنچایا ہے اس کا عشر عشیر بھی غیر مسلموں سے نہیں پہنچ سکا۔

اس وقت فتنہ سبائیت کی تاریخ لکھنا مقصود نہیں ہے، دکھانا صرف یہ ہے کہ ہر زمانے میں اس نے ایسے اشخاص کو جنم دیا ہے جنہوں نے زمانہ اور ماحول کے اعتبار سے اسے پھیلانے کی پوری کوشش کی ہے اور زمانہ کے فکری ذوق کی مناسبت سے اسے نیا لباس پہنایا ہے۔ موجودہ دور میں بھی ایسے اشخاص موجود ہیں جنہیں فتنۂ سبائیت کا مجدد کہا جاسکتا ہے مشہور علمی ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور فجر الاسلام کے مصنف ڈاکٹر احمد امین اور سید قطب کے نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں جنہوں نے جدید اسلوب اختیار کرکے عربی زبان میں سبائیت کی خوب خوب وکالت کی ہے۔ اردو میں لکھنے والوں میں بھی اس قسم کے مصنفین موجود ہیں جن میں نمایاں اور مشہور شخصیت مولوی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کی ہے۔

موصوف کے متعلق اہل بصیرت تو بہت دن سے سمجھ گئے تھے کہ سبائیت کے جراثیم کی خاصی

تعداد موصوف کے دل و دماغ پر قابض و متصرف ہے، اور انہیں عظمتِ صحابہ سے بالکل خالی کر چکی ہے، لیکن موصوف کی تازہ تالیف "خلافت و ملوکیت" نے تو نقابِ تقیہ کو بالکل ہی پارہ پارہ کر کے موصوف کی سبائیت کو الم نشرح کر دیا ہے جبکہ کتاب میں جس خوبصورتی اور سلیقہ کے ساتھ سبائیت کے تلخ زہر کو شیریں بنا کر ناواقفوں کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی گئی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی اور اسے دیکھ کر اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ موصوف بلاشبہ سبائیت کے مجدد کے مرتبہ پر فائز ہیں۔

وجہ تصنیف

"خلافت و ملوکیت"[1] کے عنوان سے ایک مضمون مودودی صاحب نے اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں تحریر کیا تھا باوجود کوشش مجھے ترجمان کے وہ پرچے نہیں مل سکے لیکن رسالہ "بینات" (کراچی) کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اسے دیکھ کر پاکستان (کراچی) کے اہل سنت میں خاصا ہیجان و اضطراب پیدا ہوا۔ اس کے کئی رد اور جوابات شائع ہوئے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا اور جمعیۃ العلماء پاکستان نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کے ساتھ حکومت پاکستان سے اس دلآزار مضمون کو ضبط کرنے کی درخواست کی لیکن مجھے ان جوابات میں سے کسی کو دیکھنے کا موقع نہ مل سکا[2]۔ بلکہ یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ کن صاحبان نے یہ فرض علی الکفایہ ادا فرما کر سب اہل سنت والجماعت پر احسان فرمایا ہے۔

ماہنامہ نظام کانپور، اکتوبر ۱۹۶۶ء میں کسی حق پرست خالد محمود پٹ چودھری کا ایک مضمون شائع ہوا

---

[1] واضح رہے کہ لفظ "ملوکیت" غلط ہے "ملوک" "ملک" کی جمع ہے عربی قاعدے سے اس میں "یت" لگا کر مصدر بنانا صحیح نہیں ہے۔ اور نہ غیر عجمی فصحاء کے یہاں اس کا استعمال نظر سے نہیں گزرا لیکن یہ مودودی صاحب کی اصطلاح ہے اس لئے میں نے بھی بلا تغیر اسی لفظ کو باقی رکھا ہے۔

[2] کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہونے کے وقت یہ صورت تھی اس وقت میں لکھنؤ (ہند) میں تھا اور کتاب کانپور (ہند) میں شائع ہوئی تھی۔ اب جبکہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے "خلافت و ملوکیت" کا ایک جواب جو عزیز محترم مولانا محمد یوسف صاحب نے لکھا ہے میری نظر سے گزر چکا ہے۔

تھا جس میں خاکسار سے بھی مودودی صاحب کے مضمون پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی ۔

چند روز ہوئے کہ محترم مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری نے اپنا ایک رسالہ عطا فرمایا جس میں موصوف نے مضمون کے اس حصہ کا نہایت محققانہ مدلّل و مسکت جواب دیا ہے جس میں مودودی صاحب نے حضرت عثمان ذی النورین کرم اللہ وجہہ پر بالکل بے جا اور نا منصفانہ اعتراضات کئے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس دن یہ کتاب دستیاب ہوئی اسی کے دوسرے دن "خلافت و ملوکیت" کے نام سے مودودی صاحب کا مندرجہ بالا مضمون کتابی صورت میں ایک صاحب سے چند دن کے لئے دستیاب ہو گیا اس وقت وہی پیش نظر ہے اور اسی کے متعلق اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

مودودی صاحب کی اس کتاب کو دیکھ کر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے لکھنے کی ضرورت کیا تھی ؟ کتاب میں اکابر صحابہ پر جرح و تنقید کی گئی ہے اور اگرچہ بظاہر یہ جرح صحابہ کے محدود گروہ پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے بہت ہوشیاری کے ساتھ ایک جماعت کو سامنے رکھ کر اس طرح تیر بارانی کی ہے کہ صحابہ کرام کی اکثریت اس کی زد میں آجاتی ہے ، اور ایک قلیل جماعت بمشکل اس سے محفوظ رہتی ہے ۔ مصنف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کو بھی ظالمانہ اور تاریک دور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

ان سب باتوں کو دیکھ کر ہر اس شخص کے دل میں جو امت محمدیہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اخلاص رکھتا ہے ۔ یہ سوال یقیناً پیدا ہو گا کہ دین کا وہ کون سا کام اور مقصد تھا جو اس شعلہ فشانی اور زہر چکانی پر موقوف تھا ؟ اور وہ کونسی دینی مصلحت تھی جس کا حصول بغیر اس کے ناممکن تھا ؟ آپ اس سوال پر ہزار غور کریں آپ کی سمجھ میں دینی نقطۂ نظر سے اس کی ضرورت یا مصلحت نہ آئے گی بلکہ نفع کے فقدان کے ساتھ اس کے ضرر شدید کا بھیانک چہرہ زیادہ نمایاں ہو جائے گا ۔

مودودی صاحب کو بھی اس سوال کا احساس تھا اس لئے انہوں نے اس کا جواب دینے کی

بھی ناکام کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جو تاریخی مواد اس بحث میں پیش کیا گیا ہے........ یہ تاریخ کہیں چھپی ہوئی نہیں پڑی تھی جسے میں نکال کر منظر عام پر لے آیا ہوں۔ یہ تو صدیوں سے دنیا میں پھیل رہی ہے اور طباعت واشاعت کے جدید انتظامات نے اسے لاکھوں کروڑوں انسانوں تک پہنچا دیا ہے" ص ۲۹۹

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:-

"اگر ہم صحت نقل، معتدل اور مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہ کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مصنفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ اسلامی خلافت اور اسلامی نظام زندگی کا بھی غلط تصور بٹھا دیں گے" ص ۳۰۰

مودودی صاحب کی یہ توجیہ عجیب و غریب ہے!

گزارش یہ ہے کہ مستشرقین آخر اسلامی تاریخ کو کس غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں جس کے ازالہ کے لئے آپ نے یہ زحمت گوارا فرمائی؟ اور اس رنگ میں پیش کرنے سے ان کا کیا مقصد ہوتا ہے؟ اور وہ مسلمانوں کو کیا ضرر پہنچانا چاہتے ہیں؟ آپ نے ان سوالات سے مطلقاً تعرض نہیں فرمایا حالانکہ بغیر ان کی وضاحت کے مبہم طور پر مستشرقین کی تعبیر و تشریح کا حوالہ دیدینا آپ کی توجیہ میں وزن پیدا کرنے سے بالکل قاصر ہے۔ آپ اجمالی ہی کے طور پر اتنا بتا دیتے کہ مستشرقین نے فلاں فلاں واقعات کو فلاں رنگ میں پیش کیا ہے جو غلط بھی ہے اور اس سے اس قسم کا ضرر پہنچتا ہے، تو غنیمت تھا ورنہ جس تحقیق کے آپ دعویدار ہیں اور جس کے اوپر کتاب کے ناشر صاحب نے آپ کی خدمت میں ہدیہ

داد وتحسین پیش کیا ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ ہر مسلمہ واقعات سے نتیجہ نکالنے سے پہلے یہ واضح کرتے کہ مستشرقین نے اس سے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے پھر دلائل کی روشنی میں ان کی غلطی واضح کرتے اور اپنے استنتاج کی صحت و برتری دکھاتے مگر آپ نے یہ کچھ نہیں کیا بلکہ محض ایک مجمل دعویٰ کر دیا۔ اس مبہم اور مجمل بات سے کوئی سمجھدار آدمی مطمئن نہیں ہو سکتا اور "شعر گفتن چہ ضرور" کا سوال علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابہام و اجمال کی یہ راہ مودودی صاحب نے قصداً اختیار کی ہے اس لئے کہ اگر وہ تفصیل میں جاتے اور مستشرقین کا رنگ دکھانے کی کوشش کرتے تو اپنے اور ان کے رنگ کے درمیان امتیاز قائم کرنا ان کے لئے ناممکن ہو جاتا مستشرقین کا رنگ بھی یہی ہوتا ہے جو اس کتاب میں نظر آتا ہے۔ وہ بھی اسلامی تاریخ پر تارکول پھیرنے ——— اور یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پوری تاریخ ظلم وستم، جور و استبداد، خود غرضی ونفس پروری کی داستان ہے، ان میں جو اہم کردار والی ہستیاں، اخلاقی لحاظ سے کچھ ممتاز نظر آتی ہیں وہ اس قدر قلیل ہیں کہ انہیں ان چھوٹے چھوٹے چراغوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو شبِ تیرہ و تار میں کسی بہت وسیع عمارت کے بعض گوشوں میں ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔

مودودی صاحب کی کتاب دیکھ کر بھی پڑھنے والا اسی نتیجہ پر پہنچے گا اور اگر مودودی صاحب پر پورا اعتماد رکھتا ہے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور رہے گا کہ مسلم قوم ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ حکومت و اقتدار کی باگ اس کے ہاتھ میں دی جائے اس لئے کہ اقتدار حاصل کرتے ہی اس کی حالت بدلنے لگی یہاں تک کہ اپنے ہادیٔ اعظم کی تعلیمات کو نسیاً منسیا کر کے سراسر ظلم وجور کو اس نے اپنا شعار بنایا اور اس کا یہ رویہ تیرہ سو برس کی مدت میں کبھی تبدیل نہ ہو سکا۔ حالانکہ اپنی بے راہ روی کے نتائج یہ بار بار دیکھ چکی ہے۔ ایسی قوم کے ہاتھوں میں اقتدار کا آنا یا باقی رہنا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

مصنف کا یہ عذر بھی قابلِ سماعت نہیں ہے کہ یہ روایتیں ہر طرف مشہور ہیں اور انہیں چھپانے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لئے کہ جن کتابوں سے میں نے روایتیں لی ہیں وہ بہ کثرت پڑھی جاتی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں طبع ہو چکی ہیں ۔ مسلم اور غیر مسلم بلا لحاظ مذہب وملت انہیں پڑھتے رہتے ہیں ۔ ہم بھی اتنی بات تسلیم کرتے ہیں کہ اس کتاب کے مآخذ عام طور پر شائع ذائع ہیں لیکن مودودی صاحب نے ان متفرق چیزوں کو یکجا کر کے اور ان میں ایک ترتیب قائم کر کے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ان کی کتاب کی خصوصیت سمجھی جائے گی ، اور وہ زاویۂ نظر جو انہوں نے اس میں اختیار کیا ہے وہ بھی کتاب کو اس کے مآخذ سے ممتاز کرتا ہے ۔ ان خصوصیتوں کی وجہ سے جو زہر کتاب میں پیدا ہو گیا ہے وہ اس سے بدرجہا زاید ہے جو اس کے مآخذ میں پایا جاتا ہے ۔ ان کی کتاب دیکھکر ایک ناواقف کے قلب میں صحابۂ کرام اور سلاطین اسلام بلکہ مجموعی طور پر اسلاف کے متعلق جو نفرت وحقارت کا جذبہ پیدا ہوگا وہ تاریخ طبری و ابن اثیر وغیرہ کے پورے دفاتر پڑھ کر بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔

اس تاثیر کو تقویت دینے والی دو چیزیں اور بھی ہیں ۔ اول یہ کہ مودودی صاحب نے نظامِ خلافت کو یعنی اسلام کے سیاسی شعبہ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا پورا دین یہی ہے اور اسلام کے سب شعبے اس کے تابع اور اس کی تکمیل کا ذریعہ ہیں ۔ اس کا حقیقی مقصد اور لب لباب خلافت ہی ہے ۔ برسوں کی کوشش سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کا ذہن موصوف نے اسی سانچہ میں ڈھال لیا ہے ظاہر ہے کہ ایسے افراد جب اس کتاب کو پڑھیں گے تو ان کے دلوں میں ان افراد اور جماعتوں کے خلاف نفرت وعداوت کا ایک طوفان بپا ہو جائے گا ، جنہوں نے متاعِ خلافت کو ملوکیت کے عوض میں فروخت کر دیا ، اور اس مغزِ اسلام کو بقول مودودی صاحب برباد کر دیا ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جن مآخذ کا حوالہ مودودی صاحب نے دیا ہے ان میں اگر یہ زہریلا مواد پایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ایسا مواد بھی موجود ہے جسے تریاق کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے

لیکن مودودی صاحب کی کتاب میں اس قسم کا تریاق سرے سے موجود ہی نہیں ہے اگر کہیں شاذ و نادر وہ اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں تو بہت مختصر اور غیر موثر عنوان سے جس سے ناقد موصوف کی غیر جانبداری اور شان تحقیق کا غلط گمان پیدا ہو جاتا ہے مگر اس خوش گمانی سے صحابہ اور دیگر اسلاف سے متعلق بدگمانی میں کوئی کمی نہیں ہوتی ، بلکہ مودودی صاحب کے ساتھ یہ خوش گمانی اس بدگمانی میں اور اضافہ کر دیتی ہے اس کی کوئی تلافی نہیں کرتی ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اسلاف خصوصاً صحابہ کرام کی تحقیر اور ان پر بے اعتمادی خود ضلال ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی گمراہیوں کا دروازہ بھی ہے اس سے قطع نظر ہمارے نوجوانوں میں اس بے اعتمادی اور تحقیر اسلاف سے جو جذبہ "خود حقارتی" پیدا ہوگا وہ خود ایک مستقل وادی ہلاکت ہے جس میں یہ کتاب انہیں دھکیل رہی ہے۔

معلوم نہیں غیر متعدل ذہن و دماغ رکھنے والے مسلمان مصنفین سے مودودی صاحب کی مراد کون لوگ ہیں ؟ اگر اس سے مراد شیعہ صاحبان ہیں تو ان کی وکالت خود مودودی صاحب کر رہے ہیں جو شخص موصوف سے بالکل واقف نہ ہو وہ اگر اس کتاب کا مطالعہ کرے گا اور عقل و فہم سے کام لے گا تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ کسی شیعہ کی کتاب ہے جس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ایڈ جسٹ طرز پر اپنے مذہب کا نقش اہل سنت پر بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر اس سے مراد ناصب و خوارج ہیں تو جہاں تک مجھے علم ہے ان کا کوئی وجود پاکستان و ہندوستان میں نہیں ہے، نہ آج تک ان ملکوں میں ایسی کتاب کا نام سنا گیا ہے جن میں ناصبیت و خارجیت کی ترجمانی کی گئی ہو۔ اس لئے خیال یہی ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی مصنفین ہیں جو صحیح مسلک اہل سنت والجماعت

کی ترجمانی کرتے ہیں۔ صحابۂ کرام کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خلاف تاریخ میں جو گندہ مواد کذابوں، دجالوں اور وضاعوں نے اکٹھا کر دیا ہے اسے تنقید کی بھٹی میں جلا کر خاکستر بنا دیتے ہیں وہ مودودی صاحب کے نزدیک غیر معتدل ذہن و دماغ رکھنے والے ہیں اور خود موصوف صحابۂ کرام کو مجروح قرار دے کر انہیں مہذب طریقوں سے سب و شتم کر کے "ماٰذ نا کردہ تبرّا" کہہ کے اور مسلک اہل سنت و جماعت کو خیر باد کہہ کے "معتدل ذہن و دماغ" رکھتے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کے متعلق غلط تصور سے بچانے کا عذر بھی عجیب و غریب ہے۔ مودودی صاحب کی یہ کتاب دیکھ کر اسلامی حکومت کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ محض ایک خیالی چیز ہے جسے عملی شکل دینا عادۃً غیر ممکن ہے۔ اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ آئندہ صفحات میں لکھیں گے۔

اسی طرح اسلامی نظام زندگی کو کامل شکل میں جس میں سیاسی و معاشی نظام بھی شامل ہیا سامنے رکھا جائے تو اس کے متعلق بھی یہی تصور قائم ہوگا اور اگر نامکمل شکل میں لیا جائے تو اس سے کتاب میں کوئی خاص تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت یا کامل اسلامی نظام زندگی کے متعلق جو تصور بعض مستشرقین پیش کرتے ہیں اس کتاب سے اسی قسم کا غلط تصور پیدا ہوتا ہے اور اس کی تصنیف کی یہ توجیہ بالکل لاطائل اور خلاف واقعہ ٹھہرتی ہے۔

اس مضمون سے پہلے

مودودی صاحب نے بزرگان دین کے ساتھ جو رویّہ اس کتاب میں اختیار کیا ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ان حضرات کے ساتھ ادب و عقیدت کا فقدان ان کے اندر بہت پہلے

سے نظر آ رہا تھا۔ بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ ان کی اس کتاب میں بغض صحابہ کا جو تعفن محسوس ہوتا ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ زہریلا مادہ ان کے ذہن و دماغ میں سن طفولیت ہی سے نشو و نما پا رہا تھا۔

میں موصوف کے حالات سے زیادہ واقف نہیں ہوں لیکن اس کتاب کو نیز ان کی اسی قسم کی سابق تحریروں کو دیکھ کر میرا اندازہ یہ ہے کہ موصوف کا بچپن شیعی ماحول میں بسر ہوا ہے اور سبائیت کے ایمان خوار جراثیم ان کے قلب و دماغ میں اسی وقت سے داخل ہو چکے ہیں بزرگوں کے ساتھ موصوف کے رویہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دامن عصمت کو بھی داغدار بنانے کی سعی لاحاصل کی ہے چنانچہ حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونس سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالےٰ نے انہیں معاف کر دیا۔"

(تفہیم القرآن۔ ج۲ سورۂ یونس ۹۹)

اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں کوتاہی کرنا کتنا بڑا جرم اور گناہ ہے؟ اس کی تصریح کی ضرورت نہیں۔ مودودی صاحب یہ جرم ایک نبی معصوم کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ کیا یہ جرم عصمت کے منافی نہیں؟ کیا اس کی نسبت کسی نبی کی طرف کرنا سخت بے ادبی اور گستاخی نہیں ہے؟ شیعہ کہتے ہیں کہ خلافت علیؓ کا اعلان کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا مگر آپ نے بخوف شیخین

اس کا صاف صاف اعلان نہیں کیا۔ اس طرح گویا معاذ اللہ آپ نے ایک فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ مودودی صاحب بھی باطناً شیعہ ہیں۔ لیکن ظاہری سنیت کی وجہ سے صاف صاف اس عقیدے کا اظہار نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے حضرت یونسؑ کی طرف اس جرم کو منسوب کرکے ذہن کو شیعوں کے مندرجہ بالا عقیدے کے لئے تیار کرنے کی کوشش کی ہے کیوں کہ اگر ایک نبی ادائیگی فرض میں کوتاہی کر سکتا ہے تو دوسرے انبیاء کے متعلق بھی یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام کے بارے میں مودودی صاحب کو کتنا حسن ظن ہے اسے معلوم کرنے کے لئے بطور نمونہ مندرجہ ذیل سطریں پیش کی جاتی ہیں۔ اپنے رسالہ "سود" میں غزوۂ احد کی شکست کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب شکست کا اصل سبب یہ تشخیص ہوا تو اس کا علاج بھی یہی تجویز ہونا چاہیے تھا......

مطلب یہ ہوا کہ مال کی محبت جو تمہارے دلوں میں جائز نظری حد سے بڑھ گئی ہے، اور جس کی وجہ سے تمہاری روح میں کمزوری پیدا ہو گئی ہے اس کے بڑھنے کا سبب یہ ہے کہ تم مدتوں سے سود خواری کے خوگر ہو جس نے تمہارے قلب کے ریشہ ریشہ میں مال کی محبت پیوست کر دی ہے۔"

("سود" مصنفہ مودودی صاحب ص ۵ طبع اول ۱۹۴۳ء)

ملاحظہ فرمایئے کہ مال کی محبت کا وقتی جذبہ پیدا ہو جانا اور مال کی محبت کا قلب کے ریشے ریشے میں پیوست ہو جانا دونوں باتیں یکساں ہیں؟ صحابہ کرام کو معصوم ہم بھی نہیں کہتے۔ ان سے کسی وقتی جذبہ کے ماتحت گناہ کا صدور بھی ممکن تھا بلکہ بعض حضرات سے اس قسم کی لغزشیں صادر بھی ہوئیں لیکن ان حضرات کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ اسے بمنزلۂ معدوم کہا جا سکتا ہے اس کے ساتھ اس پر مستزاد وہ دوام کسی ایک کے

بھی ثابت نہیں ہے اور ممکن بھی نہیں ہے۔ مال کی طرف وقتی میلان ان سے بھی ممکن تھا مگر مزکی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تزکیہ کا اقتضا ہے کہ آنحضور کی تربیت، بلکہ زیارت سے ایک لمحہ کے لئے مشرف ہونے والا بھی اللہ کی محبت سے پاک و صاف ہو جائے خواہ وہ مال ہو یا جاہ ہو یا کوئی اور شئے۔ قلب کے ریشہ ریشہ میں مال کی محبت تو کسی فاسق و فاجر مسلمان میں بھی آسانی سے نہیں ثابت کی جاسکتی چہ جائیکہ صحابۂ کرام۔ یہ ان مقدس حضرات پر افترا ہونے کے علاوہ آنحضور کی شانِ تزکیہ پر بھی ایمان کی کمی کے مترادف ہے۔

انہیں آیات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" تم میں سے بہت سے لوگ مال کی محبت میں مبتلا ہیں اور یہ زرپرستی تمہیں نافرمانی پر آمادہ کر دیتی ہے نیز یہ کہ تم میں صبر و تقویٰ کی جگہ " وھن " اور فشل، ضعف، پایا جاتا ہے " (حوالہ بالا)

خدارا کوئی بتائے کہ کیا صحابۂ رسول میں سے بہت سے لوگ " زرپرستی " کے خبیث مرض میں مبتلا تھے اور کیا " نافرمانی " ان کی عادت تھی؟ کیا وہ صبر و تقویٰ سے خالی ہو گئے تھے اور اس کے بجائے ان میں وھن اور فشل اور ضعف مستقل مرض کی حیثیت سے پیدا ہو گیا تھا؟ آیات میں تو ان کی صرف ایک وقتی لغزش کو بیان فرمایا گیا ہے اور جملہ فعلیہ کے ذریعہ سے جو حدوث پر دلالت کرتا ہے فرمایا گیا ہے حتیٰ اذا فشلتم (یہاں تک کہ جب تم سست پڑ گئے) آیت کے کسی لفظ سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ان میں حُبِ مال کا مستقل مرض تھا؟ اور ان میں مال کی محبت حدود فطرت سے اس قدر تجاوز کر گئی تھی کہ زرپرستی تک جا پہنچی تھی اور ان میں مستقل طور پر وھن و فشل نے صبر و تقویٰ کی جگہ لے

لہ لطیفہ یہ ہے کہ خود مودودی صاحب نے بھی ترجمہ " اور اسے دیکھو کہ تم میں کمزوری آ گئی " ہی کیا ہے مگر جب تشریح کرنے بیٹھے تو حدوث کو استمرار و دوام بنا دیا۔

لی تھی۔ سوا اس کے کیا کہا جائے کہ بعض صحابہ نے مودودی صاحب کو آیت کی اس غلط تفسیر اور واقعہ کی غلط تصویر پر آمادہ کیا۔

یہ عرض کر دوں کہ رسالہ مسودہ کے پہلے ایڈیشن میں، جو ترجمان القرآن کے جزو کے طور پر شائع ہوا تھا، مندرجہ بالا عبارتیں تھیں لیکن دوسرے ایڈیشن میں یہ عبارتیں نہیں ملیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پہلی بار اشاعت کے بعد اہلسنت والجماعت کی جانب سے اس پر لے دے ہوئی۔ اسے دیکھ کر دوسرے ایڈیشن سے یہ عبارتیں نکال دی گئیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ موصوف کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ اگر ایسا ہوتا تو زیر نظر کتاب نہ لکھی جاتی اور اس میں اصحاب کرام پر اس سے کہیں زیادہ افترا نہ کیا جاتا ؎

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا"

اس نمونے سے صحابہ کرام کے متعلق مودودی صاحب کے حسن ظن کا اندازہ کر لیجئے۔

امیر جماعت کے نمونہ کی پیروی مامورین بھی خوب خوب کی چنانچہ کوئی صاحب ابوالخیر ہیں انہوں نے تو تہذیب و شائستگی ہی پر لات مار کر آزادی زبان میں صحابہ کرام کی شان میں خوب خوب گستاخیاں کیں جو ترجمان القرآن کے صفحات شائع ہوئیں۔ مودودی صاحب کے ایک اسسٹنٹ نے معرکہ اسلام و جاہلیت کے عنوان سے جلیل القدر صحابہ میں جاہلیت کے اثرات دکھانے میں خاصی تعداد میں صفحات سیاہ کئے اور اپنے نامہ اعمال کی سیاہی میں خوب خوب اضافہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ مودودی صاحب نے بیس اکیس سال کی محنت سے خاصی تعداد ایسے ذہنوں کی پیدا کر دی ہے جن کے دل میں صحابہ کرام کی وقعت ماشاء اللہ کچھ کم ہی ہے اور جنہیں ان پر تنقید ہی نہیں بلکہ افترا پردازی اور بہتان طرازی میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جماعت اسلامی کے سب افراد بلا استثناء اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں میں معترف ہوں کہ اس میں سے بہت سے مستثنیٰ بھی ہیں لیکن اس توہین صحابہ کو برداشت کر کے جماعت سے وابستہ رہنا اور ایک گمراہ شخص کو اپنا مقتدا بنانا ہمارے خیال میں قیامت کے دن باز پرس کا سبب ہو سکتا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کردوں کہ مودودی صاحب اور ان کے بعض رفقاء نے سبائیت ورفض کے جو جراثیم پھیلائے ہیں وہ ان کی جماعت تک محدود نہیں ہیں بلکہ ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی ان سے متاثر ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے جو ان کی جماعت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے لیکن ان سے حسن ظن رکھتی ہے۔

اصل مقصد

مودودی صاحب کے ایک پرانے مضمون کی عبارت یہ دکھانے کے لئے ہم نے نقل کی ہے کہ ان کے قلب میں صحابۂ کرام کی جو بے وقعتی ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ ایک مزمن بیماری ہے یہاں تک کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ادب اور ان کی عظمت بھی ان کے دل میں ایسی نہیں ہے جیسی ایک مسلمان کے دل میں ہونا چاہئے۔

یہ چیز شجرۂ سبائیت کی جڑ ہے جس سے اس کی سب شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایسے شخص کا حال اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے کمالات کو بہت سطحی نظر سے بلکہ کہنا چاہئے کہ محض گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے اور ان کو وہ وزن دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ان کے حالات کو اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ جو باتیں ان کے نزدیک نقص وعیب کی جنس میں داخل ہیں وہ اس کی نظروں کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ باتیں فی نفسہٖ نقص وعیب ہوں یا نہ ہوں اس سے اسے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ نہ وہ کبھی اس سوال پر غور کرتا ہے کہ میرا زاویۂ نگاہ تو کج نہیں ہے جس کی وجہ سے میں کمال کو نقص یا ہنر کو عیب سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ کج نظری

اور عیب جوئی اس کے دل میں صحابۂ کرام کی عداوت پیدا کر دیتی ہے۔ اگر کوئی خاص محرک پیدا ہو گیا تو قلب و روح کی اس بیماری کا شدید دورہ پڑتا ہے اور اس دورے میں ایسا شخص صحابہ کرام کی شان میں بے ادبی اور بد زبانی اور ان پر بہتان طرازی اور افترا پردازی سے بھی نہیں چوکتا۔

مودودی صاحب کے مرض میں بھی اس نفسیاتی ارتقاء کی جھلک نظر آتی ہے۔ صحابۂ کرام کی بے وقعتی اور ان کی عداوت تو ان کے اندر شاید بچپن ہی سے پائی جاتی ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ لیکن خاص محرکات نے اس عداوت کی آگ کو ایسا بھڑکایا کہ اس کے شعلے ان کے قلم سے بھی خارج ہونے لگے ایک قوی محرک تو یہ ہے کہ مودودی صاحب کی ذہانت و طباعی نے تاڑ لیا تھا کہ سبائیت کے اسلحہ فرسودہ ہو چکے ہیں، اس کا لباس فیشن سے خارج ہوتا جا رہا ہے۔ امت کی نئی نسل اسے اس کی قدیم شکل میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ شیعہ سنی کا فرق اب وہ لوگ بھی سمجھنے لگے ہیں جو کسی زمانہ میں اسے حنفی شافعی اختلاف سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ ان کی فکر رسا نے سبائیت کے لئے ایک ایسا رنگ پیش کیا، جسے بہت سے ناواقف اہلسنت بھی اس طرح قبول کر لیں کہ سنیوں میں شامل رہتے ہوئے بھی شیعہ ہوں اور اس میں شک نہیں کہ کتاب میں انہوں نے سبائیت کو جدید لباس پہنانے میں خاصا کمال دکھایا ہے۔

غور کرنے سے دوسرا محرک مودودی صاحب کا جذبۂ جاہ و اقتدار پسندی معلوم ہوتا ہے اسے سمجھنے کے لئے پاکستان خصوصاً اس کے مغربی حصے کے حالات اور اس کے دینی رجحانات کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ پاکستان میں تعداد کے اعتبار سے تو اہل سنت کی غالب اکثریت ہے لیکن باوجود اس کے شیعوں اور شیعیت کے اثرات وہاں بہت زیادہ ہیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی یہ اثرات خاصے ہیں لیکن مغربی حصہ میں تو یہ بہت زیادہ اور نمایاں ہیں۔ وہاں مالکان زمین میں بڑی تعداد شیعہ صاحبان کی

ہے۔ اہل سنت عموماً کاشتکار اور نادار ہیں اور زمینداروں کے زیر اثر تجارتی میدان کے بڑے حصّوں پر شیعہ قابض ہیں۔ حبیب بینک جو حکومت کو بھی قرض دیتا ہے خالص شیعوں کا ہے۔ اہم ملازمتوں پر اپنے تناسب آبادی سے کہیں زیادہ شیعہ قابض ہیں مدت دراز کے شیعی پروپیگنڈے اور اہل سنت کے باخبر طبقہ کی غفلت کی وجہ سے اہل سنت میں ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جن کے ذہن و دماغ پر شیعی عقائد و خیالات کا خاصا اثر ہے یہاں تک کہ بہت سے علمائے دین کے عقائد بھی صاف نہیں رہیں۔

سادات تنا حضرت علی حسن حسین و سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عقیدت میں غلو ایک عام مرض ہے جو بعض صورتوں میں تو شرک کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہودی اور ہندوانی نسل پرستی کا مہلک مرض وہاں سادات پرستی کی شکل میں نمایاں ہے۔ سید ہونا ہر محاسبۂ آخرت سے نجات کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے معصیت تو معصیت ان کے نزدیک سید اگر مرتد و مشرک بھی ہو جائے تو بھی جنت اس کی ذاتی جائداد ہے جس سے وہ کسی طرح بے دخل نہیں ہو سکتا۔ برہمنیت کا یہ زناری نظریہ اسلامی عبا و عمامہ پہن کر بعض مقامات پر اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ سنی عوام غالی شیعہ پیر صاحبان کے مرید ہوتے ہیں۔ یہ چیز شاذ و نادر نہیں ہے بلکہ پنجاب و سندھ میں ایسے شیعہ پیروں کی خاصی تعداد ہے جن کے سنی مریدین کی تعداد ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

یہ ہے پاکستان کا ماحول۔ جسے حصول اقتدار کے لئے مفید بنانے کا خیال مودودی صاحب کو اس قسم کے مضامین لکھنے کا محرک بنا جیسی کہ زیر نظر کتاب ہے۔ یہ کتاب شیعوں کو خوش کرکے مودودی صاحب کے لئے ان کی حمایت و نصرت کا تحفہ حاصل کرے گی شیعیت زدہ سنیوں کی قوت کو بھی رام کرے گی اور ایک جماعت تو ایسی انہوں نے تیار کر ہی لی ہے جو آنکھ بند کرکے ان کی اقتدا کرتی ہے۔ ان قوتوں کو فراہم کرلینے کے بعد حکومت و اقتدار کی منزل پہ پہنچنا

آسان ہو جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اہل سنت کا ایک کثیر طبقہ مخالفت کرے گا، لیکن ان میں سے کچھ تو شیعوں کے اثر کی وجہ سے تائید یا سکوت پر مجبور ہو جائیں گے اور کچھ جماعت کے اثر سے ایک قلیل تعداد رہ جائے گی جو آخر تک مخالف رہے گی لیکن وہ کیا بگاڑ سکتی ہے، قہر درویش بجان درویش، اپنی ناکامی پر پیچ و تاب کھا کر رہ جائے گی۔

موصوف دیکھ چکے ہیں کہ سکندر مرزا نے کس طرح عام اہلسنت کے علی الرغم محض شیعوں اور تھوڑے سے سنیوں کی امداد سے اقتدار حاصل کر لیا تھا اور پاکستان کو ایک شیعہ سلطنت بنانے کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ اگر عین وقت پر ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین کی شان کا ظہور نہ ہو جاتا تو اس خواب کی تعبیر نکلنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔[1]

مودودی صاحب نے ایک شیعہ خاتون مس فاطمہ جناح کو صدر جمہوریہ پاکستان بنانے کے لئے جو ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا شاید اس میں بھی یہی حکمت پوشیدہ تھی۔ قدح صحابہ میں موافقت کی وجہ سے موصوف کو توقع بدرجہ یقین ہو گی کہ موصوفہ کے اصحاب الیمین میں شامل کر اقتدار و حکومت میں حصہ دار بن جائیں گے۔ ایران کی سنی سلطنت اسی قسم کی تدبیروں سے شیعہ سلطنت بن گئی۔ حالانکہ آج بھی وہاں اہل سنت اکثریت میں ہیں۔ یہ مثال بھی ان کے سامنے ہو گی۔

بظاہر یہی محرکات ہیں جنہوں نے مودودی صاحب کو اس تحوطرازی اور تبرا بازی پر ابھارا

---

[1] افسوس ہے کہ اہلسنت کی بے حسی اور غفلت کی وجہ سے تعبیر کا ایک حصہ ظاہر ہو چکا ہے۔ شیعہ جو پاکستان میں پانچ فیصد بھی نہیں ہیں اور بتا دیانی دو فیصد سے بھی کم ہیں لیکن آج ملازمتوں میں یہ دونوں گروہ کم از کم پچاس فیصد مناصب پر قابض ہو چکے ہیں، فوج، پولیس، سول محکموں کے ہر شعبہ میں جدھر جائیں آپ کو کوئی شیعہ یا قادیانی نظر آئے گا۔ یہ دونوں گروہ بھی اسی وقت پیدا ہوا تھا جب اور ایک گروہ دوسرے کا معاون ہے، شیعیت کے شعائر کی ترویج ہو رہی ہے لیکن اہل سنت کی غفلت رہے جس کی بھی ایک مثال آپ ہے، عوام تو کیا ہوش میں آتے علماء دین بھی سب کچھ دیکھنے کے باوجود دیکھ نہیں رہے۔

ہے۔ اگر موصوف کے دل میں اخلاص و للّٰہیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہوتا یا امت کی خیر خواہی کا شائبہ بھی ہوتا تو اس زمانہ میں جبکہ اسلاف کی عظمت یوں ہی دلوں سے کم ہو رہی ہے ایسے مضامین لکھنے کی ہرگز جرات نہ کرتے۔ جن سے دلوں میں صحابۂ کرام کی محبت و عظمت اور کم ہو جائے بلکہ خاکم بدہن خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں فتور آ نے جو حیات ایمانی کی جان اور اسلامی زندگی کی روح رواں ہے۔

ان سطور کا اصل مقصد تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جانب سے دفاع ہے، اور ان مطاعن کی تردید کرنا ہے جو مودودی صاحب نے ان پر وارد کئے ہیں مضمون کا یہ حصہ انشاء اللہ مفصل ہوگا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب پر بحیثیت مجموعی بھی ایک نظر کر لی جائے۔

مضمون کا محور یہ مسئلہ ہے کہ نظام خلافت نظام ملوکیت میں کب تبدیل ہوا ہے؟ اور کیسے تبدیل ہوا؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ اور اس کے عواقب و نتائج کیا پیدا ہوئے؟ مودودی صاحب نے پہلے تو خلافت و ملوکیت کا فرق سمجھایا ہے۔ اس کے بعد اپنی دانست میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ ہی کے زمانے سے ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے خلافت کا رجحان ملوکیت کی طرف ہو گیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے باقی رکھنے کی بہت کوشش کی اور اپنی ذات کے حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن ملوکیت کی بلا سے پوری امت کو بچانے میں وہ بھی ناکام رہے، یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں پورے طریقے سے ملوکیت نے خلافت پر غلبہ پا لیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ملوکیت ہی کا دور دورہ ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے سب کے سب حکمران باستثناء حضرت عمر ابن عبد العزیز ملوک ہی ہوتے رہے۔ گویا تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں خلافت کا زمانہ اس قدر قلیل ہے

کہ اسے آٹے میں نمک کی حیثیت دے سکتے ہیں۔

مودودی صاحب کی رائے میں خلافت پر ملوکیت کی یہ فتح خود ان لوگوں کے کردار کی رہین منت ہے جنہوں نے اس کا سبق براہ راست نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا اور آنحضور کے دیدار سے مشرف ہوئے تھے، اگرچہ اس کے ذمہ دار بعد کے لوگ بھی ہیں لیکن اس افسوسناک حادثہ کی ذمہ داری سب سے زیادہ انہیں حضرات پر عائد ہوتی ہے جو اس کے بانی تھے یعنی صحابہؓ کرام۔

مودودی صاحب خلافت الٰہیہ اور اسلامی حکومت کے داعی ہیں ان کا اور ان کی جماعت کا مخصوص نعرہ یہی ہے کہ نظام طاغوتی ختم کر کے نظام خلافت قائم کرنا چاہیے۔ اس دعوت کو وہ بزعم خود انبیا اور اپنی جماعت کا امتیازی نشان سمجھتے ہیں لیکن ہم ان سے یہ سوال کرتے ہیں کہ جناب والا! جو شخص اسلامی نظام اور خلافت الٰہیہ کی خوبی میں شک کرے وہ کافر لیکن آپ کی کتاب دیکھ کر ہر سمجھدار آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ باوجود بے مثال و بے نظیر خوبیوں کے اس نظام کا عملی طور پر قائم کرنا محال عقلی نہیں تو محال عادی ضرور ہے۔

خیال تو فرمائیے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور آپ کے مخصوص شاگرد اسے قائم رکھنے میں ناکام رہے، حضرت عثمانؓ کے ایسے صاحبان فضائل و مناقب صحابی جنہیں منصب خلافت پر آخری دم تک قائم رہنے کی وصیت خود آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، گویا انہیں اس منصب کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ بقول مودودی صاحب اس کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے اور نہ صرف قاصر رہے بلکہ خلافت کو ملوکیت کی طرف موڑ دیا کہ حضرت علی رضؓ کے ایسے جلیل القدر صحابی بھی باوجود ہزار کوشش، اس کی کج روی کو نہ روک سکے۔ حضرت حسنؓ نے تو بالکل ہتھیار ڈال دیئے اور خلافت کو ایک ملک یعنی حضرت معاویہؓ کے سپرد کر دیا جنہوں نے

مکمل طور پر اس کی قلب ماہیت کر کے اسے ملوکیت بنا دیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں خلافت نے پھر سنبھالا لیا مگر ان کی عمر بہت کم ہوئی ان کی آنکھ بند ہوتے ہی خلافت پر بھی موت کی گہری نیند طاری ہوگئی اور آج تیرہ سو برس کا عرصہ گزرتا ہے کہ وہ مدفون ہے اور اس کی صورت دیکھنے کو لوگ ترس رہے ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب سلطان یزید کا واقعہ تحریر کر کے لکھتے ہیں " مسلمانوں کو اس کے بعد سے آج تک پھر اپنی مرضی کی خلافت نصیب نہ ہوسکی " (ص ۱۵۳) تو آج وہ کون فرشتے ہیں جو مودودی صاحب کے قول کے مطابق، اس تیرہ سو برس کے مدفون مردے کو حیات تازہ بخش دیں گے اور عملاً اسے قائم کر دیں گے؟ ظاہر ہے کہ کیسا ہی اچھا نظام ہو مگر جب تک اسے چلانے والے مناسب اشخاص موجود نہ ہوں اس وقت تک نہ وہ قائم ہوسکتا ہے نہ چل سکتا ہے۔

سوال یہی ہے کہ اور صحابہ کو تو جانے دیجئے، کیا مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے افراد حضرت علی مرتضیٰ رضؓ اور حضرت حسن مجتبےٰؓ سے بھی زیادہ روحانی و ایمانی قوت رکھتے ہیں کہ وہ تو زندہ خلافت کو ملوکیت کے منہ میں بھی جانے سے نہ روک سکے اور یہ صاحبان مردہ خلافت کے پوست و استخوان کو ملوکیت کے معدے سے نکال کر دوبارہ زندہ کر دیں گے۔؟

زیر نظر کتاب بتاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی باوجود قوت تزکیہ ایسے افراد نہ تیار کر سکے جو کم ازکم ایک ہی نسل تک نظام خلافت کو باقی رکھتے یا کم ازکم اسے گوارا ہی کرتے، بخلاف اس کے انہیں میں سے ایک کثیر تعداد نے اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے پر چھری پھیر دی، تو کیا معاذ اللہ! مودودی صاحب یا ان کی جماعت کی قوت تزکیہ وارشاد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت تزکیہ سے بھی بڑھی ہوئی ہے؟ کہ جو کام آنحضور سے نہ ہوسکا اسے وہ کر دکھائیں گے؟ انہوں نے ایسے افراد تیار کر دیئے یا کر دیں گے جو اس بار خلافت کو حضرت عثمان رضؓ سے بہتر طریقے پر اٹھا لیں گے؟

اور سارے عالم میں اسے عملاً نافذ کر دیں گے ؟

ان باتوں کو اگر پیش نظر رکھئے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ نظام خلافت باوجود ہزار خوبیوں اور بے نظیر محاسن کے ایک علمی و مثالی (IDEAL) چیز ہے عملی (PRACTICAL) چیز نہیں ہے اس لئے اس کی دعوت دینا مسلمانوں کے وقت اور ان کی قوت کو ضائع کرنا ہے کیونکہ اس عنقائے بلند پرواز کو اسیر کرنا غیر ممکن ہے۔ مودودی صاحب نے اس کتاب میں تیرہ سو سال کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے دیکھ کر یہ سوال پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ خود موصوف کو بھی اس کا کچھ احساس ہوا فرماتے ہیں :۔

"بعض لوگ بڑے سطحی انداز میں تاریخ کا مطالعہ کر کے بے تکلف یہ فیصلہ کر ڈالتے ہیں کہ اسلام تو بس تیس سال چلا اور پھر ختم ہو گیا" (ص ۲۰)

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہم اختصار کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ امت مسلمہ کو جب اس سیاسی انقلاب سے سابقہ پیش آیا تو اس کے سماجی شعور نے کس طرح اپنے نظام زندگی کو سنبھالنے کے لئے ایک دوسری صورت اختیار کر لی" (ایضاً)

اس صورت کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں :۔

"اس سے پہلے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ خلافت راشدہ کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مکمل نیابت تھی۔ خلیفہ راشد محض راشد (راست رو) ہی نہ ہوتا تھا بلکہ مرشد (راہ نما) بھی ہوتا تھا۔ اس کا کام محض مملکت کا نظم و نسق چلانا اور فوجیں لڑانا نہ تھا بلکہ اللہ کے پورے دین کو مجموعی طور پر قائم کرنا تھا ۔۔۔۔۔ یہ قیادت بھی ہر پہلو کی جامع تھی اور مسلمان پورے اعتماد

کے ساتھ اپنی اجتماعی زندگی، اس کی رہنمائی میں بسر کر رہے تھے :

خلاصہ یہ کہ جب تک خلافت رہی اس وقت تک دینی قیادت سیاسی قیادت سے علیحدہ نہیں ہوئی۔ بلکہ دونوں قسم کی قیادتیں خلیفہ کی شخصیت میں مجتمع رہیں۔ لیکن جب بقول مودودی صاحب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو علماء و صلحاء نے کیا کیا ؟ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ نئی صورت حال پیدا ہوتے ہی مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا، اور چونکہ اسے طاقت کے بغیر نہ ہٹایا جا سکتا تھا، نہ سیاسی قیادت بلا طاقت ممکن ہی تھی اس لئے امت نے با دل ناخواستہ اسے قبول کر لیا۔ دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا جسے بقایائے صحابہ، تابعین و تبع تابعین فقہاء محدثین اور صلحائے امت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور امت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم کر لی"؎ (ص۲۰۲)

پھر لکھتے ہیں :۔

"اس طرح پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستہ سے الگ ہو چکا تھا" (ص۲۰۲)

آخر میں لکھتے ہیں :۔

"مگر اسلام کا ٹھیک ٹھیک منشا تو اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب

؎ بقول مودودی صاحب بقایا صحابہ و تابعین و علمائے امت نے اسلام کے اس منشا کو پورا کرنے سے پہلو تہی کی اور با دل ناخواستہ ہی سہی مگر بالآخر "ملوکیت" اور تفریق دین و سیاست کو قبول کر لیا، تیرہ سو سال میں کسی کو توفیق (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

کہ اس امت کو ایک ایسی قیادت میسر ہو جو خلافت راشدہ کی طرح بیک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی قیادت بھی "
(ص ۲۰۵)

مودودی صاحب کا یہ جواب درحقیقت اس کا اعتراف ہے کہ وہ ہمارے مندرجہ بالا سوال کا جواب دینے سے بالکل قاصر ہیں اور اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہے۔ اس کی واضح علامت یہ ہے کہ موصوف نے اصلی اعتراض کی شکل بگاڑنے اور نہایت چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ معترض کا رخ بدلنے اور ایک دوسری بات میں الجھا کر اصل سوال کو بھلا دینے کی کوشش فرمائی ہے۔

آج بحمد للہ قرآن و حدیث موجود ہے۔ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ فرائض اسلام کا علم و عمل مشاہدہ میں آ رہا ہے فقہ کی جسیم و ضخیم کتابیں کتب خانوں کی زینت اور امت کے لئے ذریعہ رشد و ہدایت ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غلاموں اور نام لیواؤں کی تعداد شاید کروڑوں سے بھی متجاوز ہے۔ ان مشاہدات و بدیہیات کے ہوتے ہوئے کون احمق یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام تو صرف تیس سال چلا، پھر ختم ہو گیا۔

(بقیہ صفحہ ۳۴ سے آگے) نہ ہوئی کہ خلافت کی متاع گم گشتہ کو ڈھونڈھ لاتا یا کم از کم صحیح طریقے سے اس کی کوشش ہی کرتا۔ کیونکہ بقول مودودی صاحب آج تک مسلمانوں کو اپنی مرضی کی خلافت نصیب نہیں ہوئی۔ یہ کبریت احمر حضرت ان کی اور ان کی جماعت کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی نیا للعجب۔ جب تک اسلاف پر اس طرح طنز و تعریض کر کے ان میں کوئی نقص نہ نکالا جائے اس وقت تک شان تجدد کیسے ظاہر ہو سکتی ہے، اور جماعت کے افراد میں یہ خیال کیسے پھیل سکتا ہے کہ چودہ سو سال کی مدت میں اسلام کو پورے طریقے سے صرف مودودی صاحب ہی نے سمجھا ہے۔

یہ بات تو کوئی کٹر سے کٹر دشمن اسلام اور کوئی ملحد و زندیق بھی نہیں کہہ سکتا۔ ایک زندہ و مشاہد حقیقت کا انکار کون کر سکتا ہے؟ یہ بات تو صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو آفتاب ماہتاب کے وجود کا بھی انکار کر سکتا ہو۔

ہاں! موصوف کی کتاب دیکھ کر یہ سوال یقیناً پیدا ہوتا ہے کہ خلافت صرف تیس سال رہی پھر ختم ہو گئی اس لئے یہ ناممکن العمل ہے۔ مودودی صاحب کے دل میں بھی یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں کوئی یہ اعتراض نہ کر دے۔ اس کا کوئی جواب ان کی سمجھ میں نہ آیا تو انہوں نے سوال کا چہرہ بگاڑ کر معترض کی توجہ تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اسے ایک ایسے سوال کی شکل میں پیش کیا جو کسی کے ذہن میں نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ؎

چلی شوخی نہ کچھ باد صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

اس تغیر و تبدل سے یہ سوال تو بدستور قائم رہا البتہ یہ ظاہر ہو گیا کہ موصوف اس کے جواب سے عاجز ہیں۔ ورنہ اس تلبیس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہاں! اگر مودودی صاحب یہ کہیں کہ اسلام صرف نظام خلافت ہی کا نام ہے تو مندرجہ بالا اعتراض کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن اس خلاف حقیقت بات کے بعد ان کے جواب کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ بلکہ وہ سوال اور بے جان جواب از آسمان کا مصداق بن کر نقش بر آب رہ جاتا ہے جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

موصوف نے اپنے اختراعی سوال اور "قول من غیر قائل" کا جو جواب دیا ہے وہ ہمارے اعتراض کی پوری پوری تائید کر دیتا ہے گزارش یہ ہے کہ امت کے بقایا صحابہ و تابعین وعلماء وصلحاء نے اس وقت جبکہ نظام سیاسی نے خلافت کے بجائے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی تھی خلافت کے یوسف گم گشتہ کی بازیافتگی سے مایوس ہو کر دین و سیاست کی تفریق کا طریقہ اختیار کیا۔ اور یہی ان

خلافت و دارِ شوریٰ کے بجائے مدارس اور خانقاہوں کو اپنے لئے منتخب کرلیا۔ یہی نہیں بلکہ تیرہ سو برس سے آج تک علماء و صلحائے امت اپنی اسی روش پر قائم ہیں۔ باوجودیکہ دین سے شغف کامل رکھتے ہیں مگر بقول آپ کے اس کے ٹھیک منشاء کو پورا کرنے سے قاصر رہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ یہ چیز ناقابل عمل ہے اور اس کے حصول کے لئے کوشش کرنا اپنا وقت اور اپنی قوت ضائع کرنا ہے۔

بقول آپ کے صلحائے امت نے حفاظت اسلام کے لئے یہ تدبیر کی کہ سیاسی قیادت سے ہمیشہ کے لئے منہ پھیر لیا۔ دینی قیادت کو اس سے الگ کرلیا۔ اس کی زمام اپنے ہاتھ میں لیکر کاروانِ امت کی رہبری کرنے لگے۔ آپ کی بات سرآنکھوں پر مگر جناب والا! اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی یہی کرنا چاہئے یہ خلافت الٰہیہ کا نعرہ، اسلام کے ٹھیک ٹھیک منشاء کو پورا کرنے کی کوشش، سیاسی قیادت پر سرفراز ہونے کی جدوجہد یہ سب چیزیں آپ کے جواب کی روشنی میں تو اور زیادہ واضح طور پر اضاعت وقت و قوت کے مترادف نظر آتی ہیں، بلکہ فتنہ و فساد کا سبب نظر آتی ہیں۔

مودودی صاحب ایک طرف تو بہت زور و شور کے ساتھ خلافت الٰہیہ اور اقامت دین کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری طرف خود ان کی کتاب اسے کیمیاگر دن کا خواب ظاہر کرتی ہے جس کا لباس عمل پہننا عادتاً محال ہے۔

وجہ و منع بادہ اے زاہد چہ کافر نعمتی است
منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن

موصوف کے معتقدین سے معافی مانگتے ہوئے ہم عرض کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں آن شیعہ حضرات کا طرز عمل جو مودودی صاحب کی طرح تقیہ کے پابند نہیں ہیں موصوف کے طرز عمل سے

نسبتاً معقول تر ہے یہاں ان لوگوں کے عقائد کی غلطی و صحت سے بحث نہیں ہے۔ بحث یہ ہے کہ وہ بھی صحابہ کرام پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہیں اور سوا حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے کسی کی خلافت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ان دونوں حضرات کے علاوہ خلافت کا کوئی وجود تیرہ سو برس میں کبھی نہیں رہا لیکن اس کے ساتھ وہ اس معدوم کو موجود کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے "امام غائب" کے منتظر ہیں جنہیں وہ معصوم اور صفات نبوی کا حامل سمجھتے ہیں۔ ان کے عقائد و خیالات یقیناً غلط ہیں لیکن ان کا عمل ان کے خیالات کے مطابق تو ہے مودودی صاحب کی طرح خیال و عمل کا تضاد اور ناممکن کو ممکن بنا دینے کی سعی لاحاصل تو ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔

مودودی صاحب کی زیر نظر کتاب تو انہیں نصیحت کر رہی ہے کہ موصوف اب خلافت الٰہیہ اور حکومت اسلامی کا نعرہ بلند کرنا ترک کر دیں اور اپنے مقتدیوں کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے صاف صاف اعلان کر دیں کہ بھائیو! مجھے سہو ہو گیا تھا، نظام خلافت تو وہ عنقائے بلند پرواز ہے جو نہ فرش زمین پر قدم رکھتا ہے نہ اسیر کمند ہو سکتا ہے۔ اسے شکار کرنے کی خواہش ہوس خام ہے۔ اس کا خیال چھوڑ دو اور کوئی دوسرا راستہ اختیار کرو۔ اس کے بعد بھی اگر حکومت و اقتدار کی خواہش چین نہ لینے دے تو کوئی "مودودی ازم" اختراع فرمالیں یا چلتے ہوئے "ازموں" میں سے کسی کو اختیار کر لیں۔

متجددین و مخالفین اسلام کی تائید

مخالفین اسلام کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ اسلام اپنی جگہ حقانیت و صداقت کا حامل ہے لیکن اس کا ایک خاص دور تھا اور وہ ایک خاص زمانہ اور مخصوص احوال

وقت کے لئے آیا تھا۔ موجودہ ترقی یافتہ دور کے لئے وہ موزوں و مناسب نہیں رہا۔

اسلام کے دعویداروں میں بھی ایک گروہ جو متجددین کے نام سے مشہور ہے یہی بات ذراسی تبدیلی کے ساتھ کہتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ اسلام کے اصول دائمی نہیں ہیں۔ موجودہ دور کے موافق ان میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار ہے اور ایسا کرنا ضروری ہے۔

مودودی صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ سے ان دونوں گروہوں کی تائید فرمادی ہے ظاہر ہے کہ جب اسلام کا سیاسی و معاشی نظام اور اس کا معاشرتی طریقہ تیس برس ہی کے بعد (معاذاللہ) فرسودہ ہوگیا تو چودہ سو برس بعد اسے کارآمد کہنا کس قدر خلاف عقل و دانش ہے اس کے انہیں شعبوں پر اس کے دوسرے شعبوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے اور انہیں بھی موجودہ ترقی یافتہ دور کے جسم میں ان فٹ قرار دیا جاسکتا ہے (معاذاللہ)

مخالفین اسلام کو تقویت پہنچانا سبائیت کا ایک طرۂ امتیاز ہے جو ان کی پوری تاریخ میں نمایاں ہے مجدد سبائیت اس سے کیوں محروم رہتے ؟

کتاب کے مآخذ

مودودی صاحب نے قدح صحابہ اور ان کے بعد خلافت بنو امیہ و بنو عباس کو مطعون کرنے کے لئے جو مواد جمع کیا ہے اس کے مآخذ کے بیان میں خوب خوب مغالطہ انگیزی سے کام لیا ہے۔ سطور ذیل میں تفصیل ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

"جو تاریخی مواد اس بحث میں پیش کیا گیا ہے وہ تاریخ اسلام کی مستند ترین کتابوں سے ماخوذ ہے" (ص ۹۹)

بظاہر یہ الفاظ خواہ کتنے ہی پر زور معلوم ہوتے ہوں مگر حقیقت میں ان کی حیثیت مغالطہ سے زیادہ نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے ان تاریخی کتابوں کو بہت سطحی نظر سے دیکھا،

اور ان کی صحیح حیثیت سے بالکل ناواقف ہیں۔ ان کتابوں میں سے کون کتاب کیسی ہے۔ اس کے ارے ہم انشاء اللہ کچھ آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔ یہاں ہم اصولی حیثیت سے ان سب کتابوں کی حیثیت کی توضیح کرنا چاہتے ہیں۔

مودودی صاحب شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ تاریخ اسلام کی کسی کتاب کو نہ مستند کہا جاسکتا ہے اور نہ غیر مستند۔ یہ روایات کا ذخیرہ و مجموعہ ہیں۔ استناد و عدم استناد کی بحث کا تعلق ان کی روایات سے ہے۔ نہ کہ بحیثیت مجموعی پوری کتاب سے۔ ان کی ہر روایت کو جانچا اور پرکھا جائے گا جو قابل قبول ہوگی اسے قبول کیا جائے گا اور جو قابل رد ہوگی اسے رد کیا جائے گا۔ ان میں سے کسی کتاب کو بحیثیت مجموعی اور کلیۃً نہ تو قبول کیا جائے گا اور نہ رد کیا جائیگا یعنی نہ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ طبری میں جو بات لکھی ہوئی ہے وہ حدیث نبوی کی طرح قابل قبول ہے؟ اور اس کی صحت کی اتنی ضمانت کافی ہے کہ وہ تاریخ طبری میں موجود ہے۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک ایک حرف غلط ہے، اور اس کی کوئی روایت قابل قبول نہیں ہے۔ سب واجب الرد ہیں۔ ان کتابوں کو یا ان میں سے کسی کتاب کو بھی کلیۃً مستند ترین کتاب لکھ دینا مغالطہ انگیزی اور غلط بیانی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

تاریخ اسلام پر جو کتابیں قدیم زمانے میں لکھی گئی ہیں ان کا طرز وہ نہیں ہے جو آج کی مروجہ تاریخی کتابوں کا ہے۔ آج کے مورخ کا طریق تالیف یہ ہے کہ وہ واقعات کو اپنی ذمہ داری پر اس طریقہ سے بیان کرتا ہے کہ گویا یہ تسلیم شدہ ہیں اور اس کے نزدیک بالکل ثابت ہیں وہ روایتیں نہیں جمع کرتا۔ نہ واقعات کی کوئی سند یا اس کا سلسلہ روایت بیان کرتا ہے۔ ان کتابوں میں جو واقعات درج ہوتے ہیں ان کی صحت و غلطی کی جانچ کرنے کا قاری کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اگر مورخ قابل اعتماد ہے تو اس کی کتاب کی ہر بات کا اسے اعتبار کرنا پڑتا

ہے اور دوسرے سے اسے تسلیم کرانے کے لئے اسے صرف کتاب کا حوالہ دینا پڑتا ہے۔ اگر دورِ مغلیہ کے کسی واقعہ کو آپ کسی سے تسلیم کرانا چاہیں تو اتنا کافی ہے کہ آپ تاریخ کی کسی ایسی کتاب کا حوالہ دیدیں جس کے مصنف پر عام طور پر اعتماد کیا جاتا ہو۔ مثلاً آپ کہدیں کہ فرشتہ یا بدایونی یا معتمد نے ایسا لکھا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ ان کتابوں کی اس کمزوری کے باوجود کہ ان میں کوئی سلسلہ سند نہیں ہوتا اس لئے ان کے مؤلفین پر اعتماد ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی ہر بات کو صحیح سمجھ لیا جائے۔ ان کے بیانات کو بھی جانچ پرکھ کر قبول کیا جاتا ہے۔

ان پر تنقید کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ اول خود مصنف کی شخصیت پر گفتگو ہوتی ہے کہ وہ قابل اعتماد ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو اس کی حد کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ واقعات کے ایک سلسلہ اور ان کی ایک نوع کے بارے میں اگر ایک مصنف پر اعتماد کر سکتے ہیں تو دوسرے سلسلہ یا دوسری نوع کے بارے میں بھی وہ قابل اعتماد ہو۔ مثلاً نعمت خان عالی کے بیانات اگر اکبر کے بارے میں یا دورِ مغلیہ کے فوجی نظام کے بارے میں قابل اعتماد قرار دیئے جا سکتے ہیں تو اورنگ زیب اور اس کے مذہبی خدمات و اصلاحات کے بارے میں اس کے بیانات پر اعتماد کرنا صحیح نہ ہوگا اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ اورنگ زیب کی دینداری اور سنیت کی وجہ سے یہ شیعہ مصنف اس کا سخت مخالف ہے۔

ان تاریخوں پر تنقید کا دوسرا طریقہ درایت ہے۔ ان کتابوں کے کسی ایسے مواد کو ہم کبھی قبول نہیں کرتے ہیں جو صحیح عقلی دلائل کے خلاف ہوں۔ مثلاً ہم سراج الدولہ کے متعلق بلیک ہول کے واقعہ کو درایتاً بالکل غلط قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ اس کی جو صورت بیان کی جاتی ہے وہ بعید از قیاس ہے۔ یعنی اتنی چھوٹی کوٹھری میں اتنے آدمیوں کا سما جانا عقل سلیم کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے، اگرچہ معتبر تاریخی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے۔

عام طور پر لوگ کتب تاریخ کے اس اسلوب تحریر سے مانوس ہوتے ہیں خصوصاً نیا تعلیم یافتہ طبقہ تو قدیم طریقے سے بالکل ناواقف ہوتا ہے وہ اس زمانہ کی لکھی ہوئی اسلامی تاریخ کی کتابوں (جنہیں مودودی صاحب نے مستند ترین کتابیں لکھا ہے اور اپنی کتاب کا ماخذ بنایا ہے) کے متعلق بھی یہی تصور قائم کرتا ہے اور اسی زاویہ سے ان پر نظر کرتا ہے۔ طبری، ابن الاثیر، ابن کثیر وغیرہ کے نام دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ اتنے بڑے فاضل اور دیندار مؤلفین نے جو بات لکھی ہوگی، وہ خوب جانچ پرکھ کر اور صحیح سمجھ کر لکھی ہوگی اس لئے جو کچھ اس میں تحریر ہے اس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔

حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ ان کتابوں کا طرز تالیف موجودہ طرز تالیف سے بالکل مختلف ہے۔ ان کتابوں کی حیثیت آموں کی ایسی ڈھیری کی ہے جس میں غلط آم لگے ہوئے ہوں کھٹے، میٹھے، پھیکے، داغی صاف، سڑے گلے ہر طرح کے آم جو مختلف انواع و اقسام کے ہوں اور مختلف درختوں سے توڑے گئے ہوں، اس میں موجود ہیں۔ انبہ فروش اچھے برے میں امتیاز اور چھانٹنے کا کام خریدار پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی دیانت اور انبہ شناسی پر بھروسہ کر کے پوری ڈھیری کو اچھا کہنا سخت غلطی ناسمجھی اور خسارے کا سبب ہوگا۔

مودودی صاحب ان کتابوں کو مستند ترین فرما کر اور مروجہ کتب تاریخ کے متعلق ناواقف ناظر کے تصور سے فائدہ اٹھا کر اسے مغالطہ دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کی یہ کتابیں بھی معتمد علیہ مورخین کی لکھی ہوئی ہیں، اس لئے ان کا ایک ایک حرف اسی طرح قابل وثوق و اعتماد ہے جس طرح کسی مشہور مورخ کی تاریخ ہندوستان یا تاریخ انگلستان۔

اس مغالطہ کی تاثیر بڑھانے کے لئے آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"اس میں شک نہیں کہ تاریخ کے معاملہ میں چھان بین اسناد اور تحقیق کا وہ اہتمام

نہیں رہوا ہے جو احادیث کے معاملہ میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ کہنا بھی تو مشکل ہے کہ ابن سعد، ابن عبد البر، ابن جریر، ابن حجر، ابن کثیر اور ابن اثیر جیسے لوگوں نے دور اختلاف کے حالات نقل کرنے میں اتنی سہل انگاری اور بے احتیاطی برتی ہے اور بالکل بے اصل باتیں اپنی کتابوں میں صحابہ کی طرف منسوب کر دیں۔ کیا وہ ان باتوں کو بیان کرتے وقت اس بات سے بے خبر تھے کہ ہم کن کن بزرگوں کی طرف یہ واقعات منسوب کر رہے ہیں"۔ (ص ۳۰۲)

موصوف خود یہ اقرار فرماتے ہیں کہ تاریخ کے معاملہ میں احادیث کی ایسی تحقیق نہیں کی گئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ راوی کی ثقاہت و عدم ثقاہت سے قطع نظر کر کے اور اصول درایت پر پرکھے بغیر تاریخی روایتیں نقل کر دی گئیں اور کتابوں میں درج کر لی گئیں، سوال یہ ہے کہ غیر معتبر اور غیر مصدقہ روایتیں کن کتابوں میں اور کن لوگوں نے ذکر کی ہیں؟ کیا یہ ابن سعد وغیرہ وہی حضرات نہیں ہیں جن کے نام لے کر مودودی صاحب نے ناظرین کو مرعوب کرنے اور مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو اس بات میں کیا کلام رہ جاتا ہے کہ ان حضرات نے تاریخی روایات نقل کرنے میں خاصی بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔

مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ انہوں نے صحابہ کی جانب یہ بے اصل باتیں کیسے منسوب کر دیا حالانکہ وہ خود بھی صحابہ کے رتبہ شناس تھے ان کے مغالطہ کو وزنی بنانے سے قاصر ہے اس لئے کہ ان حضرات نے صحابہ کی جانب یہ باتیں خود منسوب نہیں کی ہیں بلکہ نقل کی ہیں۔ بے احتیاطی نقل میں برتی ہے نہ کہ نسبت میں، جو روایتیں یہ نقل کرتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ ان کے مضمون سے متفق بھی ہوں۔ ہاں اگر کہیں انہوں نے اس بات کی تصریح کی ہو کہ یہ روایت صحیح ہے اور ہمارے نزدیک اس کا مضمون ثابت تو ان کی طرف "نسبت" کی نسبت کی جا سکتی ہے، ورنہ محض کسی روایت کا ان

کی کتابوں میں درج ہو جانا ہرگز اس کی دلیل نہیں ہے کہ یہ لوگ اس واقعہ کو صحابہ کرام یا دوسرے کسی طرف منسوب کر رہے ہیں اور مودودی صاحب کا یہ قول محض دعوائے بے دلیل ہے۔

اس کے علاوہ اگر صرف نقل کو نسبت کے مرادف سمجھ لیا جائے تو بہت سے مقامات پر خود ان مصنفین کی جانب متناقض افکار و خیالات کی نسبت کرنا ہوگی۔ اس لئے کہ بہت سے مقامات میں انہوں نے متضاد روایتیں نقل کی ہیں۔ مثلاً جنگ جمل میں ام المومنین حضرت صدیقہ علیٰ زوجہا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اونٹ کے پاؤں کاٹنے کے متعلق ، ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر والوں نے حضرت موصوف کے کسی ایماء کے بغیر اپنی رائے سے یہ بے ادبی اور گستاخی کی ، دوسری روایت یہ ہے کہ خود حضرت مرتضیٰ رضؓ نے اس کا حکم دیا تھا۔ یہ دونوں روایتیں البدایہ والنہایہ میں موجود ہیں، اب فرمایئے کہ خود مؤلف کی رائے کیا سمجھی جائے گی ؟

ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کئے لیتے ہیں کہ نقل واقعہ کے معنی یہ ہیں کہ ان مؤلفین نے یہ واقعات صحابۂ کرام یا دوسرے لوگوں کی طرف منسوب کئے ہیں اور خود ان کے نزدیک یہ واقعات صحیح تھے لیکن اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ ان کی یہ رائے بھی صحیح تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ان واقعات کے شاہد نہ تھے ان کے اور واقعات کے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا ، ایسی حالت میں ان کے علم کا ذریعہ بھی روایت ہی ہے اور اسی پر ان کی رائے کا دارومدار ہے۔ واقعہ کی صحت و عدم صحت پر ان کی رائے کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا۔

واقعہ تو اسی وقت صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جب روایت اصول روایت و درایت کی کسوٹی پر کھری نکلے۔ اگر وہ کھوٹی نکلتی ہے تو اسے کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے گا ، اور اگر ان حضرات کو اس کی صحت پر اصرار ہے اور ان کی رائے اس کے موافق ہے تو ان کی اس رائے کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی جائے گی اور اسے بھی اس روایت کے ساتھ کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے گا۔

حافظ ابن عبدالبر، علامہ ابن حجر، ابن الاثیر وغیرہ رحمہم اللہ سے آنکھوں پر بیٹھیں لیکن آنکھیں بند کر کے ان کی رائے یا ان کی بیان کردہ کسی روایت کو صحیح تسلیم کر لینا ایک ایسی غلطی ہے جس کے لئے کوئی بھی وجہ جواز نظر نہیں آتی۔ صحابہ کرام کے معاملہ میں تو مسئلہ بالکل صاف ہے ایسی روایتیں جن سے ان بزرگانِ دین کی ثقاہت اور پاکیزگی پر حرف آتا ہو ہرگز ابن عبدالبر وغیرہ کے اعتماد کی بنا پر قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔ سوال یہ ہے کہ صحابۂ کرام جن کی تعدیل و تقدیس قرآن کریم کر رہا ہے اور جن کی پاکیزگی لسان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے زیادہ قابل اعتماد ہیں یا یہ مورخین جن کا تذکرہ مودودی صاحب نے کیا ہے؟ یہ یا ان جیسے لاکھوں تو کسی ادنٰی سے ادنٰی صحابی کی خاکِ پا کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی کیا حقیقت ہے کہ ان پر اعتماد کر کے معاذ اللہ کسی صحابی کے دامن تقدس کو داغدار سمجھا جائے۔

تاریخ اسلام کی جتنی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں ان میں سے کسی کے مؤلف نے واقعات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا ان مؤلفین اور ان واقعات کے درمیان جو انہوں نے بیان کئے ہیں کم سے کم فاصلہ دو سو سال کا ہے۔ عملی اعتبار سے دو سو سال کا حجاب بھی اتنا ہی دبیز سمجھا جائے گا جتنا تیرہ سو سال کا۔ اس لئے روایات کی بنا پر جس طرح انہیں کوئی رائے قائم کرنے کا حق تھا اسی طرح ہمیں بھی حق حاصل ہے بلکہ اس وقت جو جدید ذرائع معلومات اور تنقید کے وسائل ہمیں حاصل ہو گئے ہیں وہ انہیں حاصل نہ تھے اس لئے ان کے مقابلہ میں ہماری رائے زیادہ صحیح اور وزنی ہو سکتی ہے ہم ان کی روایات کو دیکھیں اور پرکھیں گے۔ ان کی رائے اس بارے میں واجب الاتباع نہیں ہے۔

صحابہ کرام کے علاوہ دوسرے اشخاص کے متعلق بھی ایک محقق کا طرز عمل یہی ہوگا اور یہی ہونا چاہئے۔ بشر عاً و عقلاً ان کے اوپر جرح اسی وقت جائز قرار دی جاتی ہے جب

اس قسم کی روایت سند کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہو، اور درایت کے بھی خلاف نہ ہو اس کے بغیر کسی ادنیٰ مسلمان کے متعلق بھی سوءِ ظن کرنا نہ شرعاً جائز ہے نہ عقلاً، اور دنیا کا کوئی منصف مزاج انسان بھی اسے صحیح نہیں سمجھ سکتا۔

جن کتابوں کا حوالہ مودودی صاحب نے دیا ہے، نقلِ روایت میں ان کے مصنفین کی بے احتیاطی کا اعتراف خود موصوف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"خاص طور پر واقدی، سیف بن عمر اور ان جیسے راویوں کے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال نقل کر کے بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حدیث ہی نہیں تاریخ میں بھی ان لوگوں کی روایت کو رد کیا ہے" (ص۳۱۱)

اس کے بعد وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ اس قسم کے راویوں کی روایتوں کے بارے میں علماء نے حدیث و تاریخ کے درمیان فرق کیا ہے لکھتے ہیں:۔

"رہی تاریخ مغازی اور سیر، تو انہیں علماء نے اپنی کتابوں میں جہاں کہیں ان موضوعات پر کچھ لکھا ہے، وہاں وہ بکثرت واقعات کی انہیں لوگوں کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حافظ ابن حجر کو دیکھئے جن کی تہذیب التہذیب سے ائمہ رجال کی یہ جرحیں نقل کی جاتی ہیں وہ اپنی تاریخی تصنیفات ہی میں نہیں بلکہ اپنی شرح بخاری (فتح الباری) تک میں جب غزوات اور تاریخی واقعات کی تشریح کرتے ہیں تو جگہ جگہ واقدی اور سیف بن عمر اور ایسے ہی دوسرے مجروح راویوں کے بیانات بے تکلف نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح حافظ ابن کثیر اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں خود ابو مخنف کی مذمت کرتے ہیں اور پھر خود ہی ابن جریر طبری کی تاریخ سے بہ کثرت وہ

واقعات نقل بھی کرتے ہیں، جو انہوں نے اس کے حوالہ سے بیان کئے ہیں۔
(صفحہ ۳۱۰ تا ۳۱۴)

اس سے مودودی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ :۔

"اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم حدیث کے اکابر علماء نے ہمیشہ تاریخ اور حدیث کے درمیان واضح فرق ملحوظ رکھا ہے" (ص ۳۱۵)

ہم نے مانا کہ ان حضرات نے حدیث و تاریخ میں مندرجہ بالا فرق کیا ہے۔ لیکن خدارا کوئی بتائے کہ آخر اس فرق کو نقل میں بے احتیاطی کے علاوہ کس لفظ سے تعبیر کیا جائے گا؟۔

معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر افتراء کر سکتا ہو یا آنحضور کے متعلق روایت کرنے میں بے احتیاط ہو وہ کسی امتی کے متعلق، خواہ وہ صحابی ہوں یا غیر صحابی، کس قدر جرات کے ساتھ جھوٹ بولے گا یا بے احتیاطی کے ساتھ روایت کرے گا؟ اس بدیہی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس قاعدے کے لئے کیا وجہ جواز اور دلیل صحت باقی رہ جاتی ہے کہ حدیث کے بارے میں ایک راوی مردود الروایۃ ہو، مگر تاریخ و سیرت میں مقبول الروایۃ ہو؟ نقل روایت میں ان حضرات کی بے احتیاطی کی بہت قوی دلیل تو خود مودودی صاحب نے بیان فرمادی ہے اس سے زیادہ اور بے احتیاطی کیا ہوگی کہ جن راویوں پر ان حضرات نے خود جرح کی، انہیں کذاب اور وضاع ٹھہرایا انہیں کی روایتیں بلا تکلف اپنی کتابوں میں نقل کر رہے ہیں۔ اس سے مودودی صاحب نے بہت غلط نتیجہ نکالا کہ یہ روایتیں قابل اعتماد ہیں۔ درحقیقت اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذکورہ بالا اور اسی قسم کے دوسرے علماء و مورخین کی نقل روایت پر ہرگز اعتماد نہ کرنا چاہئے اور ان کی کتابیں اس اعتبار سے بالکل ناقابل اعتماد ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ مودودی صاحب صحابہ کرام کی غلطیاں پکڑنا ضروری سمجھتے ہیں لیکن

ان کا مطالبہ دوسروں سے یہ ہے کہ مذکورہ بالا علماء اور اس قسم کے دوسرے علماء کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے صرف یہی نہیں بلکہ ان کی غلطی کی اتباع کر کے صحابہ کرام اور دوسرے مسلمانوں کو مجروح قرار دیا جائے، سے

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

درحقیقت بغض صحابہ کا غلبہ موصوف کو اس قسم کی متضاد باتیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

اسی ذیل میں تحریر فرماتے ہیں :-

"وہ ایک چیز پر تنقید کے وہ اصول استعمال نہیں کرتے جو درحقیقت دوسری چیز کے لئے وضع کئے گئے ہیں" (ص)

مودودی صاحب یا تو اصول حدیث سے ناواقف ہیں یا قصداً دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو اصول حدیث کے پرکھنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں انہیں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے اور ان کا تعلق نفس خبر کے ساتھ ہے خواہ وہ خبر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہو یا اور کسی کے متعلق۔ یہ قاعدے اور ضابطے بالکل فطرت کے مطابق ہیں اور خود قرآن و حدیث سے بھی فی الجملہ ثابت ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ "دوسری چیز کے لئے" یعنی صرف حدیث کے لئے وضع کئے گئے ہیں محض مغالطہ اور کھلی ہوئی غلط بیانی ہے۔

ان اصول کا استعمال جس طرح حدیث کے مقبول و غیر مقبول قرار دینے کے لئے کیا جائے گا اسی طرح تاریخی روایات کے ردّ و قبول کے معاملہ میں بھی ان سے کام لیا جائے گا۔ اصول روایت کے معاملہ میں دونوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ اگر مودودی صاحب قرآن مجید پر تدبر کرتے تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ان کی رہنمائی کرتا :-

یاایھا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین ہ

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی جانچ کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت کی وجہ سے کسی قوم کو تکلیف پہنچا دو، پھر اپنے عمل پر تمہیں ندامت برداشت کرنا پڑے۔

اس صریح اور عام حکم کے ہوتے ہوئے جس کا تعلق ہر خبر سے ہے، خواہ وہ حدیث ہو یا تاریخی روایت، صرف چند مؤرخین کے غلط طرز عمل اور بے احتیاطی کی بنا پر، تاریخی روایات کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینا آخر کس شرعی دلیل کی بنا پر جائز ہے؟ کیا ابن الاثیر وغیرہ علماء کا عمل قرآن مجید کے لئے معاذ اللہ ناسخ ہو سکتا ہے؟ اور کیا کذابوں وضاعوں شیعوں وغیرہ کی روایتوں کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینا اور ان کی بنا پر صحابہ تو صحابہ کسی ادنیٰ درجہ کے مسلمان پر بھی جرح کرنا یا اس کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا اور اس کی غیبت سے اپنی زبان اور اپنے قلم کو ملوث کرنا شرعاً جائز ہے؟ اور صرف شرعاً ہی نہیں عقلی طور پر یا عام ضوابط اخلاق کے اعتبار سے بھی اس کے لئے کوئی وجہ جواز بیان کی جا سکتی ہے۔؟

اصول حدیث جن قوانین و قواعد کا نام ہے وہ درحقیقت اسی آیت کی تفسیر ہیں۔ ان کے دائرے سے تاریخ کو خارج کر دینا نہ صرف یہ کہ ایسی بے بنیاد بات ہے جس کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی، بلکہ اس آیت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کے لئے کوئی وجہ جواز بھی نہیں مل سکتی بعض مورخین علماء نے اگر اس کی خلاف ورزی کی تو اسے ان کی غلطی کہا جائے گا۔ آیت کا حکم ان کے غلط طرز عمل سے منسوخ نہیں ہو سکتا۔

تاریخ تو ایک طرف، خود حدیث کی کتابوں میں جو روایتیں آتی ہیں ان کا کسی کتاب میں

مذکور ہو جانا ، ہمیشہ اس کی دلیل نہیں ہوتا کہ وہ سب کے سب مؤلف کے نزدیک مقبول بھی ہیں ، نہ محض مؤلف کے اعتماد پر انہیں قبول کر لیا جاتا ہے ، بلکہ ان میں بھی انہیں روایتوں کو جو اصول النقد پر پوری اترتی ہیں ۔

امام ترمذیؒ امام ابن ماجہؒ امام ابو داؤدؒ رحمہم اللہ کی جلالت شان میں کلام کی کیا گنجائش ہے ، لیکن ان کی کتابوں کی بہ کثرت روایتیں ایسی ہیں جنہیں علماء نے قبول نہیں کیا ۔ صحیح بخاری جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے لقب سے بجا طور پر ملقب ہے ۔ اس کے متعلق بھی علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے منہاج الاعتدال میں تحریر فرمایا ہے کہ اس کی روایتیں اس لئے صحیح نہیں ہیں کہ وہ امام بخاری کی جمع کی ہوئی ہیں بلکہ ان پر اس لئے اعتماد اور وثوق ہے کہ وہ امام بخاری کی تالیف سے بہت پہلے ہی صحیح تھیں ، اور عام طور پر محدثین میں مقبول و مشہور تھیں ، گویا بخاری شریف کی روایتوں پر اعتماد امام بخاری رحمۃ اللہ کی جلالت شان پر اعتماد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی صحت ، شہرت و مقبولیت کی بناء پر ہے ، بلکہ خود امام بخاری پر اعتماد اور ان کی جلالت شان کا اعتراف ان روایتوں کو جمع کرنے پر مبنی ہے ۔

جس شخص میں ذرا سی بھی فہم ہے اور وہ تعصب کا مریض نہیں ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ صحاح ستہ کے مؤلفین کی عظمت و قدر سے ، ابن الاثیر ابن حجر ابن سعد و امثالہم کی عظمت و قدر کو کیا نسبت ہے ؟ جب ان رفیع المرتبت حضرات کی جمع کردہ روایتوں کو آنکھ بند کر کے محض ان کے اعتماد پر قبول کرنے کے لئے ہم مجبور نہیں ہیں ، بلکہ علماء برابر ان پر نقد کرتے ہیں تو علامہ ابن حجر و ابن الاثیر و امثالہم ان کے مقابلے میں کیا چیز ہیں ؟ جن کی کتاب کی ہر روایت آنکھ بند کر کے قبول کر لی جائے ؟ ۔ خصوصاً جبکہ ان کی کتاب میں کسی روایت کا مذکور ہونا اس کی دلیل بھی نہ ہو کہ وہ ان کے نزدیک

مقبول بھی ہے۔ ان کی نقل کردہ روایتوں میں سے ہم انہیں کو قبول کریں گے جو مقبولیت کے معیار پر پوری اتریں گی اور ان سب روایتوں کو رد کر دیں گے جو اس کسوٹی پر کھوٹی ثابت ہوں گی خواہ وہ ابن حجر کی کتاب میں ہوں یا ابن الاثیر یا ابن سعد وغیرہ کی کسی کتاب میں؟ اور خواہ اس رد روایت سے ان کی کتابوں کے اکثر حصّہ کو دفتر لایعنی اور جھوٹ کی پوٹ کیوں نہ کہنا پڑے۔

لطیفہ یہ ہے کہ خود مودودی صاحب احادیث پر نقد کرتے ہیں یہاں تک کہ بخاری شریف بھی ان کی تنقید کی زد سے نہیں بچ سکی۔ ضعف سند ہی نہیں محض درایت ہی کی بناء پر حدیث کو رد کر دینے میں بھی انہیں کوئی باک نہیں ہوتا۔ حق رجال سے بالاتر ہے" اور انبیاء کے علاوہ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے" یہ ان کی جماعت کے مسلمہ اصول اور نعرے ہیں، مگر یہاں پہنچ کر سب بھول جاتے ہیں اور اس کی تلقین کرتے ہیں کہ ابن حجر، ابن جریر، ابن الاثیر و امثالہم کی نقل پر ایمان لانا چاہئے اور ان کی ہر ایسی روایت کو قبول کر لینا چاہئے جس سے کسی صحابی پر جرح ہوتی ہو سے

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

اس تناقض کو بغضِ صحابہ کا کرشمہ نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

مورخین کی کورانہ تقلید کا جو نظریہ مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں اس کی تقویت و تائید کے لئے مزید ارشاد ہوتا ہے۔

"اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ یہ لوگ ان مجروح راویوں کے تمام بیانات آنکھیں بند کر کے قبول کرتے چلے گئے ہیں۔ دراصل انہوں نے نہ ان لوگوں کے تمام بیانات کو رد کیا ہے اور نہ سب کو قبول کر لیا ہے۔ وہ ان میں سے چھانٹ چھانٹ کر صرف وہ چیزیں لیتے ہیں جو ان کے نزدیک نقل کرنے کے قابل ہوتی ہیں جن

کی تائید میں سلسلہ واقعات کے ساتھ مناسبت بھی پائی جاتی ہے اس لئے
کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد، ابن عبدالبر، ابن کثیر، ابن جریر، ابن
حجر اور ان جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں
سے نقل کئے ہیں، ان کو رد کر دیا جائے یا جو باتیں ضعیف یا منقطع سندوں سے
لی ہیں یا بلاسند بیان کی ہیں ان کے متعلق یہ رائے قائم کر لی جائے کہ وہ بالکل بے
سروپا ہیں محض گپ ہیں اور انہیں بس اٹھا کر پھینک ہی دینا چاہئے" ص ۳۱۹
گویا مودودی صاحب کے نزدیک انبیاء کے علاوہ جو لوگ تنقید سے بالاتر ہیں وہ یہ مؤلفین تاریخ
ہیں جن کا تذکرہ مودودی صاحب نے کیا ہے، چونکہ انہوں نے اپنے علم لدنی کی بنا پر پہلے ہی
روایتوں کو چھانٹ لیا ہے اس لئے اب ان کی چھنی ہوئی روایتوں پر نقد و بحث کے لئے کوئی وجہ
جواز نہیں باقی رہی۔ اور اب ہمیشہ کے لئے اس کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ مودودی صاحب کا یہ
اصول جو خود ان کے دوسرے قول و عمل سے ٹکراتا ہے، دنیا کے کسی سمجھدار آدمی کے نزدیک
قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کہ مذکورہ بالا مصنفین نے جو تاریخی
روایتیں اپنی کتابوں میں درج کی ہیں، وہ "چھانٹ" کر درج کی ہیں ایسا دعویٰ ہے
جسے وہ قیامت تک نہیں ثابت کر سکتے۔ بلکہ بالکل خلاف واقعہ ہونے کے ساتھ مغالطہ بھی
ہے۔ ان کتابوں میں بعض روایتوں پر تنقید بھی ملتی ہے لیکن اس سے یہ کلیہ اخذ کرنا کہ ہر روایت
انہوں نے جانچ پرکھ کر ذکر کی ہے بالکل غلط اور فریب کارانہ استدلال و استنباط ہے۔ تاریخ
تو تاریخ ان لوگوں نے تو احادیث نقل کرنے میں بھی نقد و احتیاط سے کام نہیں لیا ہے اور صرف
ضعیف ہی نہیں احادیث موضوعہ تک ان کی کتابوں میں ملتی ہیں جس شخص نے ان کی کتابوں کا

مطالعہ سمجھ کر کیا ہے وہ ہمارے اس قول کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔

مثلاً گزشتہ صفحات میں ہم نے البدایہ والنہایہ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر والوں کو حکم دیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ علیہا التسلیم کے اونٹ کے پیر کاٹ دیئے جائیں۔ یہ روایت خود اپنی تکذیب کر رہی ہے جو شخص بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی کے مرتبہ عالی سے واقف ہے ہرگز اسے باور نہیں کر سکتا کہ انہوں نے ام المومنین حرمتہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ بے ادبی و گستاخی کی ہوگی۔ کیا مودودی صاحب علامہ ابن کثیر کے اعتماد پر اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں؟ یقیناً یہ روایت موضوع اور جھوٹی ہے اور کسی سبائی نے اپنی خباثت کو جائز قرار دینے کے لئے حضرت شیر خدا پر یہ افتراء کیا ہے اسی طرح "تلک الغرانیق العلے" والی روایت جسے قاضی عیاض وغیرہ بہت سے اکابر علماء نے موضوع اور زندیقوں کا افتراء قرار دیا ہے، تاریخ طبری میں متعدد سندوں سے ذکر کی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں میں بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ کیا ان صاحبان کے اعتماد پر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے گا؟ حالانکہ اس روایت کا سراپا کذب افترا ہونا اظہر من الشمس ہے۔

اسی طرح کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا ایک واقعہ یہ ہے کہ کعبہ شریف کی مرمت ہو رہی تھی اور آنحضور بھی سب کے ساتھ پتھر ڈھونے میں شریک تھے، اپنے چچا حضرت عباس رضی کے کہنے پر آپ نے اپنے تہبند کا کچھ حصہ سر مبارک پر رکھ لیا تاکہ پتھروں کی رگڑ نہ لگے جس کی وجہ سے کچھ برہنگی ہو گئی۔ اس پر آپ فرط حیا سے بے ہوش ہو گئے۔ یہ واقعہ آنحضور کے بچپن کا ہے، اور زمانۂ طفولیت میں یہ کوئی اہم بات نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ چونکہ عرب میں محنت و مشقت

کے وقت تہبند کے نیچے (جانگیہ یا نیکر) پہننے کا رواج عام تھا جواب تک ہے، اس لئے یقیناً آپ بھی نیچے جانگیہ پہنے ہوئے ہونگے اس کے معنی یہ ہیں کہ عرفی حیثیت سے برہنگی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعہ کا تذکرہ فتح الباری شرح بخاری ج ۳ کتاب الحج میں علامہ ابن حجرؒ نے کیا ہے اور اس میں محمد بن اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ بعثت سے پانچ سال قبل کا ہے یعنی اس وقت عمر شریف ۳۵ سال تھی۔ اور اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ کیا مودودی صاحب ابن حجر کے اعتماد پر اس روایت کو تسلیم کریں گے؟ کیا آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ۳۵ سال کی عمر میں یہ چیز ممکن ہے؟ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ابن اسحاق کا یہ قول بالکل باطل اور سراپا کذب وافتراء ہے معاذ اللہ عن ہذہ الاقوال الخبیثۃ۔

یہ چند نمونے اس لئے پیش کئے ہیں کہ قاری کو ان کتابوں کا درجہ معلوم ہو جائے جن کی روایتوں پر مودودی صاحب کی فتنہ انگیز کتاب کا دار و مدار ہے۔

رہا یہ کہنا کہ یہ حضرات مجروح راویوں کی وہی روایتیں ذکر کرتے ہیں جن کی تائید میں بہت سا تاریخی مواد موجود ہوتا ہے۔ ایک مبہم بات ہے جس کا ماحصل بھی وہی ہے کہ ان مورخین پر اعتماد کر کے ان کی ہر روایت کو قبول کر لیا جائے ـــــ سوال یہ ہے کہ وہ تاریخی مواد کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ خود اس کا کیا درجہ ہے؟ وہ خود بھی ثابت ہے یا نہیں؟ جب تک وہ سامنے نہ آئے اس وقت تک محض مؤلفین سے حسن ظن کی بنا پر اس کا وجود فرض کر کے ان کی ذکر کردہ روایتوں کو قبول کر لینا آخر کس دلیل شرعی یا عقلی کی بنا پر جائز ہے۔؟

سلسلۂ واقعات کی مناسبت کی بات اس سے بھی زیادہ بے جان ہے، اس مناسبت کے کیا معنی ہیں؟ اور اگر یہ لفظ بے معنی نہیں ہے تو اس کا اظہار بھی مؤلف کو کرنا چاہئے۔ کیا ان مورخین نے اس قسم کی ناقابل اعتماد روایتوں کے تذکرے کے ساتھ، سلسلۂ واقعات کے ساتھ ان کی

مناسبت کے تذکرے کا بھی التزام کیا ہے۔ ؟ اگر نہیں کیا ہے تو ان صاحبان پر اس ایمان بالغیب کی کیا بنا اور دلیل ہے ؟ پھر اگر بالفرض وہ کوئی مناسبت ذکر بھی کریں تو کیا ضروری ہے کہ ان کی رائے اس بارے میں صحیح ہو ؟ ایسی صورت میں ہم اس مناسبت کی صحت و غلطی کو بھی جانچیں گے ۔ اگر دلائل کی روشنی میں صحیح معلوم ہوئی تو تسلیم کریں گے ورنہ غلط قرار دیں گے۔

علاوہ بریں کسی روایت کا سلسلۂ واقعات سے مناسبت رکھنا فی نفسہٖ کسی دلیل سے بھی صحت روایت کی دلیل نہیں ہے واقعات معلوم ہونے کے بعد دروغ گو راوی ایسے قصے آسانی کے ساتھ گھڑ سکتے ہیں جن کی ساخت میں سلسلہ واقعات کے ساتھ مناسبت کا بھی لحاظ رکھا جائے ۔ بلکہ عام طور پر وضاع اور کذاب راویوں نے یہی کیا ہے ۔ کیونکہ اس طریقے سے سامع صحیح واقعات کے ساتھ اس کذب و افترا کو بھی غیر شعوری طور پر ہضم کر لیتا ہے۔

مثال کے طور پر سجدہ سورہ نجم کا واقعہ دیکھیے ۔ صحیح روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضورؐ اور صحابہ کرام نے جب سجدۂ تلاوت فرمایا تو مشرکین نے بھی سب کے ساتھ سجدہ کیا اس واقعہ کی شہرت سے زندیقوں اور ملحدوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ یہ ٹکڑا وضع کر کے جوڑ دیا کہ معاذ اللہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی آواز بنا کر شیطان نے یہ جملہ باآواز بلند کہا تھا تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى ۔ اسے سنکر مشرکین بھی سجدہ میں گر پڑے اس لئے کہ اس میں ان کے معبودان باطل کا تذکرہ اچھے عنوان سے کیا گیا تھا ملاحظہ ہو کہ کذابوں نے کس سلیقہ کے ساتھ یہ افترا کیا اور کس طرح سے اسے سلسلۂ واقعات کے مناسب بنا دیا ۔ کیا اس مناسبت کی وجہ سے اس موضوع روایت کو تسلیم کر لیا جائے گا ؟

——— اس قسم کی مثالیں تاریخ میں بکثرت ہیں ۔ اس زمانے میں بھی پروپیگنڈے کا یہ طریقہ بکثرت مستعمل ہے ۔

ان امور پر نظر کرنے کے بعد ہر سمجھدار آدمی اور منصف مزاج اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کسی خبر و روایت کا کسی سلسلۂ واقعات کے ساتھ مناسبت رکھنا اس کی صداقت کی دلیل ہرگز نہیں سمجھی جا سکتی۔ البتہ اس کے برعکس کسی روایت کا سلسلۂ واقعات کے ساتھ مناسبت نہ رکھنا اس کی صداقت کو کم از کم مشکوک ضرور بنا دیتا ہے۔ یہ وہ قاعدہ ہے جسے ہر ذی فہم تسلیم کرتا ہے اور دنیا کی عدالتیں عدل و انصاف کے بارے میں اس اصول سے کام لیتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ بیان کرے کہ فلاں شخص نے میرے ساتھ فوٹو کھنچوایا اور اس کے بعد میرا پرس مجھ سے چھین کر بھاگ گیا تو عدالت اس کی صداقت کا یقین نہیں کرے گی۔ اس لئے کہ فوٹو کھنچوا کر اپنی شناخت اور گرفتاری کو آسان بنا دینا، پرس چھین کر بھاگنے سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے منافی ہے۔

اگر مودودی صاحب اس اصول کو ملحوظ رکھ کر کتب تاریخ پر نظر کرتے تو بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتے اور بہت سی ان روایات کا ذخیرہ انہیں دریا برد کر دینا پڑتا جو کسی طرح بھی صحابہ کرام کی زندگی سے مناسبت نہیں رکھتی ہیں جس کی پاکیزگی و طہارت کو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ نے بیان فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک عجیب بات فرمائی ہے:

> "یہ طرز عمل صرف محدثین ہی کا نہیں ہے اکابر فقہا تک کا ہے۔ جو روایات کو قبول کرنے میں اور بھی زیادہ سختی برتتے ہیں۔ مثال کے طور پر امام شافعیؒ ایک طرف واقدی کو سخت کذاب کہتے ہیں اور دوسری طرف کتاب الام میں غزوات کے متعلق اس کی روایات سے استدلال بھی کرتے ہیں" (ص ۳۱۹-۳۱۰)

جس شخص نے کتاب الام نہیں دیکھی وہ تو مولانا کے اس مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن جس نے یہ بلند پایہ کتاب دیکھی ہے وہ متحیر ہو جائے گا کہ موصوف کیا فرما رہے ہیں۔ شاید "سیر الواقدی" کے عنوان سے موصوف کو یہ شبہ ہوا ہے اور اس کے ماتحت مضامین مولانا نے نہیں دیکھے، ان کے

ذمہ واجب تھا کہ ایک دو ایسی مثالیں پیش کرتے جن میں امام شافعیؒ نے واقدی کے کسی بیان پر اپنے کسی مسلک کی بنیاد رکھی ہو۔ بغیر اس کے اس قسم کا دعویٰ امام شافعیؒ پر الزام بیجا کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

"سیر الواقدی" کا عنوان امام موصوف نے اس لئے نہیں قائم کیا ہے کہ واقدی کی روایتوں سے استدلال کریں، چنانچہ عنوان کے ماتحت کہیں بھی واقدی کی کسی روایت سے استدلال نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ بتانے کے لئے قائم فرمایا ہے کہ واقدی جو مغازی میں مشہور ہے اس کی روایتیں مستند مسائل کے بارے میں قابل اعتماد نہیں ہیں، اور نہ مسائل سیر و مغازی ان سے ماخوذ ہیں بلکہ ان کی بنیاد دوسرے دلائل شرعیہ پر ہے جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "سیر و مغازی" کے بیان میں واقدی ایک خاص طرز کا موجد تھا جس کی وجہ سے اس کا نام اس عنوان کا جزو لاینفک بن گیا تھا۔ اور فرطِ شہرت کی وجہ سے بغیر اس کے نام کے اس کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے جب سیر کی روایتوں کا تذکرہ فرمانا چاہا تو وہ بھی اسے کذاب سمجھنے کے باوجود تفہیم عام کے لئے اس کا نام ذکر کرنے پر مجبور ہوئے۔

بطور مثال اس واقعہ کو ملاحظہ فرمایئے کہ طب یونانی میں اہل عرب نے جو اضافہ کیا ہے وہ اس سرمائے کا کئی گنا ہے جو انہیں اہل یونان سے ملا تھا اور نہ صرف اضافہ کیا ہے بلکہ اس کی اصلاح و تجدید کر کے اسے ایک نیا روپ دیا لیکن آج بھی اس کا نام طب یونانی ہی باقی ہے اور ہر شخص اس کے کسی حصے کے تذکرے کا عنوان اسی نام کو بنانے پر مجبور رہے۔

مودودی صاحب نے نقد روایت کے سلسلہ میں اسناد کے اعتبار سے حدیث و

تاریخ کے درمیان فرق ظاہر کرنے کی سعی لاحاصل تو بہت کی ہے مگر ان دونوں میں جو فرق واقعی ہے اسے بالکل نظر انداز فرما دیا جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اسے ظاہر فرما دیتے، تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خلاف جو مورچہ انہوں نے تارِ عنکبوت سے تیار کیا ہے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اس لئے موصوف نے اصول درایت کو بالکل نسیاً منسیاً بنانے کی کوشش کی ہے اور کہیں اشارۃً بھی اس کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔

جہاں تک درایت کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے حدیث و تاریخ میں بڑا فرق ہے اگرچہ محدثین و فقہائے کرام نے روایت حدیث کے قبول و عدم قبول کے بارے میں اصول اسناد کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا ہے لیکن یہ استعمال محدود پیمانے پر کیا گیا ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقوال و افعال ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہوں۔ نبی اور غیر نبی کی خبر کو اس اعتبار سے مساوی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

اس کے برخلاف تاریخ میں درایت کا استعمال آزادی کے ساتھ اور وسیع پیمانے پر کیا جا سکتا ہے اور سلسلہ سند صحیح اور بے عیب ہونے کے باوجود ایسی تاریخی روایتوں کو رد کیا جا سکتا ہے۔ جو اصول درایت کے خلاف ہیں۔ یہ قاعدہ عقلی و منطقی طور پر بھی صحیح ہے بلکہ اسے فطری کہا جا سکتا ہے اور مورخین نے بکثرت اس سے کام لیا ہے اور آج بھی کام لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عدالتوں میں بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

"خلافت و ملوکیت" کے ماخذ پر جن کا تذکرہ مودودی صاحب نے کیا ہے اگر درایت کی روشنی میں نظر کی جائے تو ان کا ایک بڑا حصہ بالکل ہبار منثورا بن جائیگا۔ اور صرف صحابہ کرام ہی کے متعلق نہیں بلکہ بنو امیہ اور بنو عباس کے متعلق بھی مثالب و

مطاعن کی روایتوں کا جو ڈھیر ان کتابوں میں لگا یا گیا ہے ان کا بھی ایک بڑا حصہ اصول اسناد و روایت سے قطع نظر محض درایت کی روشنی میں، ساقط الاعتبار اور کذب و دروغ کا انبار نظر آئے گا۔

یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب نے حدیث و تاریخ کے اس واضح اور مشہور فرق کا بالکل تذکرہ نہیں فرمایا ہے اور اسے پوشیدہ رکھنا چاہا۔

بے احتیاطی کے اسباب

گزشتہ بحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ مودودی صاحب کی زیر نظر کتاب کے تاریخی مآخذ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی روایتوں کو بغیر نقد و نظر کے تسلیم کر لیا جائے۔ مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ ان کتابوں کے مصنفین کے علم و تقویٰ کی بنا پر ان کی نقل کردہ روایتیں واجب التسلیم ہیں، بالکل بے دلیل اور غلط ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان کا غلط اور بے جان ہونا بھی آفتاب سے زیادہ روشن ہو چکا اس کے بعد اس سوال کا جواب دینا ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ان حضرات مورخین نے نقل روایت میں اتنی بے احتیاطی سے کیوں کام لیا؟ اور ایسی روایتوں کو اپنی کتابوں میں کیوں جگہ دی؟ جو معیار پر پوری نہیں اترتی ہیں اور ٹکسال باہر ہیں۔؟

ناظرین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا ناگزیر ہے، خصوصاً جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض مصنفین اپنے علم و تقویٰ کے اعتبار سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً علامہ ابن الاثیر علامہ ابن کثیر، حافظ ابن عبد البر وغیرہم تو انہیں اس لئے اس تساہل پر اور بھی تعجب ہوتا ہے۔

اس تعجب کو دور کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے اور تکمیل بحث کے لئے بھی ہمیں اس کی کوئی احتیاج نہیں ہے تاہم اس موقع پر اگر اس کے متعلق چند سطریں لکھدی جائیں تو انشاء اللہ مفید ہی ہوں گی۔

اس قسم کی روایتیں، جن حضرات نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جنہوں نے قصداً محض سلف کو مطعون کرنے اور مسلمانوں میں فاسد خیالات پھیلانے کے لئے ایسا کیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو خود فاسد العقیدہ اور گروہ اہل سنت والجماعۃ سے خارج تھے، ان پر ہم سردست بحث نہیں کریں گے، بلکہ چند سطروں کے بعد مناسب موقع پر واضح کریں گے۔ یہاں ہمیں انہیں حضرات سے بحث کرنا ہے جن کا اہل سنت میں ہونا سب کو مسلم ہے انہوں نے نقل روایت میں جو تساہل کیا اس کی وجہ کیا تھی ؟ -

اس کے اسباب مختلف اور متعدد ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ بعض حضرات نے کسی خاص مقصد سے روایتیں جمع کرنا چاہیں، انہوں نے صرف یہ بات پیش نظر رکھی کہ ان کا مقصد ان روایتوں سے حاصل ہوتا ہے، خواہ وہ روایت صحیح ہو یا غلط۔ حافظ عبدالبر کی کتاب استیعاب میں یہی چیز نظر آتی ہے۔ مصنف نے کتاب کے دیباچے میں ظاہر کیا ہے کہ ان کا مقصد اس کتاب کی تدوین سے صحابہ کرام کا استیعاب کرنا اور یہ بتانا ہے کہ فلاں فلاں حضرات صحابی تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ہر ایک ایسی روایت درج کر دی ہے جس سے کسی کی صحابیت پر روشنی پڑتی ہو، خواہ وہ روایت غلط ہو یا صحیح، اس لئے کہ یہ مقصد تو موضوع اور غلط روایتوں سے بھی بعض اوقات حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی سبائی کسی صحابی پر جھوٹا الزام لگانے کے لئے ایک روایت وضع کرتا ہے، وہ روایت سرتاپا جھوٹ ہے لیکن اس سے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحب واقعہ صحابی ہیں اور انہیں دشمنان صحابہ بھی

صحابی سمجھتے ہیں۔ استیعاب کرنے کے لئے صاحب "استیعاب" نے ہر قسم کی روایتیں جمع کردی ہیں۔ ان میں موضوع بھی ہیں، ضعیف بھی، یہاں تک کہ بلاسند بازاری قصے اور افواہیں بھی

اس کتاب کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ جہاں اس میں کام کی خبریں ہیں۔ وہاں فضولیات ولغویات کا انبار بھی ہے۔ بلکہ جگہ جگہ مکذوبات وموضوعات کے ڈھیر بھی ہیں اسے بحیثیت مجموعی معتبر سمجھنا خود اپنے اعتبار سے ہاتھ دھونا ہے۔

بعض حضرات کا اسلوب تحریر اطناب اور تطویل تھا، اس کی ایک شکل یہ بھی ہوتی تھی کہ انہیں اگر دس روایتوں میں کوئی ادنیٰ سا جزو مشترک نظر آجاتا تھا تو وہ ان دسوں روایتوں کو نقل کردیتے ہیں۔ خواہ بقیہ اجزاء کے لحاظ سے ان میں سے نو روایتوں میں سارا مواد موضوع اور جھوٹ کی پوٹ ہی کیوں نہ ہو تاریخ کی کتابوں میں اس شکل کی روایتیں بکثرت نظر آتی ہیں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روش تاریخ وتفسیر دونوں میں اختیار کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ ان غلط روایتوں پر نقد بھی کرتے ہیں اور بعض جگہ خاموشی سے نکل جاتے ہیں اور نقد کا کام قاری پر چھوڑ دیتے ہیں مثلاً جنگ صفین کے بارے میں وہ متضاد ومتناقض روایتیں نقل کرتے ہیں اور کوئی تبصرہ نہیں کرتے واقعہ کربلا کے متعلق شیعوں کی موضوع جھوٹی روایتیں نقل کردیتے ہیں اور بعض کے متعلق اتنا کہدیتے ہیں کہ یہ شیعوں کی وضع کردہ ہیں بعض کے متعلق یہ بھی نہیں کہتے۔

علی ہذا اپنی تفسیر میں آیۂ تطہیر کے متعلق، بکثرت ضعیف وموضوع روایات جمع کردی ہیں۔ آخر میں بہت مجمل اور مبہم تبصرہ کیا ہے۔ جس سے اکثر روایات کے بارے میں کوئی روشنی نہیں حاصل ہوتی، اسی عادت کی وجہ سے انہوں نے ایسی بہت سی روایتیں بھی اپنی کتاب میں داخل کرلی ہیں، جو خود ان کے نزدیک بھی غلط اور موضوع ہیں۔ ان کی

تاریخ یا تفسیر میں کسی روایت کا آجانا، اس کا بھی ثبوت نہیں ہے کہ وہ خود ان کے نزدیک ثابت ہے، چہ جائیکہ فی نفسہٖ اس کے ثبوت کی دلیل ہو۔

بعض روایتیں باوجود غلط ہونے کے کسی خاص وجہ سے عوام میں اس قدر مشہور ہو جاتی ہیں کہ مورخ انہیں غلط سمجھتے ہوئے بھی ان کا تذکرہ، مورخانہ حیثیت کا ضروری تقاضہ سمجھتا ہے مثال کے طور پر کلکتہ کے بلیک ہول کا قصہ انگریزوں کا گڑھا ہوا افسانہ ہے بکثرت ہندوستانی مورخین نے اس کی تکذیب کی ہے لیکن باوجود اس کے عام طور پر تاریخ ہند کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ضرور کیا جاتا ہے بعض مورخین تذکرے کے ساتھ اس کی تردید بھی کر دیتے ہیں۔ بعض اس کی بھی ضرورت نہیں محسوس کرتے اور اس جھوٹے قصہ کو بغیر نقد و تبصرہ بیان کر دیتے ہیں حالانکہ وہ خود اسے غلط سمجھتے ہیں۔

اسی طرح تاریخ اسلام کے بہت سے مولفین نے مخالفین صحابہ و بنو امیہ و معاندین بنو عباس کی وضع کی ہوئی بہت سی غلط روایتوں کو اپنی کتابوں میں صرف اس لئے جگہ دیدی کہ محض ان کی شہرت ان کی مورخانہ حیثیت سے ان کے تذکرے کا تقاضا کر رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ روایتیں بالکل موضوع، جعلی اور غلط ہیں لیکن ان کے تذکرے سے کتاب کا خالی ہونا اپنی مورخانہ تنگ دستی کے مرادف سمجھ کر انہوں نے بادل ناخواستہ انہیں جزو کتاب بنایا بعض کی غلطی تو انہوں نے واضح کر دی مگر بعض کے متعلق اپنے زمانے کے حالات اور علمی معیار کے اعتبار سے یہ رائے قائم کی کہ ان کے موضوع اور کذب و دروغ ہونے کی شہرت بھی علمی دنیا میں ان کی شہرت کے متوازی چلی آ رہی ہے اس لئے تردید کی حاجت نہیں ہے عام طور پر اہل علم ان کی غلطی سے واقف ہیں۔

یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ اس کی نظر مستقبل میں بہت دور تک نہیں جا سکتی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ایک زمانے میں انقلاب آجائے گا اور ایک دن انہیں روایتوں کی بنیاد پر بنو امیہ

اور بنو عباس ہی نہیں، صحابہ کرام پر بھی طعن و طنز کی بوچھار ان لوگوں کی طرف سے ہوگی، جو اہلسنت والجماعت ہونے کے مدعی ہوں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان غلط روایات کی شہرت، ان کی اصلیت یا کسی درجہ میں بھی ان کی صداقت و صحت کی دلیل نہیں ہے۔ شہرت کا راز صرف یہ ہے کہ مخالفین نے اپنے ناپاک مقاصد کے پیش نظر عوام الناس میں انہیں شہرت دینے کی مخصوص طور پر کوشش کی، جیسے بلیک ہول یا انار کلی کے جھوٹے قصے جس قدر مشہور رہیں اسی قدر صداقت و صحت سے دور ہیں۔

مودودی صاحب نے بڑے طمطراق سے تحریر فرمایا ہے کہ بعض مورخین اسلام مثلاً ابن کثیر وغیرہ جن راویوں کو خود کاذب اور وضاع کہتے ہیں اپنی کتاب میں بلا تکلف ان کی روایتیں نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بات اس کی دلیل ہے کہ وہ لوگ ان روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مودودی صاحب کے فہم کی غلطی ہے واقعہ یہ ہے کہ معاملہ بالکل برعکس ہے ان مؤلفین نے جن راویوں کو بالکل مجروح قرار دیا ہے ان کی روایتیں وہ صرف اس لئے نقل کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے عقائد و افکار کو سامنے لایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اس قسم کے مخالف افراد نے کیا کیا افترا پردازیاں کی ہیں تاکہ مسلمان اہل علم ان کے کید و فریب سے آگاہ ہو جائیں۔

رہا ان روایتوں کی صحت و غلطی یا قبول و عدم قبول کا مسئلہ تو وہ حضرات شاید اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ دنیا میں ایسے اشخاص بھی پیدا ہوں گے جو ان روایتوں کو مؤلف کے نزدیک مقبول روایات قرار دیں گے۔ جن کے راویوں کو مؤلف خود مجروح قرار دے چکے ہیں۔ پڑھنے والوں کی فہم سلیم پر اعتماد کر کے ——————

—————— انہوں نے ان میں سے بہت سی روایتوں پر تنقید نہیں کی اور یہ سمجھے کہ راویوں پر بھاری جرح معلوم ہونے کے بعد ان کی روایتوں کو کوئی شخص

بھی باور نہ کرے گا اس لئے ان پر لفظ کی احتیاج نہیں ہے افسوس ہے کہ مودودی صاحب نے ان کے اس حسن ظن کو اپنے بارے میں بے محل ثابت کر دیا اور ان کی طرف وہ بات منسوب کی جو شاید ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آتی ہوگی۔

ان اسباب پر اس واقعہ کا بھی اضافہ کیجئے کہ بعض مصنفین نے روایات واحادیث کا ذخیرہ اس غرض سے جمع کیا تھا کہ ان کی تہذیب و تنقید کر کے اپنی کتاب مرتب کریں گے جس میں صرف وہ روایتیں مذکور رہیں گی جو نقد کی کسوٹی پر پوری اتریں گی باقی ٹکسال باہر قرار دے دی جائیں گی لیکن حالات نے مساعدت اور عمر نے وفا نہ کی۔ رطب ویابس اور کھرے کھوٹے کا یہ مجموعہ بدستور چھوڑ کر وہ رخصت ہو گئے اور زمانے نے نادانی اور لاعلمی سے یہ پورا مجموعہ ان کے قلم سے وابستہ کر دیا۔

بطور مثال علامہ جلال الدین سیوطیؒ کو پیش کیا جا سکتا ہے جنہیں ان کے اسی طرز عمل کی وجہ سے بعض حضرات نے حاطب اللیل کا خطاب دے دیا ہے حالانکہ وہ بیچارے اس الزام سے بری ہیں اور اصل واقعہ وہ ہے جو میں نے ذکر کیا ہے۔ اہل علم کو معلوم ہے کہ امام بخاریؒ نے متعدد بار صحیح بخاری کی تہذیب و تدوین کی ہے۔ جب ان کی کتاب نے کتب حدیث وہ اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا ہے جو کسی کتاب کو حاصل نہ ہو سکا

یہ مختلف اسباب ہیں جن کی وجہ سے تاریخ اسلام میں وہ روایتیں داخل ہو گئیں جو دشمنان اسلام نے، اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور صحابہ کرام کو بدنام کرنے کے لئے وضع کی تھیں۔ سب اسباب کا یکجا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ان مکذوبات وموضوعات کو ان میں سے کسی کتاب میں داخل کرنے میں ایک سبب کو دخل ہے تو دوسری کتاب میں ان کا اجتماع کسی دوسرے سبب کا رہین منت ہے۔ کسی جگہ آپ متعدد اسباب کو مجتمع بھی پائیں گے۔

یہ بات کہ ان جھوٹی روایتوں اور کذاب راویوں کی زہریلی غلط بیانیوں کو جزو کتاب بنانے میں کہاں کہاں اور کس سبب کو دخل ہے اس کتاب کے عمیق مطالعہ مؤلف کے حالات اور اس دور کے علمی ماحول کے سمجھنے سے معلوم ہوسکتی ہے اتنی تفصیل کی نہ یہاں گنجائش نہ ضرورت۔

جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ حضرات ابن الاثیر، ابن کثیر ابن حجر و امثالہم رحمہم اللہ کے بلند مرتبہ کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کی بیان کردہ روایات کو خواہ وہ تاریخی ہوں یا حدیث کے ذیل میں آتی ہوں، آنکھیں بند کرکے نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ انہیں بغیر جانچ اور تنقید کے قبول کرلینا کسی صاحب علم کے لئے نہ عقلاً صحیح ہے نہ شرعاً۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ نقل روایت میں ان حضرات سے غلطی اور بے احتیاطی ہوئی ہے اور بکثرت ہوتی ہے۔ ہم نے اس غلطی کے جو اسباب ذکر کئے ہیں وہ ان کی طرف سے اعتذار کی حیثیت رکھتے ہیں اگر بالفرض ان کی کسی تحریر سے یہ بات ثابت ہوجائے کہ اس قسم کی غلطی انہوں نے دیدہ و دانستہ کی ہے اور مندرجہ بالا توجیہات میں سے کوئی توجیہہ وہاں کام نہ دیتی ہو۔ تو بھی ہم ان کے بیان اور ان نقل کے پابند نہ ہوں گے بلکہ کھلم کھلا ان کی غلطی کا ابطال کریں گے۔ کوئی عقلی یا شرعی دلیل ہمیں ان کی نقل پر اس قدر اعتماد کے لئے مجبور نہیں کررہی ہے۔

اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے بعض ایسی باتیں بھی ارشاد فرمائی ہیں جو علمی استدلال کے بجائے خطابت کے ذیل میں آتی ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے اختیار کئے ہیں کیوں کہ ان پر حلال و حرام فرض و واجب اور مکروہ و مستحب جیسے اہم شرعی امور کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ

دین میں کیا چیز سنت ہے اور کیا چیز سنت نہیں ہے۔ یہ شرائط اگر تاریخی واقعات کے بارے میں لگائی جائیں تو اسلامی تاریخ کے ادوار مابعد کا تو سوال ہی کیا ہے قرون اولیٰ کی تاریخ کا بھی کم از کم ۹/۱۰ حصہ غیر مفید قرار پا جائے گا اور مخالفین انہیں شرائط کو سامنے رکھ کر ان تمام کارناموں کو ساقط الاعتبار قرار دیدیں گے جن پر ہم فخر کرتے ہیں کیونکہ اصول حدیث اور اسماء الرجال کی تنقید کے معیار پر ان کا بیشتر حصہ پورا نہیں اترتا۔ حد یہ ہے کہ سیرت پاک بھی مکمل طور پر اس شرط کے ساتھ مرتب نہیں کی جا سکتی کہ ہر روایت ثقات سے ثقات نے متصل سند کے ساتھ بیان کی ہو۔ (صفحہ ۳۱۷ تا ۳۱۸)

اس بیان میں پہلی غلطی تو وہی ہے جس کی نشاندہی ہم پہلے کر چکے ہیں، یعنی یہ محض غلط فہمی ہے، کہ روایات کو پرکھنے کے اصول محض حدیث تک محدود ہیں۔ دوسری شدید غلطی یہ ہے کہ احکام کے تصور کو عملی احکام تک محدود کر دیا گیا ہے۔ گویا جن روایات کا تعلق بیع و شراء، طہارت و نجاست کے ساتھ ہے انہیں تو جانچنا پرکھنا لازم لیکن جن روایات کا اثر عقائد پر پڑتا ہے انہیں آنکھیں بند کر کے قبول کر لینا چاہئے۔ ان کے لئے نہ اصول ہیں نہ قاعدے۔

غسل و وضو کا مسئلہ ہو تو ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کے ایسے فقہاء، اور بخاریؒ و مسلمؒ جیسے محدثین کی روایت بھی بغیر نقد و نظر کے تسلیم نہ کی جائے، اور صحابہ کرام کی بے توقیری کے بارے میں طبری اور واقدی کے لیے کذب تو اندوں کے لغو و لاطائل ذخیرۂ روایات کو بھی سر آنکھوں پر رکھا جائے۔ حالانکہ صحابۂ کرام سے حسن ظن نہیں حسن عقیدت اہلسنت و الجماعت کا شعار ان کا امتیازی نشان اور شرعاً واجب ہے اور ان سے سوء ظن حرام۔ اس وجوب و حرمت سے تعلق رکھنے والی روایتوں کو اصول حدیث کے معیار پر کیوں نہ جانچا جائے، جبکہ عقیدہ کی

کی اہمیت اسلام میں عمل سے بدرجہا زائد ہے ؟ ۔

مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کہ اصول حدیث کی روشنی میں نقد و نظر سے قرن اولیٰ کی تاریخ کا کم از کم ۹/۱۰ حصہ غیر معتبر قرار پائے گا ۔ نہ صرف غلط ہے بلکہ مضحکہ خیز اور حیرت انگیز بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم اور متصل دور صحابہ سے ان کی واقفیت بہت محدود اور سطحی ہے اگر انہوں نے سیرۃ النبی مصنفہ علامہ شبلی مرحوم ہی کا مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ دور نبوی کی تاریخ طبری و ابن اسحاق پر موقوف نہیں ہے ، علامہ موصوف نے اس قسم کے سب مؤلفین اور ان کی کتابوں کو غیر معتبر قرار دیا ہے اور اپنی کتاب کا سرچشمہ صرف قرآن مجید و احادیث معتبرہ کو بنایا ہے ۔

پھر تاریخ کی ان کتابوں میں بھی جن کا حوالہ بار بار مودودی صاحب نے دیا ہے قابل اعتماد تاریخی روایات کا اتنا ذخیرہ موجود ہے ۔ جو صرف قرن اولیٰ نہیں بلکہ قرن مابعد کی تاریخ کو روشن کرنے کے لئے بھی بالکل کافی ہے ۔ کذابوں اور معتزلیوں کی گھڑی ہوئی غلط کے جو ڈھیر ان کتابوں میں جمع ہو گئے ہیں اور جن کے تعفن سے مودودی صاحب نے اپنی فتنہ انگیز اور گمراہ کن کتاب کے اوراق بسائے ہیں اگر جلا کر صاف کر دیئے جائیں تو اسلامی تاریخ مخفی نہ ہو جائے گی بلکہ نکھر کر سامنے آ جائے گی اور دنیا دیکھ لے گی کہ صحابہ و تابعین بنو امیہ اور بنو عباس کا دور بھی بحیثیت عمومی ایسا مبارک ، شاندار اور قابل تعریف تھا کہ غیر اسلامی تاریخ تو اس کی نظیر پیش کرنے سے قطعاً قاصر ہی ہے ۔ اسلامی تاریخ مابعد میں بھی اس کے نظائر کم ہی دستیاب ہوں گے ۔

مودودی صاحب کو شاید اس کا علم نہیں ہے کہ ہمارے کارنامے ثبوت کے لئے ابو مخنف اور جابر جعفی کے ایسے کذابوں کے محتاج نہیں ہیں نہ واقدی کے ایسے دروغ گو کے بیان پر موقوف

ہیں۔ ان کا ثبوت قرآن مجید احادیث مقبولہ اور نقل متواتر سے ملتا ہے۔ اصول صحیحہ کی کسوٹی پر وہ پورے اترتے ہیں یہی نہیں بلکہ مخالفین اسلام بھی انہیں اعتراف کے ساتھ نقل کرتے ہیں، اگر تفصیل میں کچھ جزئیات غیر معتبر بھی قرار پائیں تو ان سے ہماری شاندار تاریخ میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا، اگر ان کا ثبوت اس قدر کمزور ہوتا کہ نقد وخبر کی بھٹی میں پگھل کر بہ جاتا تو مخالفین کب کے اسے ساقط الاعتبار قرار دے چکے ہوتے۔ البتہ مودودی صاحب کی اس کتاب کو دیکھ کر وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جس قوم کی پوری تاریخ حکومت ظلم وستم سے بھری ہوئی ہے اس کے اخلاقی تفوق اور حسن کردار کے قصے مشکوک قرار دیئے جائیں تو کون سی دلیل اس شک کو یقین واعتراف سے بدل سکتی ہے معلوم نہیں مودودی صاحب کے پاس مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا جواب کیا ہے ؟۔

اسی بحث میں مودودی صاحب ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"آج کل یہ خیال بڑے زور وشور سے پیش کیا جارہا ہے کہ ہمارے یہاں تاریخ نویسی چونکہ عباسیوں کے دور میں شروع ہوئی تھی، اور عباسیوں کو بنی امیہ سے جو دشمنی تھی وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے اس لئے جو تاریخیں اس زمانے میں لکھی گئی ہیں وہ بھی اس جھوٹے پروپیگنڈے سے بھر گئیں جو بنی عباس نے اپنے دشمنوں کے خلاف برپا کر رکھا تھا"

موصوف اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ ؛۔

"لیکن اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو آخر اس بات کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے کہ انہیں تاریخوں میں بنو امیہ کے وہ شاندار کارنامے بھی بیان ہوئے ہیں جنہیں یہ حضرات فخر کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور انہیں میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بہترین سیرت کا بھی ذکر ملتا ہے جو بنی امیہ ہی میں سے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں

تاریخوں میں بنی عباس کے بھی بہت سے عیوب اور مظالم بیان کئے گئے ہیں کیا یہ
ساری خبریں بھی بنی عباس نے خود ہی پھیلائی تھیں؟ (صفحہ ۳۱۹ تا ۳۲۰)

جواب میں عرض ہے کہ آپ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے جو حضرات ان تاریخوں کو بنو امیہ کے بارے میں اس بنیاد پر ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں کہ یہ عباسی دور میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عباسی حکومت نے اپنی نگرانی میں یہ کتابیں لکھوائی تھیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں فضا ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ بنوامیہ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے اور بیجا الزام تراشی نہ صرف آسان ہو گئی تھی بلکہ ایسی چیزوں کو قبول کرنے کے لئے ذہن تیار بلکہ منتظر رہتے تھے۔

شیعوں نے جو نہ صرف بنو امیہ بلکہ صحابہ کرام کے بھی دشمن تھے اس فضا سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ان کے خلاف خوب خوب افترا پردازی اور دروغ بافی کی، جھوٹے افسانے گڑھے اور گڑھ کر انہیں خوب شہرت دی۔ حکومت کے خوف سے کسی میں ہمت نہ تھی کہ ان غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کے خلاف لب کشائی کرتا۔ افسوس ہے کہ ان مورخین نے آنکھیں بند کر کے کوڑے کے اس پورے ڈھیر کو سمیٹ کر اپنی جھولی میں رکھ لیا۔

اس فضا کے پیدا ہونے کے اسباب کی تفصیل کا بیان غیر ضروری اور باعث تطویل ہے اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فاتح عموماً مفتوح کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہے۔ تاکہ اس انقلاب کو عام طور پر پسند کر لیا جائے اس اصول کے ماتحت عباسی حکومت کی جانب سے شروع میں اموئیوں کے خلاف پروپیگنڈا ہوا۔ اس سے یہ فضا پیدا ہوئی۔ حکومت کا رخ دیکھ کر اور اس فضا سے دشمنان اہل سنت یعنی سبائیوں نے پورا پورا فائدہ اٹھا کر بنو امیہ اور صحابہ کے خلاف کذب و افترا کے انبار لگا دیئے اور ہر کوچہ و برزن میں انہیں مشتہر کیا۔ مورخین نے جن میں درحقیقت اس وقت تک صحیح مورخانہ مذاق پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ جمع روایت کے شوق یا بعض

دوسرے اسباب کی وجہ سے جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں، ان بازاری قصوں کو بھی اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔

رہ گئے بنو امیہ کے قابل فخر کارنامے! تو وہ اس قدر مشہور و معروف تھے کہ ان کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ان پر پردہ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا ان کا تذکرہ کرنا ان مورخین کا بنو امیہ پر کوئی احسان نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کارناموں کے تذکرے پر مجبور تھے۔ ان کو نظر انداز کر دینے کے معنی یہ تھے کہ ان کی کتابیں ناقص اور علمی دنیا میں بے قیمت ہو جائیں۔ اس زمانے میں نہ پریس ایجاد ہوا تھا اور نہ حکومتوں کے ذرائع اطلاعات اس قدر وسیع تھے کہ ہر کتاب کے مضامین کا انہیں علم ہو جاتا۔

اس کے علاوہ عباسی بھی سنی تھے، انہیں بنو امیہ کے بعض حکمرانوں سے عداوت تھی مگر نہ صحابۂ کرام سے عداوت تھی، نہ ہر اموی سے وہ اتنے تنگدل بھی نہ تھے کہ فتوحِ بنو امیہ کے صحیح کارناموں کا بیان بھی گوارا نہ کرتے۔ اس لئے اگر ان کے علم میں بھی بنو امیہ کے کارناموں کی اشاعت کی گئی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کی عالی حوصلگی نے تو برامکہ کے زوال کے بعد ان کی مفروضہ خوبیوں کے جھوٹے اور من گھڑت افسانوں کی اشاعت بھی گوارا کر لی تھی حالانکہ برامکہ وہ لوگ تھے جو عباسی سلطنت کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے۔

پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ کتابیں عباسی اقتدار قائم ہونے کے زمانۂ دراز کے بعد لکھی گئی ہیں جبکہ طبعی طور پر عباسیوں میں بھی امویوں کی مخالفت و عداوت کا جوش خاصا سرد پڑ چکا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مقدس اور پاکیزہ سیرت سے اعراض کی جرأت کون کر سکتا تھا؟ بنو عباس بھی ان کے دشمن نہ تھے۔ اس لئے ان کے تذکرے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس کتاب میں ان کا تذکرہ ہو وہ سرتاپا قابل اعتماد بن جائے، سراپا صدق اور سراپا کذب کے درمیان

ایک منزل صدق و کذب کی آمیزش کی بھی ہے اور مودودی صاحب کی کتاب کے مذکورہ تاریخی ماخذ اسی قسم میں داخل ہیں۔

ہم عرض کرچکے ہیں کہ تاریخ کی کوئی کتاب عباسی حکمرانوں نے اپنی زیر نگرانی نہیں لکھوائی تھی، اس لئے ان تاریخوں میں ان کے مبینہ عیوب اور مظالم کا تذکرہ ذرہ برابر بھی خلاف قیاس اور لائق تعجب نہیں، اور ان کتابوں کے اعتبار میں ذرا سا بھی اضافہ نہیں کرتا ہے۔ خصوصاً جب یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ سبائی جس طرح بنو امیہ کے دشمن تھے اسی طرح عباسیوں کے بھی دشمن تھے ان کے خلاف بھی جھوٹی روایتیں گڑھنے اور ان کے فرضی مظالم کی داستانیں وضع کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ہمیں حیرت ہے کہ مودودی صاحب نے اس قدر کمزور دلیلوں کا سہارا لینے کی جرأت کیسے کی؟ جو علمی میدان میں دو قدم بھی نہیں چل سکتیں، اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ مولانا کے بیان و جواب میں کوئی جان نہیں ہے۔ اس پر مزید روشنی خود ہندوستان و پاکستان کی تاریخ سے پڑتی ہے۔ انگریزوں نے مغلیہ حکومت کے خلاف کیا کیا پروپیگنڈہ کیا؟ اور اشارہ چشم و ابرو پاکر خود ملکی مصنفین نے بھی انہیں بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر انگریزوں اور ہندو مورخین کا قلم جگہ جگہ مغلوں کو خراج تحسین و آفرین پیش کرتا ہے۔

اسی طرح بعض متعصب ہندو مورخین جب اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس پر تعصب، تنگدلی اور ظلم و ستم کے غلط الزامات لگانے سے بھی نہیں چوکتے تو بہت سے مواقع پر اس کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح انگریزوں کو خوش کرنے والے مورخین اپنی کتابوں میں خود انگریزوں کے عیوب مظالم کا تذکرہ بھی صفائی کے ساتھ کرتے ہیں۔

مودودی صاحب اگر انہیں واقعات پر نظر کرتے تو انہیں اس خامہ فرسائی کی ضرورت نہ ہوتی اور کاتب و قاری دونوں کا وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا۔

ان کی اس کتاب کی ایک خصوصیت تناقض بیان بھی ہے۔ اس کا ایک نمونہ اس سلسلہ میں بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

" اہل عجم میں نسلی فخر پہلے سے موجود تھا۔ خصوصاً عربوں کو تو اپنے مقابلہ میں وہ نہایت حقیر سمجھتے تھے۔ اسلامی فتوحات کے دور میں جب وہ ریگستان عرب کے شتربانوں سے مغلوب ہوتے تو اول اول انہیں اپنی ذلت کا سخت احساس ہوا " (ص ۱۹۶)

انہوں نے دکھایا ہے کہ عجمیوں کی یہ نسلی عصبیت اور عربوں سے نفرت اسلام کے اعلیٰ اصول اور علماء و صلحاء کے طرز عمل کی وجہ سے دب گئی لیکن کچھ مدت کے بعد پھر ابھری۔ اس پر مزید طرہ یہ ہوا کہ عباسیوں کے زمانہ میں انہیں اقتدار میں بھی بہت بڑا حصہ مل گیا چنانچہ لکھتے ہیں:۔

" الجاحظ کہتا ہے کہ دولت عباسیہ ایک خراسانی حکومت بن کر رہ گئی (البیان ج ۳ ص ۱۰۱) منصور کے زمانہ خلافت میں سپہ سالاری اور گورنری کے اکثر و بیشتر مناصب پر عجمی مقرر کئے گئے اور عربوں کی بالادستی ختم ہو کر رہ گئی "

(المسعودی مروج الذہب والمقریزی) ص ۲۹۱

شعوبی عصبیت رکھنے والے جب عہدوں پر فائز اور خلیفہ پر حاوی ہو گئے تو انہوں نے اسلامی تاریخ کو تاریک بنانے اور مسلمانوں کے ماضی کو مسخ کرنے کے لئے کیا کیا؟ اس کا بیان مودودی صاحب ہی کی زبان سے سنئے تحریر فرماتے ہیں۔

" اس شعوبی تحریک کا آغاز تو اس بحث سے ہوا تھا کہ عربوں کو عجمیوں پر کوئی

فضیلت حاصل نہیں ہے۔ لیکن بہت جلد ہی اس نے عربوں کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا، اور عرب کی مذمت میں کتابیں لکھی جانے لگیں، جن کا تفصیلی ذکر ابن الندیم کی الفہرست میں ہمیں ملتا ہے۔

معتدل قسم شعوبی تو اس سے آگے نہ بڑھتے تھے مگر اس گروہ کے انتہا پسند لوگ عربوں سے گزر کر خود اسلام پر حملے کرنے لگے، اور عجمی اُمراء، وزراء، کتّاب (سکریٹری) اور فوجی قائدین نے در پردہ ان کی ہمت افزائی کی۔

الجاحظ کہتا ہے کہ بہت سے لوگ جن کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک پائے جاتے ہیں ان کے اندر یہ بیماری شعوبیت کی راہ سے آئی ہے۔ وہ اسلام سے اس لئے بیزار ہیں کہ عرب اس دین کو لانے تھے (کتاب الحیوان) ان لوگوں نے مانی، زردشت اور مزدک کے مذاہب و عقائد کو زندہ کرنا شروع کیا۔ انہوں نے عجمی تہذیب نظام سیاست و ملک داری کے فضائل بیان کرنا شروع کئے ...... اور ان میں سے بعض نے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر پھیلائیں ...... ایک اور شخص یونس ابن فروہ نے اسلام اور عرب کی مذمت میں ایک کتاب لکھ کر قیصر روم کے دربار میں پیش کی اور اس پر انعام پایا" (امالی مرتضٰی)

آگے لکھتے ہیں:۔

"الجاحظ اپنے رسائل میں عجمی کاتبوں (حکومت کے سکریٹریوں) کی ایک کثیر تعداد کا حال یہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کی ترتیب پر طعن کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس میں تناقض ہے، احادیث کو جھٹلاتے ہیں اور ان کی صحت میں

شکوک پیدا کرتے ہیں۔ صحابہ کے محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی زبان رکتی ہے قاضی شریح اور حسن بصری اور الشعبی کا ذکر آتا ہے تو یہ ان پر اعتراضات کی بوچھار کرتے ہیں گو اردشیر بابکان اور نوشیروان کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سیاست اور ان کے تدبر کی تعریف میں یہ رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔"

(ثلاث رسائل للجاحظ) صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۹

۔ ابوالعلاء معری اس عہد کے بڑے بڑے نامور عجمیوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ سب زندیق تھے۔ مثلاً دعبل بشار بن برد ابونواس۔ ابومسلم خراسانی وغیرہ"

(الغفران دار المعارف مصر) (〃)

ناظرین مودودی صاحب کی وہ عبارت ملاحظہ فرمائیں جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں اور جس میں انہوں نے بڑے زور و شور کے ساتھ اس بات کی غلطی ظاہر کی ہے کہ چونکہ اسلامی تاریخیں بنو عباس کے دور میں لکھی گئی ہیں اس لئے بنو امیہ کے خلاف ان کی روایات قابل اعتماد نہیں ہیں۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ انہیں قابل اعتماد نہ سمجھا جائے۔ بلکہ ان کے معتمد و معتبر ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں بنو عباس کی مذمت بھی ہے۔ لیکن جب بنو عباس کی عداوت کا جوش ہوا تو مودودی صاحب نے اپنے پورے بیان کی تردید فرمادی اور اپنی دلیل کو خود موت کے گھاٹ اتار دیا۔

موصوف کی جو عبارتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایک گروہ ایسا تھا جو عربوں کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتا تھا، خواہ وہ صحابی ہوں یا اموی یا عباسی اسے کسی قبیلے اور خاندان سے محبت نہیں تھی۔ انہیں تو عربوں سے عداوت تھی اور ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ان کا شعار تھا۔ مودودی صاحب اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حکومت

کے سیکرٹری بھی ان کے معاون و مددگار تھے۔ پھر ان میں ایک تعداد ملحدوں اور زندیقوں کی بھی تھی، جو خود قرآن و حدیث اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بھی خلاف تھے۔ ان حالات میں تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں اور جن میں حدیث کے اصول سے کام نہیں لیا گیا بلکہ روایتیں سمیٹنے میں اتنی بے احتیاطی برتی گئی کہ مصنفین نے جن لوگوں کو خود کذاب اور غیر معتبر ٹھہرایا انہیں کی روایتوں سے اپنی کتابوں کا بڑا حصہ بھر دیا۔ ان پر کوئی صاحب عقل کیسے اعتبار کر سکتا ہے؟ اگر اس میں بنو عباس کی مذمت بھی ہے تو اس میں تعجب کیا ہے؟ رہ گیا صحابہ کرام کی مدح و ستائش یا بنو امیہ کے کارناموں کا بیان تو اس کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہ چیز ان کتابوں کے مستند علیہ ہونے کی کوئی ضمانت نہیں دیتی ہے۔

مودودی صاحب نے اس عہد کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ مجمل ہونے کے باوجود اس قدر مکروہ اور اعتماد سوز ہے کہ اس کے پیش کرنے کے بعد ان کا اپنی کتاب کے مآخذ پر اعتماد، اور اعتماد پر اصرار تعجب خیز ہے۔ یہی تصویر جو خود ان کے موئے قلم نے کھینچی ہے یہ احتمال بھی ظاہر کر دیتی ہے کہ اس زمانے کے ان مورخین کی کتابوں میں الحاق بھی کیا گیا ہو اور ان کی لاعلمی میں وہ جھوٹی اور موضوع روایتیں داخل کر دی گئی ہوں جنہیں بنیاد بنا کر آج مودودی صاحب صحابہ کرام، بنو امیہ و بنو عباس کو نشانۂ ملامت و ہدف طعن و تشنیع بنا رہے ہیں۔

مودودی صاحب نے قصداً اس فتنۂ عظیم کے بانیوں کو اپنی قلمی چادر میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس افترا پردازی اور بہتان طرازی کے شجرۂ خبیثہ کے لگانے والے اس کی آب یاری کرنے والے اور اس کے زہریلے پھلوں کو تقسیم کرنے والے شیعہ صاحبان تھے لیکن مودودی صاحب ان کے جرم کو چھپانے کے لئے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اگر کسی کا خیال یہ ہے کہ شیعوں کی سازش ایسی طاقتور تھی کہ ان کی کتابوں میں بھی

شیعی روایات نے داخل ہو کر اس دور کی ساری تصویر بگاڑ کر رکھ دی ہے
تو میں حیران ہوں کہ ان کی خلل اندازی سے آخر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرت
اور ان کے عہد کی تاریخ کیسے محفوظ رہ گئی " ۳۲۷ء

جناب والا! یہ ابومخنف، جابر جعفی، کلبی وامثالہم شیعہ نہ تھے تو اور کیا تھے؟ کیا ان کی اور ان کے جیسے شیعہ راویوں کی روایتوں سے اس دور کی تاریخی کتابیں بھری نہیں پڑی ہیں؟ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے کے باوجود ۔ اگر مگر "کے ساتھ ساتھ شیعوں کی سازش کا تذکرہ ان کے جرم کو ہلکا کرنے کی ناکام کوشش اور ان کے ساتھ ہمدردی کی نشانی نہیں ہے تو اور کیا ہے ۔ ؎

نہ ہم سمجھے ، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

حقیقت یہ ہے کہ شیعہ سازش تو ایسی زبردست اور طاقتور تھی کہ اگر فضل الٰہی شامل حال نہ ہوتا تو یہ لوگ دین ہی میں تحریف کر دیتے اور کم از کم ذخیرۂ حدیث کو تو بالکل مشکوک و مشتبہ بنا دیتے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ مراتب و درجات بلند فرمائیں حضرات محدثین کرام کے کہ ان کے سامنے ان کی دال نہیں گلی ، اور حفاظت حدیث کا انہوں نے ایسا انتظام و اہتمام فرمایا کہ اسے نقصان پہنچانے کی ہر شیعی کوشش بالکل ناکام ہو گئی اور سبائیوں کو سوا حسرت و نامرادی اور خیبتؔ و خسران کے کچھ حاصل نہ ہو سکا ۔

مودودی صاحب کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ پہنچا ہو گا کہ حفاظت حدیث کے بارے میں اولیت کا شرف بھی بہت سی دوسری دینی خدمتوں کی طرح بنو امیہ ہی کو حاصل ہوا اور صحابہ کے بعد سب سے پہلے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ ہی نے ادھر توجہ فرمائی جو اموی تھے ، اس دور کے سبائیوں کے دل پر اس ناکامی سے بھی سخت چوٹ لگی اور بنو امیہ

کے خلاف ان کے سینہ میں آتش بغض وعناد زیادہ بھڑک اٹھی، حدیث میں تو ان کا بس نہ چلا مگر اس ناکامی کی کسر انہوں نے تاریخ میں نکال لی اور صحابہ، بنو امیہ، نیز بنو عباس کے خلاف بھی روایتیں خوب خوب وضع کی گئیں اور کذب و دروغ کے ہر طرف اس طرح ڈھیر لگادئے گئے کہ ہمارے سنی مورخین بھی ان سے بچ کر نہ نکل سکے اور ان کی جھولی میں بھی ان کی خاصی تعداد گرد و باد کے ساتھ آکر بھر گئی۔

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مقدس سیرت اور ان کے عہد کی تاریخ کو بھی ان لوگوں نے تاریک بنانے کی کوشش کی جس شخص نے بھی کتب شیعہ کا مطالعہ کیا ہے وہ مودودی صاحب کی اس بات پر ہنسے گا۔ ان دونوں حضرات پر جھوٹے الزاموں اور بہتان و افترا میں شیعہ صاحبان نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے لیکن اہل سنت کی تاریخی کتابوں میں یہ روایتیں جو بار نہیں پاسکیں اس کے متعدد اسباب تھے۔

اول تو ان دونوں حضرات کی اعلیٰ سیرت اور ان کے بلند و مقدس کردار، ان کے عظیم دینی خدمات اور امت پر ان کے عظیم الشان احسانات نے ان کی شخصیتوں کو اس قدر تابندہ اور ان کے عہد کو اس قدر درخشاں بنا دیا تھا کہ سبائیوں کی اڑائی ہوئی خاک انہیں چھپانے یا ان کی روشنی کو کم کرنے سے بالکل قاصر رہی۔

ان دونوں حضرات کی کسی مسلمان سے جنگ نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اہل سنت میں کوئی فرد بھی ایسا نہ تھا جو ان کا مخالف ہو، بخلاف اس کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اعوان و انصار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے میدان حرب میں اور سیاسی محاذ پر مقابلہ کیا تھا۔ اہل سنت میں اس کی وجہ سے دو فریق ہو گئے تھے۔ ایک حضرت علی رضؓ کو حق پر سمجھتا تھا، دوسرا حضرت معاویہ رضؓ کو۔ ان دونوں حضرات کی وفات اور صحابہ کے اختتام کے بعد بھی یہ دونوں گروہ باقی رہے اور ان کا

اختلاف بدستور رہا۔ اگرچہ یہ دونوں فریق ان سب صحابۂ کرام کا احترام کرتے تھے اور حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ اور ان کے معاون دوسرے صحابۂ کرام کی عظمت بھی ان کے دلوں میں تھی لیکن سیاسی اختلاف کی بنا پر ان کے ذہنوں میں حضرت معاویہؓ اور ان کے معاون صحابہ کے خلاف بیانات برداشت کرنے کی صلاحیت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ ہوشیار اور موقع شناس سبائی اس نفسیاتی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت معاویہؓ و حضرت عمرو بن العاصؓ و امثالہم رضی اللہ عنہم کے خلاف جھوٹی روایتوں کو اہل سنت تسلیم کریں یا نہ کریں مگر ان کا سننا برداشت کریں گے بخلاف اس کے شیخینؓ کے خلاف کسی افترا پردازی کا سننا بھی گوارا نہ کریں گے۔ اس لئے وہ اس معاملہ میں احتیاط سے کام لیتے تھے اور اہل سنت کے سامنے ان دونوں حضرات کے خلاف زبان گستاخی سے احتراز کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہماری متداول کتب تاریخ کے مؤلفین نے حضرت معاویہؓ اور ان کے اعوان کے خلاف جھوٹی روایتیں انہیں غلط سمجھتے ہوئے بھی سمیٹ لیں۔ بخلاف اس کے شیخین کے متعلق اس قسم کی بہتان طرازیوں کو کتاب میں جگہ دینے سے بھی احتراز کیا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ حضرات شیخین کے ساتھ عقیدت سنی ہونے کی علامت قرار پا چکی تھی۔ ان کے خلاف کھلم کھلا پروپیگنڈا کرنے سے شیعوں کی نقاب تقیہ و نفاق پارہ پارہ ہو جاتی اور ان کا چہرہ نظر آ جاتا۔ اس کے بعد فریب دہی کا خاکہ خاک میں مل جاتا اس لئے وہ ان دونوں حضرات کے متعلق بہتان طرازی خاص خاص اشخاص اور خاص خاص مجالس تک محدود رکھتے تھے اور عام طور پر اہل سنت کے سامنے ان سے اظہار عقیدت کرتے تھے تاکہ اہل سنت کو فریب دے سکیں کہ وہ بھی سنی ہیں۔ مثلاً ابن ابی الحدید بہت کٹر اور متعصب شیعہ ہے لیکن عوام اور حکومت کے خوف، نیز اہل سنت کو دھوکہ دینے کے لئے شرح نہج البلاغہ میں حضرات

صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی شان میں صریح گستاخی سے احتراز کرتا ہے بلکہ حضرت عمرؓ کی جانب سے بظاہر مدافعت کرتا ہے[1]۔

مودودی صاحب نے بھی وہی طرز اختیار کیا ہے۔ انہوں نے بھی شیخین کے ساتھ اظہار عقیدت کر کے صحابہ کرام کے ایک بہت بڑے گروہ کو مجروح بنانے کی کوشش کی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کوئی سنی مصنف اپنی کتاب میں قدح شیخین کو کیسے جگہ دے سکتا تھا؟ تاہم مودودی صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ شیعی افترا پردازی سے حضرات شیخین اور ان کے عہد کی تاریخ بالکل محفوظ ہے۔ یہ کتابیں اس گندگی کا بیّن ثبوت ہیں لیکن اکثر اس کا طرز ایسا پُر فریب ہوتا ہے کہ عام ناظرین اسے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ راوی کی نیت پر بالکل شبہ نہیں کرتے اس کے بجائے ان میں جو لوگ ان حضرات کے ساتھ اس درجہ کی عقیدت نہیں رکھتے جس کے یہ مستحق ہیں۔ وہ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کی عقیدت اور بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق اسی روایت کو پیش کرتا ہوں جو مودودی صاحب نے حضرت عثمانؓ کے مطاعن میں پیش کی ہے۔ اس جھوٹی روایت میں جو کسی سبائی نے وضع کی ہے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا

---

[1] بعض شیعہ حضرات ناواقف سنیوں کو کتاب کے ایسے مقامات دکھا کر دھوکہ دیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابن ابی الحدید سنی تھا۔ بعض ناواقف سنی اس دھوکے میں آ بھی جاتے ہیں حالانکہ یہ محض فریب کاری ہے اول تو اس کا یہ طرز محض تقیہ پر مبنی ہے۔ دوسرے اس میں بھی اسے فریب کاری سے کام لیا ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کی جانب سے معترضین کے اعتراضات کو جواب دیتے ہوئے اعتراضات کو قوی کر کے بیان کرتا ہے اور جواب ضعیف کر دیتا ہے۔ بظاہر مدافعت کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت اعتراض کو مضبوط کرنا مقصود ہوتا ہے۔

نعوذ باللہ من شر ور النفاق والتقیہ ۱۲

تھا کہ حضرت عثمانؓ سریر آرائے خلافت ہو کر اقربا پروری سے کام لیں گے، اور اپنے خاندان والوں کو اعلیٰ مناصب پر مسلط کر دیں گے۔ بظاہر تو یہ روایت حضرت عثمانؓ کے خلاف ہے۔ لیکن غور کیجئے تو اس کے گڑھنے والے مفتری نے فاروق اعظمؓ کی پوزیشن بھی خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ کو اقربا پرور جانتے تھے تو انہوں نے اپنے بعد خلافت کے لئے ان کو نامزد کیوں کیا؟ خصوصاً جب دوسرے حضرات بھی موجود تھے جن کے نام بھی فاروق اعظمؓ نے ذکر کئے تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ کا نام بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ ایک نمونہ ہے سبائی فریب کاریوں کا۔ ایسی مثالیں کتب تاریخ میں نادر نہیں ہیں۔ جو لوگ ان کے دقیق مسائل کو نہیں سمجھتے ہیں وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں جیسی مودودی صاحب کر رہے ہیں۔

مودودی صاحب نے خود شعوبی تحریک کا تذکرہ کیا ہے جسے ہم ان کی کتاب سے اوپر نقل کر چکے ہیں اس کی وسعت وطاقت کا اعتراف خود مودودی صاحب نے کیا ہے۔ اس عجمی اور شعوبی تحریک کے سربراہ کون تھے؟ کیا یہ شیعہ نہ تھے؟ کیا علی الاعلان اہل عرب اور قریش کی مذمت کرنے والے شیعوں کے علاوہ اور دوسرے ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اکثر صحابہ تو عربی ہی تھے، اور ان میں قریش تو اور بھی نمایاں تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ انہیں شعوبی تحریک کے حاملین کے یہاں حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ کی مذمت کے بجائے مدح وستائش ملتی ہے، بلکہ انہیں میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان بزرگوں کے فضائل میں جھوٹی روایتیں بھی گھڑی ہیں۔ عداوت صحابہ اور ان کے درمیان تفریق بھی اگر شیعیت نہیں ہے تو میں حیران ہوں کہ شیعیت ورفض کس چیز کا نام ہے؟

ان سب کے اعتراف کے بعد مودودی صاحب کا شیعی سازش سے انکار بہت ہی حیرت انگیز جسارت ہے!

مودودی صاحب نے صحابہ کرام کے خلاف غلط اور موضوع روایتوں کا جو انبار لگا دیا ہے سند کے اعتبار سے ان پر تنقید کا دروازہ بند کرنے کے لیے موصوف نے مندرجہ بالا دلائل ذکر کئے ہیں، جن کی تردید تفصیل کے ساتھ ہم کر چکے ہیں۔ اور جن کی رکاکت الم نشرح ہو چکی ہے۔ لیکن موصوف کو خوف ہوا کہ تاریخ میں تو درایت کا معیار بھی مروج ہے اس لئے کہیں اس سے کام لے کر میری محنت پر پانی نہ پھیر دے اس طرح انہوں نے درایتی تنقید رد کرنے کے لئے بھی کچھ کمزور رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش فرمائی ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"بعض حضرات اس معاملہ میں یہ نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرام کے متعلق صرف وہی روایات قبول کریں گے جو ان کی شان کے مطابق ہوں اور ہر اس بات کو رد کر دیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو، خواہ وہ کسی صحیح حدیث میں وارد ہوئی ہو۔" (ص ۳۰۵)

مودودی صاحب نے نہایت چالاکی کے ساتھ صحیح مسلک اہل سنت کی غلط ترجمانی کی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جناب والا وہ بعض حضرات کون ہیں؟ جنہوں نے آپ کا مزعومہ قاعدہ کلیہ پیش کیا ہے؟ یہ غلط الزام لگا کر آپ نفسیاتی طریقہ سے مخاطب پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ آپ کی طرح صحابہ کرام کے خلاف کذابوں اور جعل سازوں کی روایتیں قبول نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی چھان بین کرتے ہیں اور روایت و درایت کی بھٹی میں انہیں تپا کر دیکھتے ہیں، وہ صحابہ کے ساتھ عقیدت میں غلو کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی بات کی طرف دھیان نہ دو۔ آپ کا یہ طرز عمل بہت افسوسناک اور قطعاً غیر علمی ہے۔ غلط بیانی کر کے قاری کے جذبات کو اس طرح ابھارنا کہ وہ صحیح وسقیم میں امتیاز کی کوشش نہ کر سکے ہرگز کسی علمی بحث کے شایان شان نہیں ہے۔

اچھا ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ بعض لوگ یہ قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں اور یہ قاعدہ غلط بھی ہے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ صحابۂ کرام کے خلاف ہر روایت کو قبول کر لیا جائے خواہ اس کا راوی کوئی شیعی یا کوئی دوسرا کذاب ہی کیوں نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کا بیان کردہ قاعدہ کلیہ کسی نے پیش کیا ہو یا نہ پیش کیا ہو، مگر خود انہوں نے عملی طور پر اپنی زیر نظر کتاب میں یہ کلیہ قائم کر لیا ہے کہ جو روایت مخصوص حضرات کو چھوڑ کر صحابۂ کرام کے خلاف ہو اور جس سے ان کی تنقیص نکلتی ہو اسے قبولیت کے لئے منتخب کر لیا جائے، خواہ اصول روایت و درایت کے لحاظ سے وہ کتنی ہی غلط اور لغو کیوں نہ ہو؟ مودودی صاحب کی اسی کتاب میں اس کی مثالیں متعدد ملتی ہیں، بطور نمونہ ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کے متعلق لسان المیزان میں پہلی روایت تو یہ لکھی ہے کہ واقعہ حرہ میں شہید ہوئے، دوسری روایت ابو مخنف کی ہے کہ ایک غار میں چھپے ہوئے تھے وہاں انہیں سانپ نے ڈس لیا اور حضرت معاویہؓ کے گورنر نے لاش کا سر کاٹ کر حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا۔ واقعہ پر بحث تو اپنے مقام پر آئے گی یہاں دکھانا یہ ہے کہ مودودی صاحب نے پہلی روایت کو چھوڑ کر اسی ابو مخنف کذاب کی موضوع اور جھوٹی روایت کو درج کتاب کیا ہے، حالانکہ وہ خود اپنی اسی کتاب میں اعتراف کر چکے ہیں کہ محققین فن رجال ابو مخنف کو کذاب اور شیعی کہتے ہیں لیکن بغض معاویہؓ نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور اسی کذاب کی روایت کو انہوں نے صرف اس لئے قبول کر لیا کہ اس سے خلیفۃ المسلمین امام معاویہؓ کی شان اقدس کی منقصت کا پہلو نکلتا تھا۔

مودودی صاحب! آپ نے جو "بعض حضرات کا قاعدہ کلیہ" بیان کیا ہے وہ تو محض آپ کا غلط الزام ہے لیکن بعض نہیں کل اہل سنت و الجماعت کا قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ

کسی صحابی کے متعلق کوئی ایسی روایت جو ان کے مرتبۂ عالی سے فروتر معلوم ہوتی ہو، صرف اسی وقت قبول کی جا سکتی ہے جب کہ وہ حدیث و خبر کے اصول روایت و درایت پر معیاری ثابت ہو۔ شیعی خارجی معتزلی وضاعوں اکذابوں کی روایتیں یا ابن اثیر ابن کثیر اور ان جیسے بے احتیاط مورخین کے لگائے ہوئے کوڑے کے ڈھیر ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اس لائق ہیں کہ انہیں نذر آتش کر کے ان کی راکھ کو بھی دریا برد کر دیا جائے تاکہ تاریخ اسلام کے پاکیزہ صفحات گندگی سے پاک ہو جائیں۔

یہ اصول خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ یہ آیت مقدسہ یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا الایۃ پہلے نقل ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ارشاد الٰہی ہے "ان بعض الظن اثم" بیشک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہی بدگمانی گناہ ہوگی جو دلیل شرعی پر مبنی نہ ہو اور ظاہر کے خلاف ہو، یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی روایت جب تک معیار پر پوری نہ اترے اس وقت تک وہ دلیل شرعی نہیں بن سکتی۔ اسی طرح جو روایت ظاہر حال کے خلاف ہو اسے اعلیٰ معیار پر پرکھا جائے گا اور اگر اس میں ذرا بھی سقم ہوگا تو درایت اسے رد کر دے گی اور وہ حجت شرعی نہ بن سکے گی۔ ایسی روایتیں جن سے کسی صحابی کی تنقیص ہوتی ہو اسی وقت قبول کی جا سکتی ہیں جب وہ محدثین کے اعلیٰ معیار نقد پر پوری اتریں اس لئے کہ وہ ظاہر کے خلاف ہیں۔ ان حضرات کی زندگی کی پاکیزگی تواتر سے ثابت ہے۔ پاکیزگی کے اس تسلسل میں کوئی خلا ثابت کرنے کے لئے اگر تواتر نہیں تو کم از کم امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ کے شرائط پر پوری اترنے والی خبر صحیح تو ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ان مقدس حضرات کی توثیق قرآن مجید اور احادیث نبویہ نے فرمائی ہے۔ اس توثیق عام سے تخصیص کسی حجت شرعیہ ہی کی بنا پر ہو سکتی ہے اور حجت بھی قوی ہونا چاہیئے۔ ضعیف حدیث بھی حجت نہیں بن سکتی چہ جائیکہ تاریخ کی

روایتیں جن کا درجہ ضعیف حدیث کے برابر بھی نہیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس مسئلہ میں روایات کی تنقید کا معیار احادیث اعمال کے معیار سے زیادہ بلند ہونا چاہیئے، اس لئے اس کا تعلق باب العقائد سے ہے اور عقیدہ کی اہمیت اعمال سے بدرجہا زائد ہے۔

جو اصول کتاب وسنت سے ثابت اور قیاس شرعی کے مطابق ہے اسے مودودی صاحب نے بالکل ہی الٹ کر رکھدیا۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے ظاہر حال اور کتاب وسنت کی توثیق کے خلاف صحابۂ کرام کے متعلق وضاعوں، کذابوں، دشمنان دین اور اعدائے صحابہ کی موضوع روایتیں بے دریغ قبول کی ہیں۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

جس اصول کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں وہ کتاب وسنت کے موافق اور قیاس شرعی کے مطابق ہونے کے ساتھ فطرت انسانی سے بھی مناسبت رکھتا ہے اگر کسی شخص کے متعلق کوئی ایسی خبر دی جائے جو اس کی ظاہری حالت سے مناسبت نہیں رکھتی ہے تو ہم اسے آسانی سے نہیں قبول کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص یہ خبر دے کہ فلاں شخص نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا۔ یا فلاں صالح شخص آج میخانے میں شراب پیتے ہوئے دیکھا گیا تو ہم ان خبروں کو بہت زیادہ چھان بین اور تحقیق وتفتیش کے بعد قبول کرتے ہیں اور جب تک اس کا بہت قوی ثبوت نہیں ہوتا ان پر یقین نہیں کرتے، بلکہ بسا اوقات راوی کی تصدیق کرنے کے بعد بھی اس کی تاویل وتوجیہ تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ باپ کا ارادہ قتل کا کیسے ہو سکتا ہے غالباً محض دھمکانے کے لئے اس نے بندوق کا رخ مقتول کی طرف کر دیا ہوگا غلطی سے بندوق چل گئی۔ علیٰ ہذا فلاں صاحب شراب کی دکان پر چولھا جلانے کے لئے اسپرٹ خریدنے گئے ہوں گے۔ راوی کو اشتباہ پینے کا ہو گیا وغیرہ۔ یہ مثالیں زیر بحث قاعدہ کلیہ کے فطری ہونے کی نشان دہی

کر رہی ہیں جسے جمہور اہلسنت والجماعت نے صحابہ کرام کے حق میں پیش نظر رکھا ہے مودودی صاحب و امثالہم نے اس بارے میں جو راستہ اختیار کیا ہے وہ خلاف شریعت ہونے کے ساتھ خلاف فطرت بھی ہے۔

اسی شرعی اور فطری قاعدہ کلیہ کو جس میں تحریف کر کے مودودی صاحب نے بھیانک صورت میں پیش فرمایا ہے اگر رد کر دیا جائے اور مودودی صاحب کے قاعدے سے خود ان کے متعلق کام لیا جائے تو نہ وہ خود اس پر راضی ہوں گے نہ ان کی جماعت کے افراد مثلاً کوئی شخص ان پر کوئی ایسا الزام لگا دے جو ان کی ظاہری حالت کے لحاظ سے بعید از قیاس ہو تو کیا وہ اس کی اجازت دیں گے کہ اس الزام کو بغیر تحقیق و تفتیش صحیح سمجھ لیا جائے اور اس کی اشاعت شروع کر دی جائے۔

فرض کیجئے کہ خبر ملتی ہے کہ مودودی صاحب بر سر راہ جام و سبو سے شغل فرما رہے تھے۔ تو کیا یہ معلوم کئے بغیر کہ اس کا راوی کون ہے؟ اور وہ کیسے ہیں؟ سند متصل ہے یا منقطع؟ اس خبر کو صحیح تسلیم کر لینا آپ کے نزدیک جائز ہوگا؟ بالکل فطری بات ہے کہ اس خبر کو معتقد تو معتقد ان کے شدید ترین مخالف بھی باور کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوں گے اس لئے کہ یہ ظاہری حالت کے بالکل خلاف ہونے کی وجہ سے بعید از قیاس ہے۔

کیا ستم ہے کہ خود اپنے متعلق جو قاعدہ تسلیم نہیں صحابہ کرام کے متعلق اسی قاعدے پر عمل کیا جائے۔ اور دوسروں کو تلقین ہے کہ اس پر عمل کرو۔ کیا غضب ہے کہ جو اصول اپنے لئے واجب العمل سمجھا جاتا ہے وہ صحابہ کرام کے حق میں ممنوع اور قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ اپنے اوپر یا اپنی جماعت پر کوئی الزام لگایا جائے تو صرف الزام لگانے والے ہی سے نہیں بلکہ اس کے ناقل سے بھی پختہ ثبوت اور قوی دلیل کا مطالبہ کیا جائے اور اگر وہ اسے پیش کرنے

فاسق ہے تو اسے مفتری کذاب کہا جاتے مگر صحابہ کرام کی عزت معاذ اللہ ایسی گری پڑی چیز ہے کہ مفتری و کاذب کا قول ان کی منقصت میں قبول کر لیا جاتے، اس کے لئے کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت محسوس نہ کی جائے اس پہلو کی طرف بالکل نہ دیکھا جائے کہ فعل منسوب ان کی شان سے کوئی مناسبت رکھتا ہے یا نہیں؟

مودودی صاحب اور ان کی جماعت لفظ اسلامی استعمال کر کے مختلف چیزوں کی تطہیر کے دعویدار ہیں، مثلاً اسلامی ادب، اسلامی شاعری وغیرہ۔ لیکن تعجب ہے کہ اسلامی تاریخ کے الفاظ استعمال کرتے وقت ان حضرات کے ذہن سے اس تطہیر کا تصور کیوں غائب ہو جاتا ہے کیا اسلام نے خبر اور روایت کے قبول کرنے کا (خواہ وہ ماضی کی خبر ہو یا در وجود کی) یہی اصول بیان فرمایا ہے کہ مخبر خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کی خبر قبول کر لو؟ کیا کسی ادنیٰ مسلمان کے متعلق بھی بدگمانی کرنا یا اس پر الزام لگا دینا بغیر دلیل شرعی کے جائز ہے؟ اگر نہیں تو آخر وہ تاریخ جماعت کے نزدیک اسلامی تاریخ کیسے ہو گئی؟ جس میں ان شرعی حدود کو نظر انداز کر دیا گیا ہے؟۔

جن کتابوں کو مودودی صاحب نے روایات کے باب میں اپنی کتاب کا ماخذ بنایا ہے ان کی بہت سی روایتوں پر بعض اکابر علماء نے اپنی کتابوں میں تنقید و رد بھی فرمایا ہے، مثلاً شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے تحفہ اثنا عشریہ میں یا علامہ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں جو شخص واقعات کی تحقیق کرنا چاہتا ہو اور علمی انداز میں تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو اس کے لئے لازم ہے کہ اس رد و تنقید کو بھی پیش نظر رکھے، اور ناقل و ناقد کے اقوال کے درمیان مدلل موازنہ و محاکمہ کرے۔ لیکن مودودی صاحب نے ایک نرالا قاعدہ وضع فرما کر اس قسم کی سب کتابوں کو ناقابل اعتناء بنانے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں:۔

"........ ماخذ کی اس بحث کو ختم کرکے آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے قاضی ابوبکر ابن العربی کی العواصم من القواصم امام ابن تیمیہؒ کی منہاج السنۃ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی تحفۂ اثنا عشریہ پر انحصار کیوں نہ کیا ..... ان تینوں حضرات نے دراصل اپنی کتابیں تاریخ کی حیثیت سے بیان واقعات کے لئے نہیں لکھی ہیں بلکہ شیعوں کے شدید الزامات اور ان کے افراط و تفریط کے رد میں لکھی ہیں جس کی وجہ سے عملاً ان کی حیثیت وکیل صفائی کی سی ہو گئی ہے۔ اور وکالت خواہ الزام کی ہو۔ یا صفائی کی ہو اس کی عین فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں آدمی اسی مواد کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے اس کا مقدمہ مضبوط ہوتا ہو۔ اور اس مواد کو نظر انداز کر دیتا ہے جس سے اس کا مقدمہ کمزور ہوتا ہو" ص۳۲۰

گویا اصول عدالت یہ ٹھہرا کہ ملزم کا وکیل اس کی صفائی میں لاکھ بحث کرے اور کتنے ہی وزنی دلائل کیوں نہ پیش کرے مگر اس کے بیان کو ہمیشہ مشکوک و مشتبہ سمجھنا چاہئے اور عدالتوں کو ہمیشہ مستغیث کے بیان کو وزن دیکر فیصلہ کرنا چاہئے۔ شیعہ صاحبان کو مبارک ہو مولانا نے ان کی ایسی اعانت کی ہے اور ان پر اتنا بڑا احسان فرمایا ہے جسے انہیں کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔ اب اس قسم کی کتابوں کے بارے میں انہیں کسی پریشانی میں نہ پڑنا چاہئے۔ مودودی صاحب نے ان سب کو وکالت صفائی قرار دے کر ناقابل اعتماد قرار دے دیا ہے یہی بات کہکر وہ بھی چھٹکارا پا سکتے ہیں۔

مولانا نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ لفظ "انحصار" کا استعمال فرمایا ہے۔ تاکہ کہہ سکیں کہ مجھے ان کتابوں پر انحصار سے انکار ہے نہ کہ ان کی طرف رجوع کرنے سے۔ لیکن ان کا

اصل مقصد ان کتابوں اور ان کے مصنفین کو ناقابل اعتماد ٹھہرانا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کتاب کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے انصاف اور تحقیق سے کام نہیں لیا ہے بلکہ صرف وہ مواد جمع کر دیا ہے جو اس کے مطلب کے موافق تھا اور اس مواد کو نظر انداز کر دیا ہے جو اس کے خلاف پڑتا ہے اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے اسے بھی سامنے لانا ضروری تھا تو اس پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا ہے ، بلکہ یقیناً اس کی ہر بات شک و شبہ کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

مولانا کی اس تحقیق نے شیعیت کی راہ سے کتنی بڑی رکاوٹ دور کر دی اس کا اندازہ ہر سمجھدار آدمی کر سکتا ہے۔ کوئی ناواقف سنی اگر شیعیت کے زہر سے متاثر ہو گیا ہو تو یہ کتابیں اس کے لئے تریاق ہیں لیکن مولانا نے انہیں وکیل صفائی کی یک طرفہ بحث قرار دے کر ہدایت کا یہ دروازہ بند کر دیا۔ شیعیت پر مودودی صاحب کا یہ احسان بالائے احسان ہے اس کے بعد انحصار کا باریک پردہ خود بخود پرزے پرزے ہو جاتا ہے ، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا ان کتابوں کو لائق التفات نہیں سمجھتے۔ چنانچہ عملاً بھی انہوں نے اس کا ثبوت دیا ہے یعنی اپنی کتاب میں انہوں نے شیعوں کے اعتراضات تو دہرا دیئے ہیں مگر ان کتابوں میں جو ان کے مدلل جوابات مذکور ہیں انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

کتابوں کا جائزہ

مولانا مودودی صاحب کی زیر تبصرہ کتاب کے مآخذ پر ہم ایک اصولی تبصرہ کر چکے ہیں۔ درحقیقت مولانا کے تعمیر کردہ قصر کو بالکل مسمار کر دینے کے لئے وہی کافی ہے لیکن سطور ذیل میں ہم ان کتابوں کا بھی ایک اجمالی جائزہ لینا چاہتے ہیں جنہیں مودودی صاحب نے تاریخ اسلام کی مستند ترین کتابیں قرار دیا ہے۔ مولانا اپنی کتاب کے مآخذ کے متعلق تحریر

فرماتے ہیں :۔

"درا صل یہ دو قسم کے ماخذ ہیں ۔ ایک وہ جن سے ہم نے کہیں کہیں ضمناً کوئی واقعہ لیا ہے یعنی ابن ابی الحدید ابن قتیبہ اور المسعودی ۔ دوسرے وہ جن کی روایات پر میں نے اپنی بحث کا زیادہ تر مدار رکھا ہے ۔ یعنی ابن سعد ، ابن عبد البر (استیعاب) ابن الاثیر ۔ ابن جریر طبری اور ابن کثیر"

(صفحہ ۳۰۸ و ۳۰۹)

بظاہر یہ کتابیں بہت سی ہیں اور اگر کسی روایت کے لئے ان سب کو یا ان میں سے بعض کا حوالہ دے دیا جائے تو ناواقف قاری کو طبعاً یہی غلط فہمی ہوگی کہ اس واقعہ کی صحت پر متعدد مورخین کا اتفاق ہے اور کئی محققین تاریخ نے اس کی صحت کی جانچ کرکے اسے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے بہت سے مقامات پر مودودی صاحب نے کسی ایک واقعہ کے متعدد حوالے دے کر شاید قاری کی ناواقفیت سے یہی فائدہ اٹھانا چاہا ہے اور اس پر یہی اثر ڈالنا چاہا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دراصل اس کثرت میں وحدت کا رفرما ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اسلام میں آج کل کی اصطلاحی تاریخ کی ابتداء فن سیر و مغازی سے ہوئی ۔ اگرچہ محدثین کرام اس بارے میں بھی اصحاب سیر و مغازی سے سبقت لے جا چکے تھے[۱] اور انہوں نے عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین کے بکثرت واقعات نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ کر دیئے تھے ۔ علیٰ ہذا رجال کے متعلق بھی انہوں نے بہت قیمتی سرمایہ جمع کر لیا تھا لیکن اول تو انہوں نے اس

---

[۱] مشہور محدث امام زہری کی تالیف اس سلسلے میں بہت اہم ہے جو انہوں نے سیر و مغازی پر محدثانہ طرز سے لکھی تھی ۔ مگر افسوس ہے کہ وہ نایاب ہو گئی ۔ اور اب اگر اس کا کوئی نسخہ کہیں دستیاب بھی ہو جائے تو قابل اعتماد اور تحریف و الحاق کے احتمال سے محفوظ نہ ہوگی ۔

تدوین میں واقعات کی تاریخی ترتیب کی کوئی خاص رعایت نہیں فرمائی۔ دوسرے ان کا اصل مقصد احکام شرعیہ کی حفاظت و تدوین تھا اس لئے اصحاب سیر ومغازی یا مورخین کا ایک مخصوص طبقہ پیدا ہوگیا۔ جو محدثین سے علیحدہ اور ممتاز تھا۔

اس طبقہ کی امتیازی خصوصیتیں دو تھیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اپنی تگ و دو کو حرب و ضرب اور سیاست کے متعلق روایات تک محدود رکھا۔ دوسری قسم کی روایتوں سے صرف نظر کی۔ اگر کہیں دوسری قسم کی روایتیں ذکر بھی کرتے ہیں تو ان کی حیثیت محض ضمنی ہوتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اخذ روایات میں محدثین کی طرح احتیاط اور حزم سے کام نہیں لیا۔ صحت و سقم سے بالکل صرف نظر کرکے ہر قسم کی روایتیں جمع کردیں۔ فن رجال درحقیقت ان کا فن تھا ہی نہیں۔ محدثین کرام نے اس علم میں جو عظیم الشان ذخیرہ جمع کردیا تھا اس سے بھی ان لوگوں نے صحیح معنی میں کوئی استفادہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اصحاب سیر کو اہل علم کے نزدیک اس عظمت و وقعت کی عشر عشیر عظمت و وقعت بھی حاصل نہیں ہوسکی جو حضرات محدثین کو حاصل ہے۔ اور حدیث کی کتابوں کو جو استناد و اعتماد حاصل ہے، وہ کتب سیر و مغازی کو کبھی حاصل نہ ہوسکا۔

ان کتب سیر و مغازی یا بالفاظ دیگر تاریخ اسلام کی قدیم کتابوں کا کیا حال ہے؟ اور استناد و اعتبار میں ان کا کیا درجہ ہے اس کے بارے میں حافظ زین الدین عراقیؒ (استاد علامہ ابن حجرؒ) فرماتے ہیں:

لیعلم الطالب ان السیرا

یجمع ماصح وما قد انکرا

(مقدمہ سیرۃ النبیؐ علامہ شبلیؒ)

یعنی سیرت کی کتابوں میں صحیح و منکر ہر قسم کی روایتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

سیر، مغازی یا تاریخ اسلام کی اولین کتابوں پر یہ ایک مجمل تبصرہ ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ اولین کتابیں ہیں کون؟ اور ان کا بعد کی تالیفات سے کیا ربط ہے؟ مشہور مورخ اور سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی مقدمہ سیرت النبیؐ میں فرماتے ہیں:۔

"سیرت پر اگرچہ آج بھی سیکڑوں تصنیفیں موجود ہیں۔ لیکن سب کا سلسلہ جاکر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے ـــــ سیرۃ ابن اسحاق، واقدی ابن سعد، طبری" (مقدمہ سیرت النبیؐ)

یہ ایک مشہور مورخ کی رائے ہے لیکن اگر اس میں کسی کو کلام ہو تو وہ بعد کی کتابیں دیکھ کر اپنا شبہ دور کر سکتا ہے۔

ابن جریر طبری کا سنہ وفات ۳۱۰ھ ہے اور ان سے پہلے تاریخ کے عنوان سے اس طرز پر کسی تالیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تھا تو وہ مفقود ہو گیا۔

اس موضوع پر یہی جامع اور قدیم ترین تالیف ہے اور مابعد کی جتنی کتابیں تاریخ اسلام پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں تیسری صدی ہجری تک کے واقعات اسی کتاب سے یا اول الذکر تینوں میں سے کسی کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ابن خلدون وغیرہ جس کتاب کو بھی آپ دیکھیں گے تیسری صدی تک کے متعلق جو مواد ان میں ملے گا اس کا سرچشمہ انہیں میں سے کسی میں پائیں گے اور زیادہ تر طبری کو اس کا ماخذ پائیں گے۔ طبری کا تذکرہ کرتے ہوئے خود مودودی صاحب ابن کثیر اور ابن خلدون کا قول نقل فرماتے ہیں:

"ابن کثیر بھی اس دور کی تاریخ میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شیعیؔ

ؔ علامہ ابن کثیر کا یہ کہنا بس دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان کی کتاب میں کثیر تعداد شیعی روایات کی ہے

روایات سے بچتے ہوئے زیادہ تر ابن جریر طبری پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ میں نے واقعات کا ملخص دوسرے مورخین کو چھوڑ کر طبری کی تاریخ سے نکالا ہے کیونکہ وہ زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اور ان خرابیوں سے پاک ہے جو ابن قتیبہ اور دوسرے مورخین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔

ابن خلدون کے الفاظ یہ ہیں :-

اعتمدناه بالموثوق به السلامة من الاهواء الموجودة فی کتب ابن قتیبة وغیره من المورخین۔ ص۳۱۳

مشہور مورخ علامہ شبلی نعمانی مرحوم طبری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

تمام مستند ومفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون ابو الفداء وغیرہ انہیں کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں یہ کتاب بھی نایاب تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی (مقدمہ سیرۃ النبی)

محمد بن جریر طبری کون ہیں؟ اور ان کی کتاب کا کیا درجہ ہے؟ ملاحظہ فرمائیے :

" محمد بن جریر بن یزید الطبری مات سنة عشر وثلاث مائة ثقة صادق فیه تشیع یسیر له وموالاة لا تضر "

محمد بن جریر بن یزید طبری جن کی وفات سن ۳۱۰ھ میں ہوئی ثقہ اور صادق ہیں ان میں تھوڑی سی شیعیت اور موالاۃ ہے جو مضر نہیں ہے :

(لسان المیزان جلد ۵ ص۱)

شیعہ مذہب کی ابتدا ایک خفیہ تحریک کے طرز پر ہوئی اور صدیوں تک اس کی یہی کیفیت رہی تقیہ اور کتمان اس کا اہم اصول رہا اس لئے اس زمانہ کے علماء اس مذہب کی حقیقت اور اس

کی گہرائیوں سے ناواقف تھے۔ جیسے کہ آج بھی علمائے اہل سنت میں بہت کم ایسے حضرات ہیں جو اس مذہب سے پورے طور پر واقف ہوں۔ ان بزرگوں کو کیا خبر تھی کہ جس کو وہ "تشیع یسیرا" (تھوڑی سی شیعیت) سمجھ رہے ہیں وہ کس قدر خطرناک اور مضرت رساں ہے۔ "لا تضر" کا فقرہ طبری کی توثیق نہیں کرتا ہے بلکہ شیعہ مذہب سے مصنف کی ناواقفیت کی نشاندہی کر رہا ہے۔ جو شخص غور کے ساتھ طبری کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا وہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس شیعہ مصنف نے اس کتاب میں کیسا زہر بھرا ہے؟ اور اسے شیریں بنا کر کس طرح اہل سنت کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی ہے؟

"موالاۃ" کا لفظ بھی قابل غور اور تشریح طلب ہے۔ اس کے لغوی معنی تعلق اور دوستی کے ہیں لیکن یہ مذہب شیعہ کی ایک اصطلاح بھی ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی حضرت علی مرتضیٰ وغیرہ ان چار شخصیتوں کے ساتھ خصوصی عقیدت کے ہیں جنہیں شیعہ صاحبان اہلبیت کہتے ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ عقیدت تو اہلسنت بھی رکھتے ہیں لیکن شیعی "موالاۃ" اتنی عقیدت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ عقیدت ہے جو اہل سنت کے نزدیک غلط سمجھی جاتی ہے لفظ تشیع اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں ابن جریر کے متعلق یہ لفظ اسی شیعی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جو ہمارے نزدیک غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ شیعیت اور اصطلاحی اہلبیت کے ساتھ عقیدت میں غلو کی موجودگی کے بعد بھی یہ کہنا کہ یہ مضر نہیں ہے اور ایسے شخص کی تاریخ کو معتبر سمجھنا کسی منصف مزاج کے نزدیک صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔

مشہور محدث حافظ احمد بن علی السلیمانی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ لیکن علامہ ذہبی نے اس کی تردید کی ہے اور سلیمانی کے علم و فضل کا اعتراف کر کے یہ کہا ہے کہ سلیمانی نے ان ابن جریر کو نہیں مراد لیا ہے بلکہ محمد بن جریر بن رستم

کے متعلق یہ بات کہی ہے، جو شیعہ تھا مگر اس تردید کی بنیاد اور دلیل ابن جریر بن یزید کے ساتھ حسن ظن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ حافظ سلیمانی (جن کے علم و تقویٰ کا اعتراف علامہ ذہبی کو بھی ہے) نے اگر یہ الزام ابن جریر بن رستم پر لگایا تھا تو اس کے دادا کے نام کی تصریح کیوں نہ کر دی؟ تاکہ تشابہ نہ باقی رہتا اور اگر وہ اس سے واقف ہی نہ تھے تو انہوں نے اس کے متعلق یہ بات کہی کیسے؟ واقفیت کے باوجود امتیاز قائم نہ کرنا تو اس بات کی واضح علامت ہے کہ ان کی مراد بھی محمد بن جریر بن یزید صاحب تاریخ و تفسیر ہی ہیں، اس لئے کہ ان کی شخصیت معروف و مشہور تھی، ابن جریر بن رستم اتنا مشہور نہیں تھا اور ایسی صورت میں وہی شخصیت عموماً مراد ہوا کرتی ہے جو زیادہ مشہور و معروف ہو۔ تعجب ہے کہ اس قوی قرینہ کے ہوتے ہوئے علامہ ذہبی نے سلیمانی کے قول کا ایک ایسا محل تلاش کیا جس کی دلیل ابن جریر کے ساتھ بیجا حسن ظن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

لسان المیزان میں انہیں محمد بن جریر طبری کے متعلق ابن حبان کا یہ قول بھی منقول ہے۔

قال ابو جعفر الطبری امام من ائمة الامامیة

ابو جعفر طبری نے جو امامیہ (اہل تشیع) کے امام ہیں (یہ بات کہی)

علامہ ذہبی نے اس کی بھی تردید فرمائی ہے مگر تردید بے دلیل ہے اور اس کی بنیاد بھی طبری کے ساتھ وہی حسن ظن ہے۔ علامہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابن حبان نے سلیمانی کے قول سے دھوکا کھایا ہے مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے اس لئے کہ سلیمانی ان پر وضع حدیث کا الزام لگا رہے ہیں اور ابن حبان ان کے متعلق بالکل دوسری بات کہہ رہے ہیں یعنی انہیں شیعوں کا مقتدا کہہ رہے ہیں۔ دونوں باتوں کا فرق ظاہر ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ابن حبان سلیمانی کے قول کی بنا پر

انہیں شیعہ کہہ رہے ہیں ؟ دونوں الزام ایک تو نہیں ہیں، بلکہ غور کیجئے تو دونوں میں ایک طرح کا تعارض ہے شیعوں کے لئے وضع احادیث تو وہ شخص کرے گا جو اپنی شیعیت کو چھپائے اور سنی بن کر وضع احادیث کرے تاکہ شیعہ ان کے ذریعہ سنی مسلمانوں کو الزام دے سکیں۔ بخلاف اس کے شیعوں کا امام اور مقتدا وہی شخص بن سکتا ہے جو اپنی شیعیت کا اظہار کرے، دونوں باتوں کے جمع ہونے کا عقلی و منطقی امکان تسلیم کرنے کے بعد بھی علامہ ذہبی کا مندرجہ بالا خیال بعید از قیاس ہی رہتا ہے اور عادتاً مذکورہ بالا دونوں باتیں جمع نہیں ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ علامہ ابن حبان کی رائے تو اپنے معلومات پر مبنی ہے۔ ان کی ذاتی رائے ہے اور علامہ سلیمانی کی تقلید نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً جب یہ تقیہ کے پردے میں اپنا رفض چھپائے ہوتے ہوں گے اس وقت کا حال سلیمانی نے تحریر کیا ہے پھر یہ پردہ چاک ہو گیا ہوگا اور وہ کھل کر میدان میں آگئے ہوں گے۔ ابن حبان نے اسی وقت کی کیفیت بیان کی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مورخ ابن جریر طبری میں شیعیت ہونا تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، یہاں تک کہ ان کے حامی علامہ ذہبی بھی ان کے تشیع کے قائل ہیں۔ وہ انکار ان کے وضاع ہونے سے کرتے ہیں نہ کہ ان کے تشیع سے۔

اس کے علاوہ ان کے اوپر دو الزام اور ہیں، ایک تو یہ کہ وہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے گویا شیعہ ہونے کے ساتھ وضاع بھی تھے۔ دوسرے یہ کہ خود شیعہ ہی نہ تھے۔ بلکہ شیعوں کے پیشوا بھی تھے۔ گویا غالی قسم کے شیعہ تھے۔ ان دونوں الزاموں کی صحت کے بارے میں ہم نے جو بحث کی ہے اس سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ ان دونوں الزاموں کی صحت کا احتمال قوی ہے یہ چیز کم از کم ان کی پوزیشن کو ان دونوں الزاموں کے اعتبار سے بھی مشکوک و مشتبہ ضرور بنا دیتی ہے اپنی شیعیت کے ساتھ وضاع اور غالی ہونے کا احتمال ان کی کتاب اور ان کی شخصیت کو کس قدر

بے وزن اور ناقابل اعتماد بنا دیتا ہے اور قاری کو ان کی روایات کے بارے میں کس درجہ احتیاط کی تلقین و تاکید کرتا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ تاریخ کا بیان ہے کہ ان کی شیعیت پر سے تقیہ کا ملمع ان کی حیات ہی میں اتر گیا تھا۔ علما حنابلہ ان سے واقف ہو گئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں مدفون نہیں ہونے دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ دنسبوہ الی الرفض انہیں رافضی کہا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۱ صفحہ ۱۴۶)

ایک واضح نشانی اس سلسلہ میں یہ بھی ملتی ہے کہ انہوں نے سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق معاذ اللہ لعنۃ اللہ علیہ لکھا ہے[1] پھر لکھتے ہیں:۔

"بعض فقہی مسائل اور حدیث غدیر خم کے معاملہ میں شیعہ مسلک سے اتفاق کی بنا پر بعض لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں شیعہ قرار دے ڈالا" ص ۲۱۳

محترما! آپ کو خبر نہیں کہ آپ نے خود بھی انہیں شیعیت کی سند عطا فرما دی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کے منکر بھی نہیں ہے

کوئی مذہب واعظ کیا جانے تسبیح بھی ہے زنار بھی ہے
اس طرز سخن سے کیا سمجھے اقرار بھی ہے انکار بھی ہے

حدیث غدیر خم کی شیعی تشریح ۔ شیعہ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ قطعی طور پر زمرہ اہل سنت سے خارج ہے اور فرقہ شیعہ میں داخل ہے۔ اس مجمل کی شرح درج ذیل ہے۔

---

[1] (دیکھئے طبری جلد ۱۳ بعنوان "الذیل المذیل من تاریخ الصحابہ والتابعین" ذکر من مات او قتل سنہ ۶۰ تذکرہ وفات حضرت جعفر رض)

ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک سفر میں مقام غدیر خم پر پہنچکر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ (ترجمہ) میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولی ہیں۔ یہ روایت بعض کتب اہلسنت میں بھی موجود ہے مگر نقاد حدیث کے نزدیک ثابت نہیں ہے اگر ثابت تسلیم کی جائے تو اس کا مفہوم اہلسنت کے نزدیک یہ ہے کہ میں جس کا دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں بخلاف اس کے شیعہ اسے انکی خلافت وامامت پر نص قطعی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولی بمعنی اولی بالتصرف ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صراحتہ فرمادیا ہے کہ میرے بعد علیؓ میرے خلیفہ اور امام المسلمین ہوں گے یہی وہ باطل عقیدہ ہے جو پورے شیعہ مذہب کی بنیاد ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا حضرات خلفائے ثلاثہ کو معاذ اللہ غاصب سمجھے گا اور ان کی خلافت کو حضرت علیؓ کے حق میں ظلم اور ان کی حق تلفی خیال کرے گا۔ یہ ہے حدیث غدیر خم کا معاملہ اور شیعہ مسلک جس میں حسب اعتراف مودودی صاحب طبری شیعوں سے متفق تھے، یعنی وہ بھی حضرت علی کی خلافت کو منصوص سمجھتے تھے اور انہیں آنحضور کا ولیعہد اور بلحاظ استحقاق "خلیفہ بلا فصل" سمجھتے تھے۔ میں متحیر ہوں کہ اس کے بعد بھی ان کی شیعیت سے انکار کی جرات کس طرح ہوتی ہے؟

شیعوں کا بنیادی عقیدہ رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص سنی ہو سکتا تو اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ تثلیث کا قائل ہونے کے باوجود آدمی مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔

ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ طبری کو علمائے حنابلہ نے صرف اس وجہ سے شیعہ کہدیا کہ وہ امام احمد بن حنبل کو فقیہہ نہیں تسلیم کرتے تھے۔ ان علماء کے ساتھ یہ سوء ظن آخر کس دلیل پر مبنی ہے؟ پھر یہ کہ اس سبب مخالفت سے رفض کے الزام کو کیا مناسبت ہے؟ اگر غلط ہی الزام انہیں لگانا تھا تو خارجی کیوں نہ کہدیا؟ دوسرے علماء نے اس کی تردید کیوں

نہ کی؟ ابن جریر تو ایک مشہور صاحب علم شخص تھے۔ اجتہاد بھی کرتے تھے اگر وہ سنی تھے تو سنیوں کے ایک طبقہ پر ان کا اثر ضرور ہوگا اور علمائے اہل سنت میں کچھ نہ کچھ لوگ ان کے ضرور معتقد ہوں گے۔ کیا وجہ ہے کہ علماء و عوام نے علمائے حنابلہ کی ادنیٰ مخالفت و مقاومت بھی نہیں کی اور انہیں مقابر مسلمین میں مدفون کرنے پر انہوں نے ذرا سا بھی اصرار نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنابلہ کا الزام صحیح تھا اور طبری مذکور واقعی رافضی تھے۔ ان کا مزید قرینہ یہ ہے کہ طبریہ اس وقت شیعیت کا ایک مرکز تھا۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ امام بخاری، امام مسلم امام ترمذی، امام نسائی، امام ابو داؤد کا زمانہ اور طبری کا زمانہ ایک ہے لیکن ان حضرات نے ان سے کوئی حدیث نہیں لی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔

مودودی صاحب نے ان کی تفسیر کے متعلق علامہ ابن تیمیہؒ کی جو رائے نقل کی ہے اس کا مفہوم سمجھنے میں مولانا سے غلطی ہوتی ہے۔ امام ابن تیمیہ ان کی تفسیر کو معتزلہ وغیرہ کی عقلی تفاسیر پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ ان کی تفسیر بالروایت ہے اور اس میں معتزلہ و باطنیہ وغیرہ کی دور از کار تاویلات سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ یہی ان کے فقرہ "لیس فیہ بدعۃ" کے معنی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس میں جو روایتیں آتی ہیں وہ سب کی سب صحیح یا قابل قبول ہیں جس شخص نے بھی تفسیر طبری کا مطالعہ کیا ہے ہرگز ایسی خوش اعتمادی کا اظہار نہیں کر سکتا چہ جائیکہ علامہ ابن تیمیہ کا ایسا محقق؟

امام موصوف کی اس رائے سے نہ طبری کی کوئی توثیق ہوتی ہے، نہ ان کی تاریخ کی توثیق اگر ہوتی ہے تو ان کی تفسیر کی اور وہ بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ ایک خاص حیثیت سے جس کا ذکر امام نے اس طرح کیا ہے اما التفاسیر التی بایدی الناس فاصحہا تفسیر محمد

بن جریر الطبری فانه لیس فیہ بدعۃ و ہو ینقل مقالات السلف بالاسانید الثابتہ یعنی مروجہ تفاسیر میں (سب تفسیروں میں نہیں) تفسیر طبری سب سے زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ وہ مفسرین سلف کے اقوال صحیح سندوں سے نقل کرتے ہیں، کشاف کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں بدعت ہے، یعنی انکار صفات وغیرہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے بدعت کے معنی بدعت اعتزال کے لئے ہیں نہ کہ ہر قسم کی بدعت کے۔

طبری کی شخصیت کو چھوڑ کر ذرا ان کی کتاب پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ اس سلسلہ میں پہلے مشہور مؤرخ و سیرت نگار علامہ شبلی مرحوم کی رائے ملاحظہ فرمائیے جن کی حیثیت بقول مودودی صاحب "وکیل صفائی" کی نہیں تھی۔

فرماتے ہیں :-

"طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ الابرش، ابن سلمہ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں" (مقدمہ سیرت النبیؐ)

علامہ نے وغیرہ لکھ کر بات مختصر کر دی ورنہ یہ فہرست خاصی طویل ہے اس میں ابو مخنف، کلبی جابر جعفی سیف بن عمر وغیرہ کے ایسے کذاب اور وضاع اور شیعہ رواۃ بڑی کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بازاری قصوں کو بھی اس کتاب میں خاصی جگہ دی گئی ہے جس شخص کا جی چاہے کتاب دیکھ کر سامنے اس تبصرے کی تصدیق کر لے[1]۔

[1] یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مذہب اہل سنت والجماعت کی اساس و بنیاد کتاب و سنت پر قائم ہے بخلاف اس کے شیعہ مذہب کی حقیقی بنیاد تاریخ پر قائم کی گئی ہے نہ کہ کتاب و سنت پر۔ سنت کا تو ان کے یہاں تصور ہی دوسرا ہے، رہ گئی کتاب تو اس سے انہوں نے درحقیقت صرف اپنی بیان کردہ تاریخ کی تائید کا کام لینے کی کوشش کی ہے۔ فی الحقیقت اسے دین کی اساس نہیں بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید اپنی تفسیر و تشریح میں تاریخی روایات کا محتاج ہے جنہیں انہوں نے مذہبی روایات کی حیثیت دے دی ہے ابن جریر طبری کے زمانہ تک شیعہ مذہب کی تدوین نہیں ہوئی تھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

رہا یہ امر کہ اس میں صحیح روایتیں بھی موجود ہیں اس سے کتاب کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم اس کے دعویدار نہیں ہیں کہ تاریخ طبری از سر تا پا کذب و دروغ ہے بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جھوٹ اور سچ کا مجموعہ ہے اس لئے اس کی وہی روایت قابل قبول ہوگی جو اصول و معیار کے مطابق ہو۔ مجموعی طور پر کتاب قابل اعتماد اور قابل قبول نہیں ہوگی۔

مودودی صاحب خود اقرار کر چکے ہیں کہ ابن کثیر اور ابن خلدون کا مدار طبری پر ہے علامہ شبلی کی صراحت سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ مابعد کی سب تاریخیں ابن الاثیر، ابوالفداء وغیرہ کا اصلی سرچشمہ یہی کتاب ہے بلکہ بقول علامہ یہ سب کتابیں طبری ہی کی تلخیصات کہی جا سکتی ہیں، اسے ناقابل اعتماد قرار دینے کے بعد، بعد کی کتابیں منطقی طور پر غیر معتبر ہو جاتی ہیں۔

مودودی صاحب نے طبری کی توثیق میں متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تشیع کے ثبوت کے بعد یہ سب توثیقات بے وزن ہو جاتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ توثیق کرنے والے حضرات شیعہ مذہب اور خود طبری سے پورے طور پر واقف نہ تھے؛ یہ ناواقفیت بالکل تعجب خیز نہیں، شیعہ حضرات کے تقیہ اور کتمان کی ایسی مثالیں بکثرت ہیں بطور

(ص ۹۹ کا باقی حاشیہ) انہوں نے وہ مواد فراہم کیا جس نے اس مذہب کی عمارت باقاعدہ تعمیر کر دی تھی۔ نہج البلاغہ جو مذہب شیعہ کی معتبر ترین اور بنیادی کتاب ہے ملاحظہ کیجئے اس کا بہت بڑا حصہ انہیں خطبات و روایات پر مشتمل ہے جو طبری نے اپنی تاریخ میں فراہم کئے ہیں اس طرح اس ناصح شخص نے شیعہ مذہب کی سب سے اہم اور اساسی خدمت انجام دی ہے، اور درحقیقت کتاب لکھنے سے ان کا مقصد یہی تھا لیکن افسوس کہ اہل سنت نے ان کے تقیہ سے دھوکا کھایا اور ان کی کتاب کو تاریخ کی حیثیت دی۔ حالانکہ وہ فن تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ شیعہ مذہب کی ایک بنیادی کتاب ہے۔

مثال مشہور شیعی مجتہد قاضی نور اللہ شوستری کو پیش کیا جا سکتا ہے جو برابر تقیہ یہی کر مدت دراز تک ہندوستان کے منصب قضا پر مامور رہے، بالآخر راز کھلا۔

محمد بن اسحاق صاحب مغازی و سیر کی شخصیت عجیب و غریب ہے۔ ائمہ جرح و تعدیل کی خاصی تعداد ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے لیکن بعض حضرات انہیں بالکل غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور ان پر سخت جرح کرتے ہیں چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ان کے متعلق فرماتے ہیں:-

ابن اسحاق دجال من الدجاجلة	ابن اسحاق دجالوں میں کا ایک دجال ہے[1]

یہ دوسری صدی ہجری کے شخص ہیں اور اصل باشندہ مدینہ طیبہ کے ہیں اس لئے امام مالک سے زیادہ ان سے کون واقف ہوگا؟ مشہور محدث دحیم کی رائے ہے کہ:

ان قول مالك فيه ليس للحديث انما هو لانه اتهمه بالقدر[1]	امام مالک کی اس رائے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حدیث کے بارے میں دجل سے کام لیتے تھے بلکہ اس لئے ہے کہ امام مالک انہیں قدری سمجھتے تھے۔

"دجال" کے لفظ میں فریب کاری کا جو مفہوم پایا جاتا ہے وہ "قدری" ہونے سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتا ہے اس لئے "دحیم" کی یہ توجیہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی، البتہ اس سے ان کا ایک عیب اور سامنے آجاتا ہے یعنی وہ قدری بھی تھے جو ایک مبتدع اور گمراہ فرقہ ہے۔ بظاہر امام مالکؒ کی مراد یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایات کے بارے میں تلبیس و کذب اور دجل و فریب سے کام لیتے ہیں۔ ہشام بن عروہ فرماتے ہیں کہ ابن اسحٰق میری بیوی فاطمہ بنت المنذر سے روایت کرتے ہیں حالانکہ خدا کی قسم انہوں نے میری بیوی کو کبھی نہیں دیکھا[1]

---

[1] و [1] و [1] تہذیب التہذیب از علامہ ابن حجر عسقلانی جلد نہم - ۱۷

امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن اسحاق تدلیس کرتے تھے، ابو عبداللہ فرماتے ہیں کہ ابن اسحاق بغداد پہنچے تو بے احتیاطی کے ساتھ جس سے پاتے روایت کرتے تھے مثلاً کلبی وغیرہ سے بھی روایت کرتے تھے۔ ۱۱۹ھ میں اسکندریہ پہنچے اور وہاں ایسے لوگوں سے روایتیں اخذ کیں، جن سے ان سے پہلے میرے علم میں کسی نے روایت نہیں کی تھی۔ اہل مدینہ نے ان سے بہت کم روایتیں لی ہیں۔ اور سوا ابراہیم کے کسی مدنی نے ان سے روایت نہیں کی ہے، زیادہ تر دوسرے شہروں کے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے، یہ مدینہ ہی کے رہنے والے تھے مگر ایک مدت کے بعد وہاں سے چلے گئے تھے، اور کوفہ، الجزیرہ وغیرہ میں رہے[۱]۔ ابن المدینی فرماتے ہیں۔

لم یضعفہ عندی الا روایتہ من اھل الکتاب۔	میرے نزدیک (ابن اسحاق) کی قدروقیمت صرف اس لئے کم ہوگئی کہ وہ اہل کتاب سے روایت کرتے ہیں۔

سلیمان التیمی نے انہیں کذاب کہا ہے، ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ غزوات نبویہ کے بارے میں یہود کی اولاد سے جو مسلمان ہوگئی تھی روایتیں لیتے ہیں۔ سلیمان تیمی کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے ابن المدینی فرماتے ہیں کہ بظاہر انہوں نے ابن اسحاق کو روایت حدیث میں کذاب و دروغ گو نہ کہا ہوگا بلکہ حدیث کے علاوہ دوسری روایتوں کے بارے میں کذاب کہا ہوگا۔

دارقطنی کی رائے یہ ہے کہ ائمہ جرح و تعدیل کے درمیان ان کے بارے میں اختلاف ہے اور وہ حجت نہیں ہیں۔ صرف بطور اعتبار (یعنی متابع یا شاہد کے طور پر) ان کی روایتیں ذکر کی جاتی ہیں[۲]۔

---

[۱] و [۲] تہذیب التہذیب جلد نہم

جمہور محدثین کا طرز عمل ان کے متعلق یہ ہے کہ ان کی کسی روایت کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک کسی دوسری قابل اعتماد سند سے وہ روایت منقول نہ ہو۔ ان کی روایت جب یہ متفرد ہوں قابل قبول اور قابل اعتماد نہیں سمجھی جاتی۔ گویا محدثین کے نزدیک تو یہ بالکل قابل اعتماد شخص نہیں ہیں۔ علامہ بدر الدین عینیؒ اپنی مشہور شرح بخاری عمدۃ القاری میں تحریر فرماتے ہیں:

فقال البیہقی الحفاظ یتوقون ماینفرد بہ ابن اسحاق	امام بیہقی نے فرمایا ہے کہ حفاظ حدیث ان روایتوں سے بچتے ہیں جن کے راوی تنہا ابن اسحاق ہیں
(جلد ثالث باب الجمع فی القرنی والمون)	

تقریب التہذیب میں علامہ ابن حجرؒ نے ان کے متعلق ایک اور انکشاف کیا ہے فرماتے ہیں:۔

امام المغازی صدوق یدلس ورمی بالتشیع والقدر من صغار الخامسۃ	غزوات کی تاریخ لکھنے میں تو امام ہیں۔ سچے ہیں مگر مدلس ہیں اور ان پر شیعہ اور قدری ہونے کا الزام بھی ہے طبقہ خامسہ کے نیچے درجے کے راوی ہیں۔

شیعہ ہونے کا الزام ایسا ہے جس کا ثبوت ان کی بیان کردہ روایتوں سے ملتا ہے قدری درحقیقت معتزلی کے مرادف ہے۔ اعتزال وشیعیت تو ام ہیں رتبہ صحابیت کی ناقدری دونوں میں مشترک ہے۔ خود مودودی صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ معتزلہ صحابہ کرام پر نہایت بے باکی کے ساتھ تنقید کرتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں" ان لوگوں (معتزلہ) نے صحابہ کے

لے تہذیب التہذیب جلد نہم

اختلافات اور پچھلی خلافتوں کے مسئلے میں بھی بے باکانہ اپنے فیصلے صادر کئے۔ واصل ابن عطا کا قول تھا کہ جنگ جمل و جنگ صفین کے فریقین میں سے کوئی ایک گروہ فاسق تھا۔ عمرو بن عبیدؒ کے نزدیک دونوں فاسق تھے بعض نے حضرت عمرؓ کو بھی مطعون کر ڈالا" ص ۲۱۹ (معتزلہ کا بیان)

فن رجال کے مشہور امام اور محدث کبیر ابو حاتم رازیؒ کتاب الجرح والتعدیل میں ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نے انہیں دجال الدجاجلہ (دجالوں کا دجال) کہا ہے۔ ہشام بن عروہؒ نے فرمایا ہے کہ یہ کذاب تھا۔ امام ذہبیؒ میزان الاعتدال میں مشہور محدث اور امام فن رجال یحییٰ بن سعید القطان سے نقل فرمایا ہے کہ حضرت عبید اللہ قواریریؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص محمد بن اسحاق کی کتاب لکھے گا وہ بہت سا جھوٹ لکھے گا۔ اور امام ابو داؤدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ قدری معتزلی ہے۔

اسی کتاب میں ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ وہ اخبرنی وحدثنی کہکر بھی تدلیس کرتا ہے اور ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مرغ بازی کا عادی تھا۔ امام ابوداؤد عباسی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بعض اصحاب سے سنا ہے کہ ان سے محمد بن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے ایک ثقہ نے بیان کیا ہے جب پوچھا گیا کہ وہ ثقہ کون تھا تو کہا کہ یعقوب یہودی۔

یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ گواہی دیتا ہوں کہ ابن اسحاق کذاب ہے۔ مزید یہ کہ سیرت میں جھوٹے اشعار داخل کر لیا کرتا تھا۔ مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ ابن اسحاق صفات الٰہی کے بارے میں ایسے لغو روایات بیان کیا کرتا تھا کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی اور دوبارہ میں اس کے پاس نہیں گیا[1]

مندرجہ بالا سطروں میں محمد ابن اسحاق کے متعلق جو آراء ہم نے نقل کی ہیں انہیں یکجا کرنے سے

---

[1] ملاحظہ ہو میزان الاعتدال (ذہبی)، جلد ثالث ترجمہ محمد بن اسحاق

ان کی مندرجہ ذیل تصویر سامنے آتی ہے :-

(۱) وہ بہت دھوکے باز (دجال) تھے (امام مالکؒ)

(۲) حدیث میں نہیں تو کم از کم تاریخ میں کذاب تھے۔ (سلیمان تیمی)

(۳) اہل کتاب سے روایت کرتے تھے (ابن المدینی)

(۴) ان کی روایت حجت نہیں ہے بلکہ محض اعتبار کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں (دار قطنی)

(۵) جمہور محدثین کے نزدیک حدیث میں وہ بالکل غیر معتبر ہیں (بیہقی)

(۶) اہل مدینہ میں سوا ابراہیم کے ان سے کسی نے روایت نہیں کی ہے (ابوعبداللہ)

(۷) فاطمہ بنت المنذر کی طرف روایات کی نسبت میں انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ (ہشام بن عروہ)

(۸) بقول بعض وہ شیعیت کی گمراہی میں مبتلا تھے ان کے ساتھ ان پر قدری ہونے کا الزام بھی ہے (تقریب التہذیب)

(۹) متروک و نامقبول بلکہ گمراہ و کذاب راویوں مثلاً کلبی وغیرہ سے روایت کرتے تھے (میزان الاعتدال)

(۱۰) کذاب، وضاع، مرغ باز، مدلس، معتزلی تھے۔ یہود سے روایت کر کے تدلیس کرتے تھے (اس) کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ اسے ثقہ کہکر فریب دیتے تھے"

اتنی کی شدید جرح نے درحقیقت ان کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے کہ تعدیل و ستائش کا مرہم ان زخموں کو مندمل کرنے سے بالکل قاصر ہے تشیع کے بعد صدوق کا لفظ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ شیعہ مذہب میں تقیہ یعنی حسب حاجت جھوٹ بول دینا داخل عبادت ہے۔ اس مسئلہ کے پیش نظر کسی شیعہ کی روایت پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ قوی قرائن کی بناء پر ان صاحبان کی کسی روایت کو قبول بھی کر لیا جائے تو یہ اس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ اس کی سب روایتیں مقبول

ہیں۔ محدثین کرام کا یہ قاعدہ تو بہرصورت ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ کسی مبتدع کی خواہ وہ شیعہ ہو یا قدری ومعتزلی کوئی ایسی روایت ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی جو اس کی بدعت اور اس کے مذہب کی تائید کر رہی ہو۔[1] اس مسلمہ قاعدے کے بموجب کسی شیعہ یا قدری ومعتزلی کی کوئی ایسی روایت قبول نہیں کی جا سکتی۔ جس سے کسی صحابی کے دامن تقویٰ پر کوئی دھبہ لگتا ہو۔ اس لئے کہ صحابہ کرام کو مجروح کرنا شیعیت کی فطرت اور سقف اعتزال کا تنہا استون ہے۔ اس بارے میں جھوٹ بولنا اور کذب وافترا کے انبار کرنا ان لوگوں کے نزدیک بہت بڑی عبادت ہے۔ محدثین کا یہ اصول عقل ونقل کے مطابق اور فطرت انسانی سے پوری مناسبت رکھتا ہے اس کی روشنی میں ابن اسحاق کی وہ سب روایتیں مردود نظر آتی ہیں جن سے کسی صحابی کا کردار مجروح ہوتا ہے اور اس کی پوری کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ ناپید ہو گئی ورنہ شاید اور زیادہ فتنہ کا سبب بنتی۔

محدثین کرام کا عام اصول ہے کہ جرح مفسر کو تعدیل پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم ابن اسحاق کے متعلق بعض حضرات کے تعریفی کلمات پر نظر کرتے ہیں تو وہ بالکل بے وزن و بے سود نظر آتے ہیں۔ ان حضرات کی رائے کو ناواقفیت پر محمول کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ناواقفیت کوئی دلیل نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ابن اسحاق شیعہ اور قدری ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کذاب اور دروغ گو ہے۔ انہیں نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ شخص دجل وفریب سے کام لیتا ہے، وہ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ مدلس بھی ہے۔ انہیں خبر نہ تھی کہ یہ دشمنان اسلام یہود کے من گھڑت قصے بھی زیب دے کر بیان کر دیتا ہے۔

---

[1] دیکھئے شرح نخبۃ الفکر وغیرہ کتب اصول حدیث

اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص تقیہ اور فریب کے پردے میں اپنی شیعیت اور اپنے دوسرے رذائل کو مدت تک چھپائے رہا۔ بالآخر محدثین کرام کی فراست ایمانی کے نور نے تقیہ کے ظلماتی پردوں کو ھباء منثورا بنا دیا اور اس کا مکروہ چہرہ انہوں نے صاف دیکھ لیا۔ مگر اس سے یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ ابن اسحاق کا ان عیوب سے ملوث ہونا مشکوک یا مشتبہ ہے۔ اس تفصیل سے ہمارا مقصد ان حضرات کی غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو ابن اسحاق کے متعلق بعض علمائے اہل سنت کی توثیق نقل کر کے اس کی شخصیت میں وزن پیدا کرنے کی سعی لاحاصل کیا کرتے ہیں۔ اور اس کے متعلق جرح کو نظر انداز کر کے اسے مختلف فیہ رواۃ کی صف میں جگہ دیکر اس کی قدر افزائی کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسے درحقیقت مختلف فیہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بارے میں موثقین کی توثیق کالعدم ہے۔ اس لئے کہ اسے ناواقفیت پر محمول کیا جائے گا۔ اور جرح مفسر کے بعد اس کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ بلکہ محدثین کے مسلمہ اصول کے مطابق جرح کو مقدم رکھا جائے گا۔ جمہور محدثین نے اس کے متعلق جو طرز عمل اختیار فرمایا ہے وہ بھی اس کی قوی دلیل ہے کہ انہوں نے اس کی توثیق کو کالعدم قرار دیا ہے۔

صاحب التقریب نے ان کے لئے "رمی بالتشیع والقدر" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر شیعیت و قدریت کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اس سے کسی صاحب کو یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ یہ تو محض الزام کا تذکرہ ہے نہ کہ ثبوت الزام کا۔ یہ شبہ محض فن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ فن رجال میں اس قسم کی عبارت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بعض علماء کو ان کے اس عیب کی اطلاع ہوئی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ عیب ان کے اندر یقیناً موجود ہے دوسرے حضرات اس کی نفی نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے ان بعض کا اس عیب کی نشاندہی کرنا ہی اس کا ثبوت ہے کہ ان میں یہ پایا جاتا ہے۔ کسی راوی کو مجروح قرار دینے کے لئے ان حضرات کا بیان کافی ہے،

اگر ایسا نہ ہو تو پورا فن رجال بے کار ہو جائے، اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ ان اصحاب جرح و تعدیل کی حیثیت مدعی کی نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ شاہد اور گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ابن اسحاق میں شیعیت و قدریت کا عیب بالکل ثابت ہے، خصوصاً جبکہ کسی طرف سے اس کی تردید بھی نہ ہوتی ہو۔ دو مہروح کا سکوت کسی طرح بھی صفائی کے مرادف نہیں ہو سکتا، بلکہ ناواقفیت پر محمول کرکے کالعدم سمجھا جائے گا، بلکہ اگر یہ سمجھا جائے کہ ان حضرات کا سکوت اور الزام کی تردید سے احتراز الزام کے ثبوت کو مزید تقویت پہنچاتا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

یہ بات بھی دیکھنے والی ہے کہ ابن اسحاق کا اصل وطن مدینہ طیبہ ہے مگر وہاں کے علماء میں ابراہیم کے علاوہ کوئی ان سے روایت نہیں کرتا — آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے علماء عام طور پر انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مولد و منشاء کے لوگ آدمی کے کردار سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور ان کی رائے اس بارے میں باہر والوں سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔

تدلیس کا عیب تو ان میں موجود ہی تھا اس پر طرہ یہ ہوا کہ انہوں نے اخذ روایت میں بھی کوئی احتیاط نہیں برتی، بلکہ متروک، کذاب، مبتدع اور یہودی راویوں سے بھی روایتیں کرتے رہے۔ تدلیس کا بدنما دھبہ اس طرح اور بھی گہرا ہو گیا جس نے انہیں بالکل ہی غیر معتبر بنا دیا۔[۱]

ایک مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بعض روایتوں اور اقوال کو امام بخاریؒ، امام مسلمؒ کے ایسے محتاط محدث نے بھی درج کتاب کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے متابعات میں ان کی روایتیں ذکر کی ہیں اور امام بخاریؒ نے تعلیقاً ان کے بعض اقوال نقل کئے ہیں، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ

---

[۱] مدلس اگر ثقہ ہو اور معلوم ہو کہ وہ صرف ثقہ سے روایت کا التزام کرتا ہے تو اس کی روایت قابل قبول ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ ابن اسحاق یہ التزام نہیں کرتے ہیں اس لئے تدلیس ان کی روایت کو نا معتبر بنا دیتی ہے۔

انہیں معتمد علیہ سمجھتے تھے۔ متابعت کی صورت میں تو ان کی روایت محض تائیدی حیثیت رکھتی ہے تعلیق میں بھی تقریباً اس کی یہی حیثیت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ امام بخاریؒ نے تعلیقات میں وہ شرائط ملحوظ نہیں رکھے ہیں جس کی پابندی وہ اپنی کتاب کی مستند روایتوں کے متعلق کرتے ہیں۔ محض تائید کے لئے ضمنی طور پر کسی کی روایت یا قول کا درج کتاب کر دینا اس کی دلیل نہیں ہے کہ مصنف کے نزدیک یہ شخص قابل اعتماد بھی ہے۔ ہم آپ بسا اوقات مستشرقین کے اقوال بطور تائید ذکر کرتے ہیں حالانکہ انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔

جمہور فقہائے عظام اور محدثین کرام نے ابن اسحاق کے ساتھ جو طرز عمل اختیار فرمایا ہے وہ بہت حکیمانہ اور مناسب ہے۔ انہوں نے انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھا ہے۔ اس کے بعد تاریخ میں تو ان کا پایہ اور بھی گر جاتا ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ جو شخص حدیث نبوی کے بارے میں غیر محتاط ہوگا اس سے دوسری روایتوں میں صداقت و احتیاط کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے؟ خصوصیت کے ساتھ ان کی جو روایتیں مثالب صحابہ پر مشتمل ہوں وہ تو یقیناً مردود ہوں گی۔ حاصل یہ کہ ابن اسحاق بالکل غیر معتبر شخص ہے اور اس کی روایتوں کی بنیاد پر کسی نظریہ کی عمارت تعمیر کرنا ہوا پر تعمیر کے مرادف ہے ضمناً یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیرت ابن ہشام کا ماخذ درحقیقت اسی ابن اسحاق کی کتاب ہے۔ اس لئے وہ بھی باوجود شہرت بحیثیت مجموعی ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے، اور اسی پر موقوف نہیں ہے بلکہ آج عربی میں جتنی کتابیں سیرت پر پائی جاتی ہیں ان سب کا سب سے بڑا ماخذ ابن اسحاق ہی کا نوشتہ ہے، اس لئے اس موضوع پر ہر کتاب کو بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مکرر عرض ہے کہ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ سیر و مغازی کی ہر کتاب اوّل تا آخر مجموعۂ اغلاط ہے، ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کی روایتوں کو محض مؤلف کے اعتماد پر نہیں قبول کیا جا سکتا بلکہ روایت و درایت کے مسلمہ اصول کی روشنی میں ان پر نظر کی جائے گی جو معیار پر پوری اترے گی

اسی کو قبول کیا جائے گا۔ اگر جو اس پر پوری نہ اترے گی اسے رد کر دینا لازم ہے خصوصاً تاریخی روایتوں کی جانچ تو اور بھی زیادہ سختی کے ساتھ کی جائے گی اس لئے کہ ان میں کذب و افترا کا احتمال زیادہ ہے۔

واقدی کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے جمہور محدثین اسے کذاب کہتے ہیں خطیب بغدادی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

کتب الواقدی کذب [۱]	واقدی کی کتابیں جھوٹ کی پوٹ ہیں۔

امام نسائی فرماتے ہیں:۔

الکذابون المعروفون بوضع الحدیث	وہ جھوٹے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا
علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کرتے اور حدیثیں گڑھنے میں مشہور ہیں چار ہیں،
اربعۃ ابراھیم بن ابی یحییٰ بالمدینۃ	ابراہیم بن ابی یحییٰ مدینہ میں، مقاتل خراسان میں
ومقاتل بخراسان ومحمد بن سعید	محمد بن سعید مصلوب شام میں اور واقدی
المصلوب بالشام والواقدی ببغداد [۲]	بغداد میں۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ وہ کذاب ہے، احادیث کو الٹ پلٹ دیتا ہے۔ امام بخاریؒ اور امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ میں واقدی کو حدیث، انساب اور ان کے علاوہ کسی چیز میں بھی معتبر نہیں سمجھتا۔

اسحاقؒ بن طباع فرماتے ہیں کہ میں نے واقدی کو دیکھا ہے کہ وہ نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا تھا امام اسحاقؒ بن راہویہ فرماتے ہیں کہ وہ حدیثیں گڑھا کرتا تھا [۳]۔ یعنی وضاع تھا۔ یہ سب اقوال میزان الاعتدال میں علامہ ذہبیؒ نے ذکر فرمائے ہیں۔ ان کے ساتھ بعض اقوال اس کی توثیق میں بھی نقل

[۱،۲] تہذیب التہذیب جلد نہم تذکرہ محمد بن عمر واقدی

[۳] میزان الاعتدال علامہ ذہبیؒ ج ۳

کئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ توثیق ناواقفیت پر مبنی ہے۔ جرح مفسر کے بعد مسلمہ اصول کے مطابق یہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان سب اقوال و آراء کو نقل کرنے کے بعد علامہ ذہبی فرماتے ہیں :-

واستقر الاجماع علی وھن الواقدی	واقدی کے وہن (ناقابل اعتماد ہونے) پر محدثین کا اجماع ہو گیا ہے۔

ان آراء و اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیر و تاریخ میں واقدی کی روایتوں پر بحیثیت مجموعی نظر کیجئے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ یہ شخص سبائی تھا جس نے صحابہ کرام کے مادۂ عظمت پر خاک ڈالنے کے لئے اپنی پوری ذہانت صرف کر دی تھی، ذہین اور قوی الحافظ تھا، روایتیں وضع کرنے اور قصے گڑھنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ صحابہ کرام کے خلاف جھوٹی روایتیں گڑھیں اور انہیں شہرت دی۔ ان کے ساتھ فضائل صحابہ کی سچی روایتوں کی شیرنی بھی آمیز کر دی تاکہ زہر آسانی کے ساتھ حلق سے اتر جائے۔ تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر منصب قضا تک پہنچ گیا، اس ظاہری وجاہت نے اس کے ہفوات و لغویات میں بھی ایک وزن پیدا کر دیا، ورنہ اس کی حیثیت ایک قصہ گو اور داستان سرا سے زیادہ نہ ہوتی[1]

طبقات ابن سعد میں جو روایتیں آئی ہیں ان کی کثیر تعداد انہیں واقدی کی روایتوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ واقدی ابن سعد کے استاد ہیں اس لئے یہ بکثرت ان سے روایت کرتے ہیں یہ کتاب ناپید تھی۔ قیصر جرمنی نے اپنے مصارف سے سب سے پہلے شائع کی اور یورپ کے ہاتھوں سے ہم تک پہنچی ہے۔ یہود اور عیسائیوں نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور نقصان پہنچانے کی جو کوششیں کی ہیں یا جواب کر رہے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ شبہ بالکل بعید نہیں ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے الحاق و تحریف کے کرتب دکھائے ہوں خصوصاً یہود تو اس فن میں ماہر ہیں اور اسلام سے

---

[1] ایک لطیفہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے ص ۳۱۱ پر واقدی وغیرہ بعض کذابوں کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے ایک عجیب عبارت
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بغض و عداوت میں بھی پیش پیش رہتے ہیں بلکہ حقیقت قریب ہے کہ غیر مسلموں خصوصاً یہود کا غیر مسلم رہتے ہوئے اسلامی علوم سے شغف کبھی بے مقصد نہیں ہوتا اور اس کا محرک ہمیشہ کوئی نہ کوئی مفسدانہ جذبہ ہوتا ہے ؎

مجھ تک کب اس کی بزم میں آیا تھا جام مے
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

تاریخ طبری بھی یورپ کی ہو اکھا کر ہم تک پہنچی ہے اس لئے تحریف و الحاق کا احتمال اس میں بھی ہے یہ حقیقت بھی پیش نظر ہے کہ قیصر کے دور میں جرمنی پر یہود چھائے ہوئے تھے خود ابن سعدؒ ثقہ اور قابل اعتماد ہیں لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے بھی واقدی سے احتیاط نہ کی۔ ان کا یہ طرز عمل خود اس کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں روایات کے بارے میں وہ احتیاط نہیں برتی ہے جو وہ احادیث کے پرکھنے میں برتتے ہیں۔ یہ واقعہ طبقات ابن سعد کی قدر و قیمت کو گرا دیتا ہے تاہم ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کتاب میں ہر روایت قابل رد ہے مگر کسی کو یہ کہنے کا حق بھی نہیں ہے کہ اس کی ہر روایت کو صرف اس لئے صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ خود ابن سعدؒ ثقہ تھے معاملہ وہی ہونا چاہئے جو ہم حدیث کی کتابوں کے ساتھ کرتے ہیں یعنی ہر روایت کو امتحان و نقد کی منزل سے گزرنا چاہئے اور قبول و عدم قبول کا فیصلہ اصول حدیث کی روشنی میں ہونا چاہئے۔

یہ عرض کر چکا ہوں کہ مابعد کی سیرت و تاریخ کی کتابوں کا مدار عموماً انہیں چار کتابوں پر ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ) انھم جمیعا یوثقون فی السیرۃ و المغازی تحریر فرمائی ہے۔ لیکن نہ اس کا کوئی حوالہ ہے نہ کہنے والے کا نام۔ کیا خوب استدلال ہے۔ یہ درحقیقت یہ قول اصل اور ان کی ذہنی اختراع ہے۔ اس طریقہ کو مغالطہ دہی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ پھر اس سے فائدہ کیا؟ اگر بالفرض کسی نے لکھا بھی ہو تو مردود ہوگا۔ دلائل مذکورہ کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا باقی رہتی ہے؟

ان کی صحیح حیثیت واضح ہونے کے بعد ابن الاثیر ابن کثیر ابن خلدون وغیرہ کی حیثیت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے ؟ جن سرچشموں سے انہوں نے آبیاری کی ہے وہ خود ہی گدلے ہیں تو ان کے مشکیزوں میں صاف پانی کہاں سے آجاتا ؟ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی تاریخی کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس پر پورا اعتماد کیا جاسکے۔ ان کی ہر روایت کو جانچنا پرکھنا واجب ولازم ہے۔

استیعاب کا مطالعہ آدمی کو حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں انہوں نے صحابہ کرام کے جو فضائل ومناقب بیان کئے ہیں انہیں دیکھ کر بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے صحابہ کرام کے متعلق روایات میں احتیاط برتی ہوگی لیکن جب ان کی کتاب پر نظر کیجئے تو ساری امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اپنی کتاب کی روایتوں کے اسناد انہوں نے ابتداء کتاب میں ذکر کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تیس[۳۰] سندیں تحریر فرمائی ہیں جن میں سے پانچ سندیں ان میں ابن اسحاق پر اور دو واقدی پر منتہی ہوتی ہیں۔ بقیہ سندیں دوسرے اہل علم مثلاً مسلم عقبہ وغیرہ پر ختم ہوتی ہیں۔ مگر کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کا سارا مواد ابن اسحاق اور واقدی کا رہین منت نہیں ہے لیکن اگر استقرا کیا جائے تو اکثر روایتیں انہیں دونوں سے ماخوذ ہیں۔ مولف نے طبری کو بھی ماخذ بنایا ہے جس کا تذکرہ انہوں نے اسی دیباچے میں کیا ہے ظاہر ہے کہ ان غیر معتبر ماخذ سے روایتیں لینا کتاب کی قدر وقیمت کو کس قدر گرا دیتا ہے۔ اور تاریخی روایات کے بارے میں خود مصنف کی بے احتیاطی ظاہر کرتا ہے، مزید یہ کہ بے سند روایتیں بھی ان میں موجود ہیں چنانچہ خود مؤلف تحریر فرماتے ہیں :-

وفی کتابی ھذا من غیر ھذہ	اور میری اس کتاب میں کتب مذکورہ کے علاوہ
الکتب من منثور الروایات والفوائد	بہت سی متفرق روایتیں اور فوائد اور حواشی بھی
والتعلیقات عن الشیوخ ما لا یخفی	ہیں جو شیوخ سے حاصل ہوئے ہیں جیسا کہ خود

کرنے والے پر پوشیدہ نہیں ہے۔

ان روایتوں کا درجہ کیا ہے؟ ایک مورخ تو انہیں بازاری افواہوں سے اونچا مرتبہ نہیں دے سکتا۔ اس بھدے پیوند نے کتاب کو اور زیادہ بدنما بنا کر اس کے اعتبار کو اور بھی مجروح کر دیا ہے۔

جو شخص عقل و فہم سے کام لے کر اور کتاب و سنت کے نور سے آنکھوں کو روشن کر کے اس کتاب کو دیکھے گا وہ خواہ حافظ ابن عبد البر کی قوت حافظہ اور ان کی وسعت نظر کے متعلق کیسی ہی اچھی رائے کیوں نہ قائم کرے مگر ان کی فہم دین اور ان کے تفقہ کے متعلق تو ہرگز کوئی اچھی رائے نہیں قائم کر سکتا، نہ انہیں نقل روایت کے بارے میں قابل اعتماد سمجھ سکتا ہے۔ وہ حضرات جو قدامت ہی کو عظمت کی ضمانت سمجھتے ہیں، میری اس تحریر پر ضرور چیں بجبیں ہوں گے، لیکن جب وہ کتاب کو اس زاویہ سے ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس میں مصنف نے کذابوں، وضاعوں، سبائیوں کی موضوعہ جھوٹی روایتوں کا کتنا ذخیرہ صحابہ کرام کے خلاف جمع کر دیا ہے اور اسی قسم کی بازاری افواہوں کی کتنی ڈھیریاں لگا دی ہیں۔ گویا شیعوں اور شیعیت زدہ نام کے سنیوں کے ضلال و اضلال میں اضافہ کرنے کے لئے کتنا سواد اکٹھا کر دیا ہے تو وہ میری رائے سے اتفاق کریں گے بشرطیکہ صحابہ کرام کی عظمت ان کے دل میں ویسی ہی ہو جیسی ایک سنی کے دل میں ہونا چاہیے۔

بطور نمونہ اس کو دیکھ لیا جائے جو انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے تذکرے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے یا حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے تذکرے میں ان کے متعلق موضوع روایتوں کی بنیاد پر جو رائے ظاہر کی ہے۔

اس کتاب کے متعلق محدث شہیر اور علم اصول حدیث کے امام کبیر علامہ ابن صلاح کا بصیرت افروز تبصرہ قابل ذکر ہے۔ علوم حدیث کی ایک صنف علم "معرفۃ الصحابہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے

تحریر فرماتے ہیں :-

هذا علم كبير قد الف فيه الناس كتبا كثيرة و اكثرها فوائد كتاب الاستيعاب لابن عبد البر لولا ما شانه به من ايراده كثيرا مما شجر بين الصحابة وحكاياته عن الاخباريين لا المحدثين وغالب على الاخباريين الاكثار والتخليط فيما يروونه

(علوم الحديث لابن الصلاح ، النوع التاسع والثلاثون معرفة الصحابة ص ۲۹۲)

یہ بہت بڑا علم ہے جس میں لوگوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں ۔ ان سب میں مفید ترین کتاب ابن عبد البر کی استیعاب ۔ ہوتی اگر اس میں یہ عیب نہ ہوتا کہ انہوں نے مشاجرات صحابہ کے بارے میں زیادہ تر روایتیں محدثین کے بجائے اخباریوں سے لی ہیں اور اخباری اپنی اس عادت سے مغلوب ہیں کہ وہ روایتوں کو بڑھا چڑھا کر اور غلط ملط کر کے (یعنی جھوٹ سچ کو ملا کر) بیان کرتے ہیں ۔

اس سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک استیعاب معتبر کتاب نہیں ہے ۔

روایات کے بارے میں ان کی بے احتیاطی کی ایک توجیہ ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر چکے ہیں اسے پیش نظر رکھنے سے یہ بری الذمہ تو نہیں ہو سکتے لیکن ان کا جرم کچھ ہلکا ضرور ہو جاتا ہے علاوہ بریں تحریف و الحاق کے شبہ سے یہ کتاب بھی پاک نہیں ہے ۔

مروج الذہب کے متعلق مودودی صاحب کو خود اعتراف ہے کہ اس کا مصنف مسعودی شیعہ تھا ، لکھتے ہیں :-

" رہا المسعودی تو بلاشبہ وہ معتزلی تھا مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ غالی شیعہ تھا .... تاہم تشیع اس میں تھا " ص ۳۱۰

مودودی صاحب المسعودی کی شیعیت کا تو اقرار کرتے ہیں مگر اس کے غلو فی التشیع کی نفی کرتے ہیں

ہماری گزارش یہ ہے کہ صحابہ کرام پر افترا پردازی اور اس مقصد کے لئے وضع روایات یا روایات مکذوبہ موضوعہ کو سمیٹ لینا غلو فی التشیع کا محتاج اور اس پر موقوف نہیں ہے۔ اس کے لئے نفس تشیع کافی ہے۔ شیعیت کی بنیاد ہی صحابہ کرام کی مخالفت اور مرتبہ صحابیت کی بے وقعتی پر قائم کی گئی ہے۔ تقیہ کی تو بات ہی دوسری ہے ورنہ ایک فرد بھی ایسا نہیں مل سکتا جو شیعہ بھی ہو اور صحابہ کرام کے متعلق زبان کھولنے میں محتاط بھی ہو۔ اول تو کسی شیعہ سے غلو کی نفی کرنا ہی درحقیقت شیعیت سے ناواقفیت یا دیدہ دانستہ فریب دہی پر مبنی ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر شیعہ غالی ہوتا ہے لیکن اگر شاذ و نادر کوئی ایسی مثال پائی بھی جائے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ وہ صحابہ کرام کی تکفیر نہیں کرتا۔ مگر ان کی تنقیص کے لئے جھوٹی روایتیں وضع کرنا یا نقل کر دینا یہ بات تو اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اس سے وہ احتراز کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا شیعیت کی بیماری اس سے یہ گندگی اگلوا کے رہتی ہے۔

یہ تمام تر اس صورت میں ہے جب ہم مودودی صاحب کی یہ بات تسلیم کر لیں کہ مسعودی غالی شیعہ نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کے غالی نہ ہونے کی جو دلیل بیان فرمائی ہے وہ بالکل کمزور اور بے جان ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس نے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی مدح و ستائش کی ہے۔ گذشتہ صفحات میں ہم اس دلیل کی کمزوری خوب واضح کر چکے ہیں۔ اور ابن ابی الحدید کو بطور مثال پیش بھی کر چکے ہیں جو بہت غالی شیعہ تھا لیکن بظاہر ان دونوں حضرات کی مدح بھی کرتا ہے۔ مسعودی نے بھی از راہ تقیہ و فریب دہی یہ مدح و ستائش کی ہو تو کیا عجب ہے۔ اس مسئلہ کو مفصل طور پر ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ اعادہ کی حاجت نہیں ہے۔

مودودی صاحب نے مسعودی کا معتزلی ہونا تسلیم کیا ہے اور معتزلہ صحابہ کرام کے

معاملہ میں جس قدر بے ادب اور گستاخ تھے یہ ایک مشہور اور مسلمہ واقعہ ہے جس کا اقرار خود مودودی صاحب نے بھی اپنی اسی کتاب میں کیا ہے جس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں۔ مسعودی کو معتزلی کہنے کے بعد اس سے صحابہ کرام کے متعلق کسی انصاف پسندی یا عقیدت مندی کی توقع رکھنا کسی صاحب فہم کا کام نہیں ہو سکتا۔

یہاں یہ بات اور عرض کر دوں، بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی مخالفت و مذمت شیعیت کی حقیقت کا جزو لاینفک ہے جس کے بغیر اس کا وجود نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے یہ عین ممکن ہے کہ ایک شیعہ از راہ تقیہ نہیں بلکہ حقیقتاً شیخین کی مدح و ستائش کرے مگر دوسرے حضرات صحابہ کا دشمن ہو۔ فرقہ زیدیہ کا شمار شیعوں ہی میں ہے حالانکہ وہ شیخین کی مذمت نہیں کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا تفضیلیہ کا شمار بھی شیعوں میں کیا گیا ہے باوجودیکہ وہ ان دونوں حضرات کی مذمت کو جائز نہیں سمجھتے۔ علیٰ ہذا شیعوں میں خود متعدد فرقے ہیں اور سب کے سب شیخین کی مذمت و عداوت پر متفق نہیں ہیں۔

البتہ جو چیز سب فرق شیعہ میں متفق علیہ اور شیعیت کے لئے لازم ہے وہ ہے رتبۂ صحابیت کی ناقدری، اور یہ بات سب فرق شیعہ میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ شیعوں کے جو فرقے حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مدح و ستائش بلا تقیہ بھی کرتے ہیں، ان کا یہ طرز عمل بھی ان حضرات کے رتبہ صحابیت کی بناء پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے کچھ دوسرے اسباب ہوتے ہیں۔ اگر ان کے دل میں رتبہ صحابیت کی قدر و عظمت ہوتی تو وہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی بھی وقعت و عزت کرتے اور کسی کے خلاف بھی زبان درازی کی جرات نہ کرتے، وہ شیخین کی تنظیم و تکریم ان حضرات کے کارناموں اور ان کے دینی خدمات کی بناء پر کرتے ہیں، نہ کہ ان کی صحابیت کی بناء پر۔

ان میں اور اہل سنت والجماعت میں اس مسئلہ کے اعتبار سے یہ ایک بنیادی فرق ہے۔ اہل سنت کے نزدیک ہر صحابی کی عظمت اس کے رتبۂ صحابیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کی اصل عظمت اسی وجہ سے ہے، اس کے کارنامے اور دینی خدمات یہ سب چیزیں عظمت میں اضافہ کا سبب تو بنتی ہیں لیکن نفس عظمت کا سبب نہیں ہوتیں۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھنے سے سنیت نما شیعیت کے فریب سے حفاظت ہو سکتی ہے، جس کا رنگ خود مودودی صاحب میں بھی نمایاں ہے۔ ایک طرف وہ شیخین رضی اللہ عنہما کی مدح وستائش کرکے زمرۂ اہل سنت میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دوسری طرف صحابۂ کرام کے ایک بہت بڑے گروہ کو مجروح قرار دیکر شیعیت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ راقم السطور نے مضمون کی قسط اول میں مودودی صاحب کو شیعہ لکھا تو اس پر بعض حضرات معترض ہوئے کہ تم نے یہ سوء ظن کیوں کیا جبکہ وہ حضرات صحابۂ کرام کی مدح وستائش کرتے ہیں، خصوصاً حضرات شیخین کے تو بہت معتقد ہیں۔ امید ہے کہ مندرجہ بالا سطریں ان حضرات معترضین کی تسکین کے لئے کافی ہونگی۔[1]

---

[1] بعض حضرات اس پر بھی معجب ہیں کہ تم نے مولانا مودودی صاحب پر تجدید سبائیت کا الزام کیوں عائد کیا؟ ان سے گزارش ہے کہ عبداللہ ابن سبا کی یہودی تحریک کی روح رتبۂ صحابیت کی ناقدری اور صحابۂ کرام سے بے اعتمادی تھی۔ وہ خود تو یہودی منافق تھا، لیکن اس نے مسلمانوں میں ایسی جماعتیں پیدا کر دیں جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی صحابہ کے حق میں بدگمانی و بدزبانی سے کام لینے لگے ان میں بہت سے فرقے ہو گئے، بعض تو حد کفر تک پہنچ گئے مثلاً شیعہ باطنیہ یا نصیریہ وغیرہ بعض اسلام میں تو داخل رہے مگر مبتدع اور گمراہ کہلائے یہ اگرچہ مسلمان ہیں مگر اہل سنت والجماعت سے خارج ہیں۔ صحابۂ کرام کے حق میں اتنی بدگمانی و بدزبانی کے بعد بھی اگر کوئی شخص اہل سنت والجماعت میں داخل رہے تو یہ لفظ ہی بے معنی ہو جائے گا۔ میں انہیں مسلمان سمجھتا ہوں لیکن شیعہ اور گمراہ سمجھتا ہوں انہوں نے ایک نئے عنوان سے (جو موجودہ زمانے میں مقبول ہے) ایک جماعت صحابہ کو مجروح کرکے ان سے بے اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ابن سبا کا خاص مشن تھا، اس لئے میں نے انہیں مجدد سبائیت کہا ہے۔

"کتاب الامامۃ والسیاسۃ" ابن قتیبہ کے متعلق خود مودودی صاحب لکھتے ہیں :-

"اس کے متعلق یقین کے ساتھ کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ وہ ابن قتیبہ کی نہیں ہے صرف شک ظاہر کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں بعض روایات ایسی ہیں جو ابن قتیبہ کے علم اور اس کی دوسری تصنیفات کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں میں نے خود یہ کتاب پوری پڑھی ہے اور اس کی چند روایتوں کو میں بھی الحاق سمجھتا ہوں مگر اس کی بناء پر پوری کتاب کو رد کر دینا میرے نزدیک زیادتی ہے۔ اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں اور ان میں کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی ہے جس کی بنا پر وہ ناقابل قبول ہوں۔" ص ۳۱۰

مولانا کے نزدیک پوری کتاب کو رد کر دینا زیادتی ہے مگر پوری کتاب کو قبول کر لینا زیادتی نہیں ہے کون کہتا ہے کہ آپ پوری کتاب کو دریا برد کر دیجئے، لیکن پوری کتاب کو مشکوک و مشتبہ تو سمجھئے اور اسے تاریخ اسلام کی مستند ترین کتابوں میں تو نہ شمار کیجئے۔ جس دلیل کی واقعیت خود مشکوک و مشتبہ ہو اس سے کوئی مدعا کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ آخر یہ استدلال کی کونسی قسم ہے جس میں مشکوک و مشتبہ دلیل سے بھی استدلال جائز ہے ؟ چند روایتوں کا الحاقی ہونا آپ کو بھی تسلیم ہے، اس کے بعد امان کہاں باقی رہی ؟ جس طرح بعض روایتوں کے متعلق آپ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ الحاقی ہیں اسی طرح بہت سی دوسری روایتیں بھی الحاقی ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض روایتیں پورے طور پر الحاقی نہ ہوں۔ مگر ان میں تحریف و تبدیلی کی گئی ہو۔ ممکن ہے کہ پوری کتاب اسی قسم کے الحاقات و تحریفات سے پُر ہو۔ اگر کسی نے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا ہے کہ یہ کتاب ابن قتیبہ کی نہیں ہے تو یقین کے ساتھ کسی نے یہ بھی تو نہیں کہا ہے کہ یہ کتاب ان کی ہے۔ ایسی کتاب کو ماخذ بنانا استدلال کی عجیب و غریب مثال ہے۔

مزید برآں خود مودودی صاحب نے ابن قتیبہ کے متعلق ابن خلدون کی یہ عبارت نقل فرمائی ہے جو گذشتہ صفحات میں ہم حوالہ کے ساتھ نقل کر چکے ہیں۔

"اعتمدناہ للوثوق بالسلامتہ من الاھواء الموجودۃ فی کتب ابن قتیبہ وغیرہ من المؤرخین"۔

تاریخ طبری کو اپنی کتاب کا ماخذ ظاہر کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون تحریر فرماتے ہیں کہ ہم نے اس پر زیادہ اعتماد کیا ہے اس لئے کہ اس میں وہ غلط رجحانات نہیں ہیں جو ابن قتیبہ وغیرہ مورخین کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

'اہواء' کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ابن قتیبہ اپنے ذاتی رجحانات کے مطابق روایتیں لاتے ہیں خواہ وہ غلط اور موضوع ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح روایات کو اپنی خواہشوں اور رجحانات کے مطابق ڈھالنے اور ان میں اس مقصد سے تحریف کرنے سے نہیں چوکتے، اب مودودی صاحب خود ہی انصاف کے ساتھ کہدیں کہ ان حالات میں ابن قتیبہ پر کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے اور ان کی کتابیں مثل کتاب الامامۃ والسیاسۃ قابل اعتبار کس طرح رہ سکتی ہیں؟ صحابہ کرام ہی نہیں کسی مسلمان پر بھی جرح وقدح کرنے کے لئے انہیں ماخذ کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

مولانا نے جن ماخذ کا بخصوص طور پر تذکرہ کیا ہے، ان کی کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں، ان میں ابن ابی الحدید اور اس کی کتاب شرح نہج البلاغہ کے متعلق ہمیں زیادہ نہیں کہنا ہے۔ اس کی شیعیت اس قدر واضح ہے کہ اس کا اقرار مودودی صاحب کو بھی کرنا پڑا۔ اتنا اور سن لیجئے کہ یہ شخص صرف غالی اور متعصب شیعہ ہی نہیں تھا بلکہ اہل سنت کا بہت سخت دشمن بھی تھا۔ چنانچہ بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کے ساتھ سازباز کرنے میں یہ ابن علقمی کے ساتھ برابر کا شریک وسہیم تھا۔

اہل سنت کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے بہت سے افراد نہج البلاغہ کے متعلق بھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اسے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خطبات کا مجموعہ سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے اس میں ایک خطبہ بھی حضرت علی کا نہیں ہے، یہ کتاب شیعی علما علامہ شریف مرتضیٰ اور ان کے بھائی علامہ رضی کی تصنیف ہے جو انہوں نے حضرت علیؓ کی طرف منسوب کر دی ہے۔ اہل سنت نے اسے کبھی حضرت ممدوح کے خطبات کا مجموعہ نہیں تسلیم کیا۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ مودودی صاحب نے دوسری کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ان کے متعلق حسب موقع و ضرورت گفتگو کی جائے گی، لیکن ان میں سے مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس کی اہمیت کے پیش نظر چند سطریں لکھنا چاہتے ہیں۔

امام موصوف کی جلالت شان اور علو درجہ کا تصور کر کے ان کی اس تالیف کے متعلق بھی خیال گذرتا ہوگا کہ بخاری و مسلم کی طرح اس کی ہر روایت واجب القبول اور صحیح ہوگی لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ بخاری و مسلم کی تو شان بڑی ہے اس کا درجہ تو ابوداؤد و ترمذی کے برابر بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس واقعہ اور اس کے سبب کو علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنیئے جو خود حنبلی المسلک بھی ہیں۔

واحمد قد صنف کتابا فی فضائل الصحابۃ ذکر فیہ ابابکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیاؓ و جماعۃ من الصحابۃ و ذکر فیہ ما روی فی ذلک من صحیح و ضعیف للتعریف بذلک ولیس کل ما رواہ یکون صحیحا (منہاج الاعتدال بین الرفض والاعتزال) [۲۱۹]

امام احمد بن حنبلؒ نے فضائل صحابہ میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں حضرات ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم اور ایک جماعت صحابہ کا تذکرہ ہے اس میں وہ صحیح و ضعیف ہر قسم کی روایتیں بغرض تعارف لے آئے ہیں۔ اس کی ہر روایت صحیح نہیں ہے۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی فضائل و مناقب میں روایت کی صحت و عدم صحت کا لحاظ نہ رکھتے تھے بلکہ ضعیف روایتیں بھی قبول کر لیتے تھے۔

پھر مسند مذکورہ پر بحیثیت مجموعی تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وکذلک فی المسند زیادات زادها ابنه عبد الله لاسیما فی مسند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فانه زاد زیادات کثیرة۔ (ص۹)

ایسے ہی مسند (امام احمد بن حنبلؒ) میں ان کے صاحبزادے عبداللہ نے اپنی طرف سے بہت سی روایتوں کا اضافہ کر دیا ہے خصوصاً مسند حضرت علی رضی اللہ عنہ میں۔

حافظ ابن کثیرؒ جن کی تاریخ مودودی صاحب کی زیر نظر کتاب کا بہت اہم ماخذ ہے۔ مسند امام احمد کے متعلق تلخیص مقدمہ ابن صلاح میں تحریر فرماتے ہیں:-

واما قول الحافظ ابی موسیٰ محمد بن ابی بکر المدینی عن مسند الامام احمد انه صحیح فقول ضعیف فان فیه احادیث ضعیفة بل موضوعة کاحادیث فضل مرو وعسقلان... وغیر ذلک مما نبه علیه الحفاظ

مسند امام احمد کے متعلق حافظ ابو موسیٰ محمد بن ابی بکر المدینی کی یہ رائے کہ وہ "صحیح" ہے ایک کمزور بات ہے کیونکہ اس میں (مسند مذکور میں) ضعیف بلکہ موضوع روایتیں بھی ہیں مثلاً مرو اور عسقلان کی فضیلت کی روایتیں وغیرہ جس پر حفاظ حدیث نے تنبیہ کی ہے۔

ص۲۷

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بستان المحدثین میں تحریر فرماتے ہیں:-

و امام احمد این کتاب بطریق بیاض جمع میکرد و ترتیب و تہذیب او از ان امام بوقوع نیامد

اور امام احمدؒ نے یہ کتاب (مسند) بطور بیاض (یادداشت) لکھی تھی اور اس کی ترتیب تہذیب

بلکہ بعد از وی پسرش عبداللہ بہ ترتیب آن پرداختہ لیکن در آنجا خطاہائے بسیار کردہ مدنیاںؓ را در شامیان درج کردہ و بالعکس (بستان المحدثین)	نہیں کی تھی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے عبداللہ نے اسے مرتب کیا ہے اور اس میں بکثرت غلطیاں کی ہیں (مثلاً) مدنیوں کو شامیوں میں درج کر دیا علی ہذا اس کے برعکس

مسند امام احمد بن حنبل حدیث کی کتاب ہے تاریخ نہیں ہے اس کے مستند ہونے میں بھی کلام نہیں ہے لیکن اوپر کی سطروں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ بخاری و مسلم و موطا وغیرہ کی طرح محض اس کا حوالہ دیدینا کسی روایت کی صحت و مقبولیت کی ضمانت نہیں ہے، اس کی وہ روایتیں جو صحاح ستہ کے مطابق نہیں ہیں یا ان میں موجود نہیں ہیں، اصول روایت و درایت پر پرکھ ہی کر قبول کی جا سکتی ہیں۔

یہ حال ان کتابوں کا ہے جنہیں مودودی صاحب نے تاریخ اسلام کی مستند ترین کتابیں کہا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ کا تذکرہ ضمناً آگیا، مودودی صاحب کی کتاب کا یہ کوئی اہم ماخذ نہیں ہے۔ باقی کتابوں میں سے کسی کو صحیح معنی میں مستند بھی نہیں کہا جا سکتا چہ جائیکہ مستند ترین۔ ان سب میں سچ کے ساتھ جھوٹ اور افترا کے ایسے انبار لگا دیئے گئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت کی نظر میں ان کی وقعت گر جاتی ہے۔ ابن الاثیر، ابن اثیر، استیعاب وغیرہ کی ضخیم و جسیم جلدیں دیکھ کر راقم السطور کے دل میں ان کے مصنفین کے لئے جذبۂ مدح و ستائش کے بجائے دعائے عفو و مغفرت کا میلان پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس شدید غلطی کو معاف فرمائیں انہوں نے دشمنان دین کے لئے نادانستہ طور پر خاصا مواد فراہم کر دیا ہے، آج اسی گندے پانی کی چھینٹیں اڑا کر شیعہ اور ان کے ساتھ مستشرقین ہمارے دامن کو داغدار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، نہ معلوم کتنے سادہ لوح شیعوں اور دیگر

اہل باطل کی گھڑی ہوئی سراپا کذب و دروغ روایتوں کو پڑھ کر ان کے اثر سے دل کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہو کر مستحق عذاب نار بنتے ہیں۔ کاش یہ کتابیں نہ لکھی جاتیں، اور اگر لکھی جاتیں تو ان کے مصنفین حضرات محدثین کی اتباع کر کے روایات کے بارے میں صحیح روش اختیار کرتے اور مصالح و مفاسد امت سے اس درجہ بے خبری کا ثبوت نہ دیتے۔ سچ یہ ہے کہ علم ہو مگر اس کے ساتھ حکمت و تفقہ معتد بہ درجہ میں موجود نہ ہو تو صورت حال بہت خطرناک ہو جاتی ہے، ایسی ہی صورت حال کے متعلق مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ظالم آن قومیکہ چشمان دوختند

وز سخنہا عالمے را سوختند

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ مودودی صاحب کی اس کتاب میں العقد الفرید اور کتاب الاغانی جیسی کتابوں کے حوالے بھی ملتے ہیں تعجب ہے کہ مولانا نے الف لیلہ کا حوالہ کیوں نہ دیا؟ ہر صاحب علم یہ جانتا ہے کہ یہ ادبی کتابیں ہیں تاریخ کی کتابیں نہیں ہیں۔ روایات کی صحت و صداقت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے بازاری قصے مجلسی گپیں سب کچھ اس میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ تاریخی واقعات کے بارے میں ان کا حوالہ حیرت انگیز ہے۔

جن مورخین کے متعلق ہم دکھا چکے ہیں کہ انہوں نے دور صحابہ، دور بنی امیہ یعنی دو ڈھائی صدی کے واقعات نقل کرنے میں بڑی بے احتیاطی سے کام لیا ہے اور اپنی کتابوں کا سارا مواد ابن اسحاق واقدی و طبری جیسے غیر معتبر لوگوں سے اکٹھا کیا ہے، ان سے اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے عباسی دور کے واقعات بیان کرنے میں احتیاط سے کام لیا ہو گا؟ اس لئے عباسیوں کے متعلق بھی ان کتابوں کو احتیاط کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔

باب[1] اوّل[1] و دوّم[2]

مولانا مودودی صاحب کتاب کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اس کتاب کا موضوع بحث یہ ہے کہ اسلام میں خلافت کا حقیقی تصور کیا ہے، کن اصولوں پر وہ صدر اول میں قائم ہوئی تھی، کن اسباب سے وہ ملوکیت میں تبدیل ہوئی، کیا نتائج اس تبدیلی سے رونما ہوئے، اور جب وہ رونما ہوئے تو ان پر امت کا ردعمل کیا تھا"

"ان امور کی توضیح کے لئے میں نے سب سے پہلے قرآن مجید کی ان تمام آیات کو جن سے سیاست کے بنیادی مسائل پر روشنی پڑتی ہے ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے تاکہ ناظر کے سامنے بیک وقت اسلامی حکومت

---

[1] یعنی مودودی صاحب کی زیر تبصرہ کتاب کے باب اول و دوم کا جائزہ۔

کا وہ نقشہ آجائے جسے کتاب الٰہی قائم کرنا چاہتی ہے۔
دوسرے باب میں یہ بتایا ہے کہ قرآن و سنت اور اکابر صحابہ کے اقوال سے ہم کو اصول حکمرانی کیا معلوم ہوتے ہیں۔
تیسرے باب میں خلافت راشدہ کی وہ امتیازی خصوصیات بیان کی ہیں جو تاریخ سے ثابت ہیں۔ اس کے بعد ایک باب میں ان اسباب سے بحث کی ہے جو خلافت سے ملوکیت کی طرف انتقال کے موجب ہوئے اور تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ تبدیلی کس تدریج سے ہوئی۔ پھر دو مستقل ابواب اس بحث کے لئے مخصوص کئے ہیں کہ خلافت و ملوکیت کے درمیان حقیقی فرق کیا ہے، کیا تغیرات تھے جو خلافت کی جگہ ملوکیت کے آجانے سے واقع ہوئے، کس طرح خلافت راشدہ کا زوال مسلمانوں میں مذہبی تفرقوں کی ابتدا کا موجب ہوا اور کیا مسائل ان تفرقوں سے پیدا ہوئے۔
اس کے بعد میں نے یہ بتایا ہے کہ نظام ریاست کی اس تبدیلی نے مسلمانوں کی زندگی میں جو رخنے ڈال دیئے تھے انہیں بھرنے کے لئے علمائے امت نے کیا کوششیں کیں اور اس سلسلہ میں نمونے کے طور پر امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے کام کو پیش کیا ہے۔"

یہ ہے مودودی صاحب کی کتاب کا اجمالی خاکہ جو خود انہیں کے الفاظ میں ہم نے پیش کیا ہے باب ثالث تک جو کچھ موصوف نے تحریر فرمایا ہے اس کی حیثیت درحقیقت محض تمہید کی ہے اس لئے کہ اس مسئلہ مودودی صاحب کے سامنے (جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے) یہ ہے کہ نظام خلافت، نظام ملوکیت میں کیسے تبدیل ہو گیا۔ اس سلسلہ میں ان کے سامنے دو بحثیں تھیں ایک

تو یہ ثابت کرنا کہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی دوسری یہ کہ اس کے اسباب کیا ہوئے؟ ان دونوں بحثوں کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک نظامِ خلافت کا تصور پیش نظر نہ ہو اس وجہ سے اس بحث کی ضرورت پیش آئی اس لئے ہمیں بھی اس کے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے، درحقیقت ہمیں تو اصل تعلق انہیں ابواب سے ہے جن میں صحابہ کرام پر جرح و قدح کی گئی ہے۔ اس بات کے عرض کرنے سے اس واقعہ کا اظہار بھی مقصود ہے کہ مودودی صاحب نے نظامِ خلافت کا جو خاکہ اس کتاب میں پیش کیا ہے، اس کے پیش کرنے میں بہت ہوشیاری کے ساتھ اس کی اس حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے اور اسے اس طرز پر پیش کیا ہے کہ آئندہ ابواب میں صحابہ کرام، اموی و عباسی خلفا سے اسلام پر طعن و جرح کرنے میں آسانی و سہولت ہو۔ ان ابواب کو باب چہارم و پنجم سے ملا کر دیکھئے تو صاف نظر آتا ہے کہ مندرجہ بالا ابتدائی ابواب سے خلافتِ اسلامیہ کا صحیح تصور پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ قاری کے ذہن کو ان مطاعن و اعتراضات کے لئے تیار اور ہموار کرنا پیش نظر ہے جو آئندہ ابواب میں انہوں نے کئے ہیں، جب ہم ان مطاعن و اعتراضات کے جوابات دیں گے تو یہ بات خوب روشن ہو جائے گی لیکن یہاں بھی بطور نمونہ مودودی صاحب کے اس طرزِ عمل پر روشنی ڈالدینا انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا۔

نظامِ خلافت کا خاکہ پیش کرنے میں مودودی صاحب نے آیات و احادیث سے بھی استشہاد و استنباط کیا ہے اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کو بھی پیش کیا ہے لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں کی ہے کہ حجت و ماخذ ہونے کے لحاظ سے ان کے درمیان مراتب و درجات کا کیا فرق ہے؟ اس لئے ناواقف قاری کے ذہن پر یہ اثر پڑتا ہے کہ سب ماخذ یکساں ہیں جس طرح آیات و احادیث کے منصوص احکام پر عمل کرنا کسی خلیفہ پر فرض ہے، اسی طرح حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے نمونے کی مکمل پیروی بھی اس پر فرض ہے، ظاہر ہے کہ جس شخص

کے ذہن پر یہ اثر ہوگا کہ وہ جب کسی با اقتدار ہستی کو اس نمونے کی پیروی میں ذرا سی بھی کوتاہی کرتا ہوا پائے گا۔ اسے وہ خلیفہ کے بجائے مودودی صاحب کا اصطلاحی "ملک" قرار دے گا۔ مثلاً جب وہ حضرات ابوبکر و عمر و علی رضی اللہ عنہم کا طرز عمل یہ دیکھے گا کہ ان کا ذاتی معیار زندگی بہت پست اور ادنیٰ درجہ کا تھا تو وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ضرور بدظن ہوگا۔ اس لئے کہ ان کا معیار زندگی ان حضرات کے معیار زندگی سے بہت بلند تھا، حالانکہ اصولاً کسی خلیفہ کے لئے واجب و لازم نہیں ہے کہ اسی معیار زندگی کی پیروی کرے۔ اسے شرعاً استحباب ہی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے دیگر خلفائے اسلام سے نفرت پیدا کرنے کی یہ ایک نفسیاتی تدبیر ہے۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اصول حکمرانی کے بیان میں بھی مولانا نے ابہام سے کام لے کر ذہنوں کو اعتراضات قبول کرنے کے لئے تیار کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً "شوریٰ" کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس ریاست کا پانچواں اہم قاعدہ یہ تھا کہ سربراہ ریاست کو مسلمانوں کے مشورے سے اور ان کی رضامندی سے مقرر ہونا چاہئے" ص ۹۹

بات بالکل صحیح ہے مگر مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے لئے سب مسلمانوں کا فیصلہ شرط ہے یا اکثریت کا فیصلہ کافی ہے؟ اسی طرح عوام سے مشورہ لازم ہے یا صرف خواص اور زعماً قوم کی اکثریت کا فیصلہ کافی ہے؟ یہ ابہام اس لئے رکھا گیا ہے کہ مطاعن کے باب میں اسے حسب منشائے معنی پہنا کر استعمال کیا جا سکے۔ جیسا کہ آپ ان ابحاث میں انشاء اللہ ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس طرح کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیے "اجتماعی خلافت" کے عنوان کے ماتحت تحریر

فرماتے ہیں :۔

"اس جائز اور صحیح نوعیت کی خلافت کا حامل کوئی شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جماعت اپنی مجموعی حیثیت میں ہوتی ہے جس نے مذکورۂ بالا اصول کو تسلیم کرکے اپنی ریاست قائم کی ہو۔" (ص ۳۵)

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیارات خلافت سلب کرکے انہیں اپنے اندر مرکوز کرلینے کا حق نہیں ہے۔" (ص ۳۶)

لیکن مودودی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس اجتماعی خلافت کی ان کے پیش کردہ تصور کے مطابق عملی شکل کیا ہوگی ؟ کیا ہر فرد کو وہی اختیارات وحقوق حاصل ہوں گے جو خلیفۃ المسلمین کو حاصل ہوتے ہیں ۔ ہر مزدور، تاجر، صناع کو وہی اختیار واقتدار حاصل ہوگا جو نائبین خلیفہ مثلاً ، وزراء ، امراء ، گورنروں اور ان کے ماتحت افسروں اور عاملوں کو حاصل ہوتا ہے ۔ اگر مودودی صاحب کی مراد یہی ہے تو گزارش یہ ہے کہ نہ اسلام نے اس قسم کی خلافت کی تعلیم دی ہے اور نہ دنیا میں کوئی حکومت اس طرز پر قائم ہوسکتی ہے ؛ اور اگر یہ مراد نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ خلیفہ کسی مخصوص خاندان ہی سے ہوگا اور اگر قوم میں متعدد طبقات ہیں تو اس کا تعلق بھی کسی خاص طبقہ ہی سے ہوگا ۔ اگر اس کا نام "خلافت کو خاندان یا طبقہ میں مرکوز" کردینا ہے تو ارشاد ہو کہ اس سے مفر کی کیا صورت ہے ؟

مزید عرض یہ ہے کہ خلیفہ کے تقرر میں علمی ، ذہنی ، جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے خاص اہلیتوں کا لحاظ کرنا لازم ہے ۔ اسی طرح عمال حکومت کے لئے بھی اہلیت کا کوئی خاص معیار تو ہونا ضروری ہے ۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا کہ سوسائٹی میں

اس کا وقار قائم ہو سکے اس کے لئے بعض اوقات خاندان، برادری یا وطن وغیرہ کی رعایت بھی کرنا پڑے گی، تو کیا یہ سب، خلافت کو خاندان یا طبقہ میں، مرکوز، کرانے کے مرادف اور شریعت مقدسہ کے خلاف ہے؟

اگر ایسا ہے تو "الائمۃ من قریش" کے کیا معنی ہیں؟ یہ حکم دائمی نہ سہی لیکن وقتی طور پر تو اس پر عمل ہوا، سقیفہ بنو ساعدہ میں اس سے استدلال فرمایا گیا اور اسی کے مطابق عمل ہوا۔ اسی طرح صحابہ کرام اس بات کے قائل تھے کہ خلیفہ مہاجرین میں سے ہونا چاہئے یہ خلافت کو ایک طبقہ میں مرکوز کرنا ہوا یا نہیں؟ "لیستخلفنہم فی الارض" سے مودودی صاحب کا اپنے مدعا پر استدلال بالکل غلط ہے۔ اس قسم کی نعمتوں کی نسبت پوری قوم کی جانب اس لئے کی جاتی ہے کہ اس نعمت کے فوائد سب کو پہنچتے ہیں، چونکہ نعمت خلافت کے منافع پورے اجتماع کو حاصل ہوتے ہیں اس لئے استخلاف کو پوری قوم کی طرف منسوب فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح خلافت کی وجہ سے جو وقار اور اعزاز حاصل ہوتا ہے وہ بھی پوری قوم کو حاصل ہوتا ہے اور پوری قوم دنیا کی نظر میں معزز و ممتاز ہو جاتی ہے۔ اس بناء پر بھی استخلاف کی نسبت ضمیر جمع یعنی پوری قوم کی طرف کی گئی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عملاً ہر شخص خلیفۃ المسلمین ہو جائیگا اس کے نظائر قرآن مجید میں بکثرت مل سکتے ہیں۔ مثلاً بنو اسرائیل سے فرمایا گیا ہے "وجعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا" اور تم میں ہم نے نبی پیدا کئے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہر فرد کو بادشاہ بنا دیا گیا تھا۔

مصنف کو درحقیقت حضرت عثمان و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما پر اعتراض و طعن قبول کرنے کے لئے قاری کے ذہن کو ہموار کرنا مقصود ہے اس کے لئے انہوں نے نہ صرف ابہام سے کام لیا بلکہ خلافت اسلامیہ کی اجتماعیت کی غلط تعبیر کرنے سے بھی نہیں چوکے

انہیں حضرت عثمانؓ پر یہ اعتراض کرنا تھا کہ انہوں نے اپنے خاندان والوں کو اعلیٰ مناصب دیئے اور حضرت معاویہؓ پر یہ اعتراض کرنا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو ولی عہد بنا کر بے ضابطگی برتی دونوں صورتوں کے عدم جواز کی کوئی دلیل شرعی انہیں نہیں مل سکی تو انہوں نے خلافت کو مرکوز کرنے کا ایک جدید عیب نکالا تاکہ اعتراض کی کوئی بنیاد مل سکے اور قاری کا ذہن پہلے سے اس سے متاثر ہوجائے تاکہ اعتراض کے موقع پر بغیر کسی استدلال کے وہ اسے قبول کرلے۔

اسی طرح کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمایئے۔ زیر عنوان "اہل الامر" کی صفات تحریر فرماتے ہیں۔

(ب) "یہ کہ وہ ظالم، فاسق و فاجر، خدا سے غافل اور حد سے گذر جانے والے نہ ہوں بلکہ ایمان دار خدا ترس اور نیکو کار ہوں۔
کوئی ظالم یا فاسق اگر امارت یا امامت کے منصب پر قابض ہوجائے تو اس کی امامت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے" ص۳۸

لیکن یہ نہیں تحریر فرماتے کہ نیکو کاری کا وہ معیار کیا ہے جس پر اسے پورا اترنا ضروری ہے اور فسق و فجور کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ اس کی امارت باطل ہونے کے کیا معنی ہیں؟ مسلح بغاوت کا جواز؟ یا محض سول نافرمانی کا حکم؟

مودودی صاحب نے اپنی تائید میں حاشیہ پر علامہ ابوبکر جصاص حنفی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"اس آیت کی دلالت سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے اور وہ خلیفہ نہیں ہوسکتا اور اگر اپنے آپ کو اس منصب پر مسلط کردے تو لوگوں پر اس کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم نہیں ہے۔" (ص۳۹ حاشیہ)

شاید امامت باطل ہونے کا مفہوم یہ ہو کہ اس کی اتباع و اطاعت عوام پر لازم نہ رہے گی لیکن سوال یہ ہے

کہ عوام علی الاطلاق اس کی اطاعت سے سبکدوش ہو جائیں گے، یا صرف اس کے ناجائز احکام میں اطاعت لازم نہ رہے گی؟ اگر پہلی شکل مراد ہے تو یہ بالکل بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے اور اگر دوسری شکل مراد ہے تو یہ فاسق امام کی کوئی خصوصیت نہیں ہے اگر کوئی صالح امام بھی کسی ناجائز کام کا حکم دے تو اس کے اس حکم کو ماننا جائز نہ ہوگا۔

یہاں ان مسائل کو مبہم رکھنے سے مودودی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ آگے چل کر اکثر خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کو چند واقعات دکھا کر ظالم و فاسق کا لقب دے دیا جائے اور ان کے زمانے میں ان کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں ان سب کو علی الاطلاق جائز قرار دیا جائے آئندہ ابواب میں انہوں نے یہی کیا ہے۔ اور زیر نظر سطروں میں اس کے لئے زمین ہموار کی ہے۔

یہ چند نمونے ہیں جن سے صاف طور پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان ابواب میں مودودی صاحب کو نظام خلافت کی تشریح مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا اصل مقصد ذہنوں میں ان مطاعن کی تخم ریزی کرنا ہے جو انہوں نے آئندہ صفحات میں صحابہ کرام اور دوسرے لوگوں پر کئے ہیں۔ وہ قاری کا ذہن ایک خاص سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان تخریبی کارروائیوں کو آسانی کے ساتھ قبول کرلے جو اس کتاب کی جان ہیں اور اس زہر کو آسانی کے ساتھ جذب کر سکے جو اس میں صحابہ کرام اور دوسرے حضرات کے خلاف صفحات کتاب پر پھیلایا گیا ہے۔ اسے تصنیفی آرٹ کا اچھا نمونہ تو کہا جاسکتا ہے لیکن علمی تحقیق سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ان کے علاوہ بھی نظام خلافت کی تشریح میں مولانا سے متعدد غلطیاں ہوئی ہیں بطور نمونہ ایک دو ملاحظہ فرمائیے:

۳۲ پر ولا یعصینك فی معروف کے ترجمہ میں معروف کا ترجمہ جائز کیا ہے لکھتے ہیں "اور کسی جائز حکم میں تمہاری نافرمانی نہ کریں"

سوال یہ ہے کہ کیا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم ناجائز بھی ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو حکم کو جائز کے ساتھ مقید کرنے کے کیا معنی ہیں؟

سوال بالکل فطری ہے۔ مولانا کو بھی چند صفحات لکھنے کے بعد اس کا احساس ہوا اس لئے ص۱۱۹ پر یہی آیت نقل کر کے معروف کا ترجمہ معروف ہی کیا ہے اور گذشتہ غلطی کو نبھانے کے لئے یہ نکتہ ذکر فرمایا ہے:۔

• قرآن مجید میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو بھی اطاعت فی المعروف کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے حالانکہ آپ کی طرف سے کسی معصیت کا حکم صادر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" (ص۱۱۹)

یہ نکتہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" کا مصداق ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوتے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی مشروط طریقے سے لازم ہے حالانکہ ہر وہ شخص جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ آنحضور کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے شرط لگانا ایمان بالرسالۃ کے منافی ہے اس کے علاوہ جب جواز و عدم جواز کا معیار ہی یہ ہو کہ جس کام کو لسان نبوی جائز کہدے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز ہے تو پھر جواز کی شرط کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں؟

دراصل مودودی صاحب کا آیت سے استشہاد بے محل ہے اور اس کی تشریح بھی انہوں نے غلط کی ہے۔ معروف کے معنی جائز کے نہیں ہیں، معروف عرف شرع میں ان امور کے لئے استعمال ہوتا ہے جن کا جواز یا جن کی خوبی جانی بوجھی ہوئی ہو اور ان کے حکم کے بارے میں معتد بہ خفا نہ ہو۔ ہر جائز چیز معروف نہیں ہوتی ہے۔ البتہ معروف کا کم از کم حدود جواز میں داخل ہونا ضروری ہے۔ معروف کا مقابل "منکر" ہے "ناجائز" نہیں ہے۔ منکر ایسے کام کو کہتے ہیں جس کا عدم جواز یا قبیح ہونا۔ جانا پہچانا ہوا ہو۔ آیت میں بیعت کے لئے چند امور کا تذکرہ،

منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ معروف باتوں میں آپ کی نافرمانی نہ کریں جس کا مقصد مستورات کے لئے سہولت پیدا کرنا ہے یعنی وہ واضح احکام میں تو نافرمانی سے پرہیز کرنے کا التزام کریں اگر اس کے خلاف کریں گی تو یہ نقض بیعت کے مرادف ہو گا لیکن غیر معروف احکام کے بارے میں اگر غلط فہمی اور نقص عقل کی وجہ سے ان سے کوئی بات خلاف حکم نبوی سرزد ہو جائے تو اسے نقض بیعت اور بدعہدی کا ارتکاب نہ کہا جائے گا۔ اگرچہ اسے ناجائز ہی کہا جائیگا۔ مولانا نے جو نکتہ نکالا ہے اس سے تو آیت مقدسہ کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اسی قسم کی غلطی کا ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو۔ دستور کے بنیادی اصول کا عنوان قائم فرما کر متعدد اصول ذکر فرما رہے ہیں۔

منجملہ ان کے ایک اصول کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں :-

- علاوہ بریں یہ منتظمہ لازماً شوریٰ یعنی انتخاب کے ذریعہ سے وجود میں آنی چاہیئے اور اسے شوریٰ یعنی باہمی مشاورت ہی کے ساتھ کام کرنا چاہیئے، جیسا کہ پیراگراف ۱۳ میں بیان کیا جا چکا ہے (ص ۲۲۲)

پیراگراف ۱۳ میں مودودی صاحب نے آیۃ کریمہ وامرھم شوریٰ بینھم (اور مسلمانوں کا کام آپس میں مشورے سے چلتا ہے) سے استدلال فرمایا ہے لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ منتظمہ کا قیام بھی انتخاب کے ذریعہ سے ہونا لازم ہے؟ اگر لفظ - امر - کے عموم سے استدلال کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا روزمرہ کا ہر کام مشورے سے ہونا ضروری ہے حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ جن امور میں مشورہ لازم ہے، ان میں مجلس منتظمہ کا قیام بھی داخل ہے؟ کیا خلیفہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ بغیر انتخاب محض اپنی رائے سے اپنے مشیر اور اپنی مجلس منتظمہ (EXICUTIVE COMMITTE) کے

ارکان کو چن لے۔

اور اگر بالفرض ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ ارکان منتظمہ کو شوریٰ کے بعد مقرر کرنا لازم ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس کا باقاعدہ انتخاب (ELECTION) ہونا چاہئے؟ یہ صورت بھی تو ممکن ہے کہ خلیفہ ایک دو آدمیوں سے مشورہ کرکے ارکان مجلس منتظمہ کو مقرر کرے۔ آیت تو شوریٰ یعنی مشورے کی تعلیم دے رہی ہے نہ کہ انتخاب (الکشن) یا استصواب رائے عامہ کی آیت سے انتخاب (الکشن) پر استدلال عجیب و غریب استدلال ہے جو بالکل ناقابل فہم ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے اس مسئلہ میں دستور کی بالکل غلط ترجمانی کی ہے۔ کسی دلیل سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ ارکان مجلس منتظمہ کا انتخاب ضروری ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت ہے کہ خلیفہ کو پورا اختیار ہے کہ ارکان مجلس منتظمہ کو "اجتباء" (SELECTION) کے ذریعہ سے متعین کرے۔

خلفائے اربعہ کے ادوار خلافت میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ جو حضرات انتظامی معاملات میں خلیفہ کے مشیر تھے، ان کا انتخاب ہوا ہو، پھر یہ کہنا بھی کہ "اسے شوریٰ یعنی باہمی مشاورت ہی کے ذریعہ سے کام کرنا چاہئے۔ وجوب کا مفہوم رکھتا ہے یا محض استحباب کا۔ اگر وجوب مراد ہے (اور بظاہر لفظ "چاہئے" اسی پر دال ہے) تو یہ بھی مودودی صاحب کا اختراع کردہ اصول ہے جس کی کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے گذارش کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک انتظامی اختیارات کا تعلق ہے خلیفہ پر شریعت نے یہ پابندی نہیں عائد کی ہے کہ وہ اپنے ہر اقدام پر مشورہ ضرور کرے۔ ایسے امور بھی نکل سکتے ہیں جن میں مشورہ لازم ہو اور ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں مشورے کی احتیاج نہ ہو۔ یہ معاملہ بہت کچھ خود خلیفہ کے صوابدید پر موقوف ہے بعض امور میں پبلک بھی اس سے مشورے کا مطالبہ کرسکتی ہے بہرکیف جو کلیہ مودودی صاحب نے قائم کیا ہے وہ محض

ان کا وضع کردہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

غور فرمائیے تو بعض اہم واقعات مصنف کے اس اختراعی اصول کے خلاف شہادت دے رہے ہیں، کوئی بتائے کہ جیش اسامہؓ بھیجنے کے بارے میں صدیق اکبرؓ خلیفہ اول نے کس سے مشورہ کیا تھا؟ علی ہذا قتال مرتدین وقتال مانعین زکوٰۃ کے بارے میں کون سی مجلس مشاورت منعقد کی تھی؟ بلکہ اس کے برعکس ان امور کے بارے میں بکثرت صحابہ کرام (جن میں فاروق اعظمؓ کی ایسی جلیل القدر ہستی بھی تھی) کے بلاطلب مشورے کو سختی کے ساتھ رد فرما دیا تھا۔

مودودی صاحب نے ان مباحث میں آیات قرآنیہ کا استعمال بعض مقامات پر بالکل بے محل فرمایا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو۔

" بنیادی حقوق " کا شمار کراتے ہوئے ان میں " ضمیر واعتقاد کی آزادی کا حق " ذکر کرتے ہیں۔ اس پر استدلال آیت قرآنیہ لا اکراہ فی الدین (دین میں جبر نہیں ہے ص۲۴) سے فرماتے ہیں۔ آیت سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جا سکتا اور وہ اپنے اعتقادات کے بارے میں بالکل آزاد ہوگا۔ لیکن کیا مسلمان کو بھی ضمیر و اعتقاد کی ایسی ہی آزادی اسلامی حکومت میں حاصل ہوگی؟ کیا کسی مسلمان کو ملحد و زندیق اور مرتد ہو جانے کی آزادی ہوگی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس آیت سے علی الاطلاق اسلامی حکومت میں پبلک کے لئے ضمیر و اعتقاد کی آزادی پر استدلال کرنا سمجھ میں نہیں آتا کہ اجتہاد و استنباط کی کون سی قسم ہے۔ اسی طرح والفتنۃ اشد من القتل سے اس بنیادی حق کا استنباط کی عجیب و غریب استنباط ہے جس کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔

صفحہ ۴۶ پر آزادی اجتماع کا استنباط بھی اسی طرز کا ہے آیۂ مقدسہ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر الآیۃ (آل عمران ۱۰۴-۱۰۵) کو آزادی اجتماع سے کوئی بھی واسطہ نہیں

ہے۔ قرآن مجید کو دیکھئے تو آیت یہ بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کرنا چاہئے اور تفرق و اختلاف سے بچنا چاہئے۔ وہ نہ اجتماع کی آزادی دے رہی ہے نہ اسے ممنوع قرار دے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ دستور سیاسی میں آزادی اجتماع کے معنی یہ ہیں کہ جلسہ جلوس وغیرہ کی آزادی ہو۔ آیت کو اس سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ تفرق و اختلاف مذکور ہر حالت میں ممنوع ہے خواہ کسی جلسے اور اجتماع میں کیا جائے یا کوئی شخص گھر میں بیٹھکر اپنے قول یا قلم سے اسے ظاہر کرے۔ اجتماع کے ساتھ اسے کوئی بھی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ علی ہذا امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی اجتماع سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتا ہے۔

بطور نمونہ یہ چند غلطیاں میں نے پیش کر دی ہیں ورنہ اس قسم کی لغزشیں اور بھی ہیں۔ جنہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب اسلامی دستور خلافت کو کما حقہ سمجھے ہی نہیں ہیں تعجب ہے کہ جس چیز کی تبلیغ وہ تقریباً تیس ۳۰ سال سے کر رہے ہیں اس سے پورے طور پر واقف بھی نہیں ہیں۔

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"
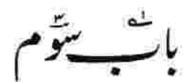
باب سوم میں مودودی صاحب نے خلافت راشدہ اور اس کی خصوصیات کا عنوان قائم کر کے خلفائے اربعہ کی خلافت کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ وہ کس طرح خلیفہ ہوئے اور نظام خلافت کے متعلق ان کے تصورات کیا تھے۔

اس باب میں انھوں نے ایک طرف تو صحابہ کرام پر طعن و تشنیع کے لئے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی ہے، دوسری طرف طعن و تشنیع کا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ طعن و تشنیع کا جواب تو انشاء اللہ آپ کچھ دیر کے بعد ملاحظہ فرمائیں گے۔ پہلے میں اس چیز پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ مودودی صاحب نے اس سلسلہ میں مغالطے دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ اگر ان مغالطوں کی قلعی نہ کھولی جائے تو پڑھنے والوں کی غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ اس پردہ دری سے موصوف کی اس فتنہ انگیز کتاب

ملہ یعنی مودودی صاحب کی زیر تبصرہ کتاب کے تیسرے باب کا جائزہ۔

کی بے وزنی بھی نمایاں ہو جائے گی، اور یہ واضح ہو جائے گا کہ ناشر یا اور کسی کی تحسین ناشناس اور کورانہ تقلید کرنے والوں کی داد و آفرین سے خزف ریزہ گوہر نہیں ہو جاتا۔

پہلا مغالطہ

مودودی صاحب نے خلفائے اربعہ کی خلافت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا وہ مفہوم خلافت کی واحد مصداق ہے۔ اس طرز میں ذرا سی بھی تبدیلی ہو جائے تو خلافت کے بجائے ملوکیت سامنے آجاتی ہے۔ گویا موصوف اس درجہ سے نیچے اتر کر کسی خلافت کے وجود کے قائل نہیں ہیں۔ یہ پہلا مغالطہ ہے جو مصنف دینا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرات خلفائے اربعہ کی خلافت اس کا ایک اعلیٰ اور بلند پایہ نمونہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک کوئی حکومت از سرتا پا اس کے مشابہ نہ ہو اس وقت تک اسے خلافت ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر تصور خلافت کا اصل جوہر موجود ہے تو خلافت کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ان امور کے فقدان سے جو اصل جوہر و حقیقت کے اجزاء نہیں ہیں بلکہ اس سے خارج ہیں۔ اس کے درجہ و مرتبہ میں فرق تو پڑ سکتا ہے بشرطیکہ وہ عوارض بھی ضروری ہوں لیکن اسے ملوکیت نہیں کہا جا سکتا۔

بطور مثال اس واقعہ پر نظر کیجئے کہ ہر عالم دین غزالی و رازی کا ہم پلہ نہیں ہوتا لیکن کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ ان حضرات کے درجہ کو نہیں حاصل کر سکا علمائے دین کے زمرے سے خارج کر دیا جائے گا؟ کتنے مسلمان ہیں جو حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی اور حضرت مجدد الف ثانی وامثالہم کے دینی معیار پر پورے اتر سکتے ہیں، تو کیا وہ سب دائرہ اسلام سے خارج ہیں؟

بات بالکل صاف ہے جسے جمہور مسلمین اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور وہ بنوامیہ و بنوعباس کے حکمرانوں بلکہ سلاطین ترکی کو بھی خلفاء ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور صرف عوام کا نہیں

بلکہ علمائے اسلام کا بھی طرز عمل یہی رہا ہے۔ لیکن مودودی صاحب ان سب کو مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ خلافت کا زمانہ حیات بہت قلیل تھا۔ اس کے بعد ملوکیت ہی کا دور دورہ رہا۔

دوسرا مغالطہ

انتخابی منصب کے عنوان کے ماتحت مودودی صاحب نے حضرات خلفائے اربعہ کے طرز انتخاب کا مختصر بیان کیا ہے، اس کے بعد اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

"ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحاب رسول کا متفق علیہ تصور یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے، جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے۔ موروثی یا طاقت سے برسرِ اقتدار آنے والی امارت ان کی رائے میں خلافت نہیں بلکہ بادشاہی تھی صحابہ کرام خلافت اور بادشاہی کے فرق کا جو صاف اور واضح تصور رکھتے تھے اسے حضرت ابوموسیٰ اشعری ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

ان الامرۃ ما اؤتمر فیہا وان الملک ما غلب علیہ بالسیف

امارت۔ (یعنی خلافت) وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے قبضہ کیا گیا ہو (صفحہ ۸۶ و ۸۷)

عبارت مذکورہ میں لفظ موروثی تشریح طلب ہے، ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ دستور حکومت حکمران کے بعد اس کے بیٹے کی تخت نشینی کو لازم قرار دے رہا ہو، جیسا کہ اس وقت انگلستان یا جاپان میں ہے۔ یہ شکل تو واضح طور پر موروثی سلطنت کی ہے۔

لیکن اگر باپ اپنے سامنے بیٹے کے لئے پبلک کی رائے طلب کرتا ہے اور پبلک کے نمائندے دیکھ

مشورے اور ان کے اتفاق سے اسے ولی عہد مقرر کر دیتا ہے یا زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا دیتا ہے تو کیا اسے بھی موروثی امارت کہا جائے گا۔؟

تیسری شکل یہ ہے کہ خلیفہ اپنے بیٹے کو ولی عہد تو نہ بنائے لیکن اپنے بعد اس کی خلافت سے مانع بھی نہ ہو، اور دوسرے لوگ اسی کو اس کا جانشین بنا دیں اور وجوہ ترجیح میں ایک وجہ یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ یہ خلیفۂ سابق کا بیٹا ہے۔ کیا یہ شکل بھی موروثی امارت کے ذیل میں داخل ہے؟

مودودی صاحب نے موروثی امارت کا لفظ تو استعمال کیا مگر یہ نہیں بتایا کہ اس سے کیا مراد ہے اور موروثی امارت کس چیز کا نام ہے؟ اس طرح قاری کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ہر ایسی حکومت جس میں باپ کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین ہو جاتے، موروثی امارت میں داخل ہے، حالانکہ یہ چیز بالکل خلاف حقیقت ہے۔ اگر مشورہ اور استصواب کے بعد کوئی شخص اپنے بیٹے کو اپنا جانشین اور ولی عہد بناتا ہے تو اسے موروثی امارت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ علیٰ ہذا اگر خلیفہ کے بعد اصحاب شوریٰ اس کے بیٹے ہی کو منتخب کر لیں تو اسے بھی موروثی امارت نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح باپ کے بعد بیٹے کا حکمران بن جانا فی نفسہٖ موروثی امارت کے ذیل میں نہیں آتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے مگر اسے کوئی بھی موروثی امارت نہیں کہتا ہے نہ کہہ سکتا ہے۔

نصب خلیفہ کے بارے میں حضرات خلفائے راشدین کا جو طرز عمل مودودی صاحب نے نقل کیا ہے، آخر اس سے کس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام خصوصاً خلفائے راشدین علی الاطلاق باپ کے بعد بیٹے کی امارت کو ناجائز سمجھتے تھے خواہ بیٹے کی جانشینی استصواب رائے اور مشورے کے بعد عمل میں آئی ہو۔

بیشک ان کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خلافت کو ایک انتخابی منصب سمجھتے تھے

مگر یہ ان کی کس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ باپ کے بعد بیٹے کی خلافت کو علی الاطلاق موروثی یا ناجائز سمجھتے تھے؟

مزید برآں مودودی صاحب نے ان کے ایک سلبی طرزِ عمل سے استدلال کیا ہے۔ محض اتنی بات تو موروثی امارت کے عدم جواز کے لئے بھی کافی نہیں ہے چہ جائیکہ ان شکلوں کے لئے جنہیں موروثی امارت کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم نے اگر کسی طریقہ کو نہیں اختیار کیا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ طریقہ ناجائز ہے بلکہ اس سے تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ حضرات اس طریقے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی خاص مصلحت کے پیشِ نظر اس طریقہ کو نہ اختیار کیا ہو لیکن فی نفسہٖ اسے جائز سمجھتے ہوں۔ دیکھئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جب حضرت حسنؓ کو ان کا جانشین بنانے کے لئے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:۔

"میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔" (صـ۸۶)

اگر وہ اس صورت کو ناجائز سمجھتے تو یقیناً یہ فرماتے کہ اس سے موروثی امارت کی بنیاد پڑے گی اس لئے یہ ناجائز ہے۔ یا یہ کہ یہ تو خلافت نہ رہے گی بلکہ بادشاہی ہو جائے گی اس لئے اس کی طرف توجہ کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ معاملے کو ان کے اختیار پر محول کر دیا۔

جب آپ سے تقرر ولی عہد کے بارے میں عرض کیا گیا تو بھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تو ناجائز ہے، یا یہ تو ملوکیت ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ "میں مسلمانوں کو اسی حالت میں چھوڑوں گا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا تھا" (صـ۸۶)

اس قول کے تو کسی لفظ سے بھی یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ ولی عہدی کو ناجائز

سمجھتے تھے۔ اس سے احتیاط اور اتباع سنت کا شوق تو ظاہر ہوتا ہے مگر یہ کسی اشارے سے بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اس کے خلاف عمل کرنے کو حرام سمجھتے تھے۔

مودودی صاحب کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جو بغض و عناد ہے وہ انہیں مجبور کر رہا ہے کہ ان پر طعن و تشنیع کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ زیر بحث صفحات میں جو سیاہی انہوں نے صرف کی ہے اس کا مقصد امیر المومنین حضرت معاویہؓ کے دامن خلافت کو داغدار کرنے کی سعی ناکام ہے۔ لیکن انہیں سمجھنا چاہیئے کہ ان کی اس تمہید سے ان کا ناپاک مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ خلفائے اربعہ کا کسی کام کو نہ کرنا ہرگز اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ کام شرعاً ناجائز ہے۔

موجودہ دور میں الکشن و استصواب رائے عامہ کا جو طریقہ رائج ہے خلفائے اربعہؓ نے اسے اختیار نہیں کیا تو کیا اس طریقہ کو ناجائز کہا جائے گا؟ ان حضرات کا طریقہ یہ تھا کہ مجلس شوریٰ کے جلسہ کی صدارت خود کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اگر اس کی صدارت کوئی دوسرا شخص کرے جیسا کہ جمہوریتوں میں نائب صدر کرتا ہے تو کیا یہ صورت ناجائز نہ ہوگی؟

لطیفہ یہ ہے کہ خود مودودی صاحب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"علاوہ بریں ان چند اصحاب کا بیعت نہ کرنا تو محض ایک منفی فعل تھا جس سے خلافت کے معاملہ میں آئینی پوزیشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا" (ص ۱۲۲)

یعنی منفی فعل استنادی نہیں ہوتا جس سے کسی چیز کا عدم جواز یا کسی شئے کی عدم صحت ثابت ہو سکے۔ لیکن یہاں مولانا اس اصول کو بالائے طاق رکھ کر خلفائے اربعہ کے منفی فعل کو دلیل بنا رہے ہیں تاکہ حضرت معاویہؓ پر طعن و اعتراض کا کوئی راستہ نکل آئے حالانکہ انہیں سوچنا چاہیئے تھا کہ جب

طرح منفی فیصل خلافت کے معاملہ میں آئینی پوزیشن پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی نئی دفعہ کو بھی وجود میں نہیں لا سکتا ۔

تیسرا مغالطہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا قول نقل کر کے جسے انہوں نے دیگر صحابہ کی رائے کی تعبیر و ترجمانی قرار دیکر ان حضرات کا متفقہ فیصلہ قرار دیا ہے قاری کو سخت مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔ مودودی صاحب نے اس قول کے اجمال سے فائدہ اٹھا کر خلیفہ برحق حضرت امیر معاویہؓ پر زبان طعن دراز کرنے کے لئے ذہن ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا تلوار کی قوت سے کام لینا علی الاطلاق ہر حالت میں خلافت کو "ملوکیت" بنا دیتا ہے؟ اور کیا حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے قول کا یہی مطلب ہے؟ کیا فرماتے ہیں مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات صورت ذیل میں کسی اسلامی مملکت میں دو پارٹیاں ہیں ایک پارٹی نے جو اکثریت میں ہے ایک خلیفہ کا انتخاب کیا۔

دوسری پارٹی دوٹوں کی طاقت سے نہیں بلکہ تلوار کی طاقت سے اس انتخاب کو کالعدم قرار دیکر اپنی پارٹی کے ایک شخص کو خلیفہ بنانا چاہتی ہے کیا اس صورت میں خلیفہ کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ بزور شمشیر اس پارٹی کو اپنی خلافت تسلیم کرنے پر مجبور کرے؟ اگر جائز ہوگا تو اس امارت پر تلوار کے زور سے قبضہ کیا گیا۔ یا نہیں؟ اور اگر یہ جائز نہیں ہے تو ارشاد ہو کہ معاملہ یکسو کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ کیا اقلیت رکھنے والی پارٹی کو موقع دیا جائے گا کہ وہ اکثریت کی مرضی کے خلاف ان پر اپنے خلیفہ کو مسلط کردے؟ اس تسلط کو بھی تسلیم کر لیجیے تو بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا یہ قبضہ تلوار کے زور سے نہیں ہے؟ اور یہ خلافت ہوگی یا بادشاہی؟

ایک دوسری صورت کے متعلق بھی ارشاد ہو کہ اسے خلافت کہیں گے یا بادشاہی؟

فرض کیجئے ایک اسلامی ملک میں دو پارٹیاں ہیں۔ اکثریت رکھنے والی پارٹی میں فساق و فجار ہیں اور حکومت کو غیر اسلامی طریقوں سے چلانا چاہتے ہیں جو پارٹی اقلیت میں ہے اس میں ایک شخص مسند خلافت پر متمکن ہونا چاہتا ہے اور اس سے اس کی نیت یہ ہے کہ حکومت کو اسلامی اصول کے تحت چلایا جائے کسی موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ بزور شمشیر اس پر قابض ہو جاتا ہے، اور برسر اقتدار آنے کے بعد اسلامی قوانین کا نفاذ کرتا ہے۔ اس کی حکومت کو خلافت کہیں گے یا بادشاہی؟ اسلامی آئین کے اعتبار سے اس حکومت کی کیا نوعیت ہے جو بذاتہ بزور شمشیر قائم ہوئی ہے؟ یہ بھی ارشاد ہو کہ کیا حضرت علی مرتضیٰؓ نے شام کو اپنی خلافت کے تحت لانے کے لئے تلوار سے کام نہیں لیا تھا؟ اور کیا مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت اور ان کے اتنے بڑے ملک کو بزور شمشیر بیعت کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش نہیں فرمائی تھی؟

اس مسئلہ پر مزید بحث انشاء اللہ اس مقام پر کی جائے گی جہاں ہم حضرت معاویہؓ پر مصنف کے مطاعن کا جواب دیں گے۔ یہاں تو ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ مولانا نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے قول اور حضرات خلفائے اربعہؓ کے طرز عمل کو پیش کر کے ناواقفوں کو مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس انداز بحث کو کسی طرح علمی نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے قول کو مودودی صاحب یا تو سمجھے ہی نہیں یا سمجھے تو بمصداق کلمة حق ارید بہ الباطل، انہوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اول تو اس قول کو ایک کلی معیار سمجھنا ہی صحیح نہیں ہے، حضرت ابو موسیٰؓ کوئی اصول نہیں بتا رہے ہیں بلکہ ایک واقعہ کا اظہار کر رہے ہیں جو اکثر پیش آتا ہے، یعنی اکثر و بیشتر بادشاہی عام پبلک کی مرضی کے خلاف محض ایک جماعت کی طاقت و قوت کے بل بوتے پر قائم ہوتی ہے اس لئے اسے عوام کے مفاد و مصالح سے کوئی غرض نہیں ہوتی، بخلاف اس کے خلافت کے قیام میں عوام کی مرضی کو

دخل ہوتا ہے۔ عام رعایا کی اکثریت خلیفہ سے خوش ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ ان کے مفاد کا لحاظ رکھتا ہے اور ذاتی مفاد کو ان کے مفاد پر ترجیح نہیں دیتا ہے، قوانین شرعیہ نافذ کرتا ہے جسے ہر مسلمان بحیثیت مسلمان پسند کرتا ہے، اس لئے اس کی حکومت گردنوں پر نہیں بلکہ دلوں پر ہوتی ہے۔ لیکن ان کا مقصد کوئی قاعدہ کلیہ وضع کرنا نہیں ہے نہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہاں تلوار درمیان میں آئی خلافت بادشاہی میں تبدیل ہو گئی۔ اس قسم کا کلیہ صحیح بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ بادشاہی بھی مشورے سے ہو سکتی ہے اور بادشاہ عوام میں مقبول بھی ہو سکتا ہے، بہت سے غیر مسلم بادشاہ ایسے گذرے ہیں جو اپنی رعایا میں بہت مقبول تھے، مگر محض اس بناء پر ان کی بادشاہی کو خلافت نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی خلیفہ بالفرض بغیر عام مشورے کے زور طاقت سے برسر اقتدار ہو جائے مگر احکام شرعیہ کا انفاذ کرے اور ارباب حل وعقد کی اکثریت اس کی خلافت پر راضی ہو تو محض اس وجہ سے کہ وہ بغیر عام مشورے کے برسر اقتدار ہو گیا ہے اس کی خلافت کو بادشاہی کہنا محض ایک مہمل دعویٰ ہے جو دلیل سے محروم ہے۔

دوسرے اگر اسے قاعدہ کلیہ ہی سمجھا جائے تو اس کا محل صرف اس صورت کو قرار دینا پڑے گا جب اقتدار بزور شمشیر کے ساتھ حکمران میں دیگر شرائط ولوازم خلافت بھی مفقود ہوں مثلاً وہ احکام شرعیہ نافذ نہ کرتا ہو، اس بناء پر مسلمان عوام وخواص اس کی سربراہی کو ناپسند کرتے ہوں مگر اس کی طاقت وحشمت کی وجہ سے بولنے کی ہمت نہ کرتے ہوں۔

یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ بزور شمشیر برسر اقتدار ہونا درحقیقت بادشاہی اور ملوکیت کا وصف ہے، خلافت کو اس سے محفوظ ہونا چاہئے، اصول یہی ہے اگرچہ بعض صورتوں میں حصول خلافت کے لئے تلوار سے امداد لینا بھی جائز ہے۔ جن کی مثالیں ہم گذشتہ سطروں میں بیان کر چکے ہیں۔

اس کی نظیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا یہ جزو ہے ولا ترجعوا بعدی

کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض (بخاری) میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارو۔ مطلب ظاہر ہے کہ اہل ایمان سے جدال و قتال کرنا کافروں کا کام ہو سکتا ہے مومن کے شایان شان نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر اس قسم کا جدال و قتال واقع ہو تو اس میں حصہ لینے والے مسلمان کافر ہو جائیں گے یا ہر حالت میں یہ قتال و جدال ممنوع اور حرام ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ بعض صورتوں میں یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز بلکہ صحابہ کرام کے درمیان واقع بھی ہوا۔

خلافت کے لئے مشورے کی شرط کے متعلق جو مغالطہ دینے کی کوشش مودودی صاحب نے کی ہے اس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں

چوتھا مغالطہ

مولانا اسی باب میں عصبیتوں سے پاک حکومت کا عنوان قائم کر کے تحریر فرماتے ہیں:۔

"اسلام کے ابتدائی دور کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانے میں ٹھیک ٹھیک اسلام کے اصول اور اس کی روح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کے درمیان یکساں سلوک کیا گیا۔ (ص ۹۶)

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں ایک طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ مدعیان نبوت کے ظہور اور ارتداد کی تحریک میں یہی عامل سب سے زیادہ موثر تھا۔ (ص ۹۶)

اس کے بعد مرتدین کے بعض اقوال اس کے ثبوت میں پیش کر کے بلا پس و پیش ان خزف ریزوں کی لڑی میں موتیوں کو بھی پرو دینے کی کوشش کی ہے چنانچہ اسی سلسلۂ کلام میں چند سطر

کے بعد لکھتے ہیں:

• "خود مدینہ میں جب حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تو حضرت سعدؓ بن عبادہ نے قبائلی عصبیت ہی کی بنا پر ان کی خلافت تسلیم کرنے سے اجتناب کیا۔"

اس کے بعد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت لکھی ہے جس سے بزعم خود ان کی خاندانی عصبیت ثابت کی ہے۔ مرتدین کی قبائلی عصبیت کے ساتھ حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی قبائلی عصبیت کا تذکرہ کر کے مصنف نے ایک نفسیاتی تدبیر سے کام لے کر قاری پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضورؐ کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں جو (بقول مصنف) ایک طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی تھیں وہ صرف باغیوں اور مرتدوں تک محدود نہ تھیں بلکہ صحابہ کرام و دیگر اہل اسلام کے دلوں میں بھی اس کی موجیں متلاطم تھیں۔ یہ دعویٰ صرف غلط ہی نہیں بلکہ صحابہ کرام اور اس زمانے کے دوسرے مسلمانوں پر افترا و بہتان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر بحث تو ہم بعد کو کریں گے، پہلے تو ہمیں یہ دکھانا ہے کہ مودودی صاحب نے یہاں اس کی جو دلیل بیان کی ہے اسے تسلیم کرنے کے بعد بھی دعویٰ آشنائے ثبوت نہیں ہوتا۔

مولانا کو تو یہ ثابت کرنا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قبائلی عصبیتوں کا طوفان بپا ہو گیا، اور یہ طوفان مسلمانوں میں بھی موجزن تھا۔ بالفرض ہم یہ تسلیم کر لیں کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ اور حضرت ابوسفیانؓ میں یہ عیب موجود تھا تو اس سے سب مسلمانوں میں اس کا وجود کیسے ثابت ہو جائے گا؟ کیا طوفان کے ثبوت کے لئے محض ایک دو افراد کا طرز عمل پیش کر دینا کافی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب خوب جانتے ہیں کہ ان کا دعویٰ کبھی منزل ثبوت پر نہیں پہنچ سکتا۔ مگر ان کا تشیع انہیں مجبور کرتا ہے کہ صحابۂ کرام کو مطعون کیا جائے۔

اگر دلیل نہیں ملتی تو مغالطہ اور فریب ہی سے کام لیا جاتے اور ناواقف قاری کو نفسیاتی طور پر صحابہ کرام کے خلاف برانگیختہ کرکے ان کی تحقیر کی سیاہی اس کے قلب و ذہن پر پھیر دی جائے تاکہ اگر وہ پورا شیعہ نہ ہو تو کم از کم پورا سنی بھی نہ رہے۔

مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کہ دور نبوی کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتوں کا کوئی طوفان آگیا تھا بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ اس طوفان میں صحابہ کرام کی ترد امنی کا دعویٰ تو غلط در غلط بلکہ ان مقدس نفوس پر بہتان و افتراء ہے۔

جس شخص کو بھی حدیث و تاریخ اسلام سے کچھ مس ہے وہ جانتا ہے کہ قریش کو تولیت کعبہ مکرمہ کی وجہ سے پورے عرب میں قائدانہ حیثیت حاصل تھی چنانچہ جب مکہ معظمہ فتح ہوگیا، اور قریش کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغلوب کرلیا۔ اس کے ساتھ وہ سب دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے تو سب قبائل عرب جوق جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

قرآن مجید میں بھی یہ مضمون بیان فرمایا گیا:۔

اذا جاء نصر اللہ والفتح ورایت	جب اللہ کی امداد آگئی اور فتح (فتح مکہ) واقع
الناس یدخلون فی دین اللہ	ہوگئی اور آپ نے لوگوں کو گروہ در گروہ اللہ کے
افواجا (النصر)	دین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

حدیث و تاریخ کی کتابیں مثلاً سیرت ابن ہشام وغیرہ متفق ہیں کہ سارا عرب قریش کے انجام اور ان کے فیصلہ کا منتظر تھا، ان کے اسلام لاتے ہی سب اسلام لے آئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے خطبہ ثقیفہ بنی ساعدہ میں اس کا اظہار کیا تھا کہ قبائل عرب قریش ہی کی سربراہی منظور کریں گے، یہ خطبہ بخاری شریف و دیگر کتب حدیث میں مذکور ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کس قدر غلط اور گمراہ کن ہے کہ فتنہ ارتداد میں ہی (قبائلی

عصبیت) کا عامل سب سے زیادہ موثر تھا؟ کس قدر مہمل بات ہے کہ جس قبیلہ کی اتباع وہ اسلام لانے میں کرتے ہیں اور قبائلی عصبیت اس سے مانع نہیں ہوتی، یکایک یہ عصبیت اتنی شدت کے ساتھ ابھرتی ہے اور انہیں اس کا اتنا مخالف بنا دیتی ہے کہ وہ ارتداد یا بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ ارتداد کے یا بغاوت کے بعد جہاں اور اخلاق خبیثہ ان کے اندر پیدا ہو گئے تھے وہاں اس عصبیت نے بھی سر اٹھایا ہو لیکن یہ کہنا کہ اس ارتداد و بغاوت میں سب سے زیادہ موثر عامل (DOMINANT FACTOR) یہی تھا بالکل خلاف واقعہ اور غلط دعویٰ ہے۔ دو ایک آدمیوں کا اس عصبیت کو ظاہر کرنا ہرگز اس کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ یہ پورے قبائل اسی عصبیت کی بنا پر باغی یا مرتد ہوئے تھے، نہ اس سے کسی طوفان عصبیت کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قریش کا اسلام دیکھ کر بعض قبائل محض تقلیدی طور پر مسلمان ہو گئے تھے انہوں نے ایمان کے ساتھ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کی زیارت کبھی نہ کی تھی، اور صحبتِ نبوی کے شرف سے کلیۃً محروم تھے، نہ وہ اسلام کو صحیح معنیٰ میں سمجھ سکے تھے، نہ اس کے محاسن سے واقف تھے، رسالت کے متعلق بھی ان کا تصور غالباً صحیح نہ تھا۔ آنحضور کے زمانہ ہی میں مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش شروع کر دی تھی اور آپ کے بعد تو یہ لوگ کھل کر میدان میں آگئے، اس لئے کہ انہیں اپنی حماقت کی بنا پر یقین ہو گیا تھا کہ آنحضورؐ کے بعد یہ دین ختم ہو جائے گا یا کم از کم اس کا زور گھٹ جائے گا۔ اس موقع سے مسیلمہ و اسود کے ایسے چالاک لوگوں نے فائدہ اٹھا کر ان کے ضلال میں اور اضافہ کر دیا ہو سکتا ہے کہ ان فریب کار اور ہوشیار لوگوں نے اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے ان کی قبائلی عصبیت کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہو لیکن یہ کہنا بالکل غلط اور تاریخ کی تحریف ہے کہ ان مدعیان نبوت

کے دعوے اور ان کے پیروؤں کی پیروی کا محرک قبائلی تعصب تھا ۔

خیر ان کے معاملے کو چھوڑیئے ، صحابۂ کرام کا جہاں تک تعلق ہے ان میں کہیں بھی اس "طوفان عصبیت" کا پتہ نہیں چلتا ۔ طوفان تو ایک طرف خود قبائلی عصبیت جس چیز کا نام ہے وہ بھی ان حضرات میں عنقا نظر آتی ہے ۔ جو قبائل وفات نبوی فداہ روحی کے بعد مرتد یا باغی ہو گئے تھے ان کا ایک فرد بھی صحابی نہ تھا ، جو صحابی تھے ان میں قبائلی عصبیت کا دُور دُور بھی نشان نہیں ملتا ہے ۔ انہیں اس مرض کا مریض کہنا سوا بہتان کے کسی دوسرے لفظ سے نہیں تعبیر کیا جا سکتا ۔

مودودی صاحب نے صرف شیعی مسلک ہی نہیں اختیار کیا ہے بلکہ پروپیگنڈے کی شیعی تکنک بھی اختیار فرمائی ہے ۔ صحابۂ کرام کے اوصاف حمیدہ کے متعلق جب قرآن مجید کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں تو شیعہ حضرات لاجواب ہو کر اپنی حجت کی ڈوبتی ہوئی کشتی صرف اس تنکے کا سہارا لیکر بچانا چاہتے ہیں کہ آنحضورؐ کے بعد صحابہ کرام میں بہت بڑا تغیر ہو گیا تھا ، اور ان کے وہ اوصاف حمیدہ جن کی شہادت قرآن مجید نے دی ہے ، ان سے زائل ہو گئے تھے ۔ یہی طرز مودودی صاحب نے بھی اختیار کیا ہے وہ کسی نہ کسی طرح مخاطب کے ذہن میں یہ بات اتار دینا چاہتے ہیں کہ صحابہ کے دَو دَور تھے ، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور آنحضورؐ کے بعد ! دوسرے دور میں ان کے حالات بدل گئے تھے اور معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے اثرات ان سے زائل ہو گئے تھے ، یہاں تک کہ قبائلی یا خاندانی عصبیت جو اسلام کی نظر میں حمیت جاہلیۃ اور بہت ہی مذموم شے ہے ۔ ان کے اندر آنحضورؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ابھر پڑی تھی ۔

یہ بات قرآن وحدیث کی تصریحات اور ان کے بیانات کے بالکل خلاف ہے ۔ واقعات اس کی تکذیب کرتے ہیں ۔ مسلمات اہل سنت اس سے کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں اور کسی سنی کا قلم

اسے لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

تفصیل کا یہ محل نہیں ہے اور موجب تطویل بھی ہے۔ یہاں تو ہمیں صرف اتنا پوچھنا ہے کہ مودودی صاحب نے "قبائلی عصبیت" کا جو الزام صحابہ کرام پر لگایا اس کا ان کے پاس کیا ثبوت ہے؟ لے دے کے انہیں صرف دو روایتیں دو حضرات کے متعلق ایسی ملیں جن سے ان کے خیال میں ان دو حضرات میں قبائلی عصبیت کا وجود ثابت ہوتا ہے لیکن اول تو ایک لاکھ سے زائد افراد میں سے دو کیا دس بیس یا سو پچاس اشخاص میں بھی اگر اس کمزوری کا وجود ثابت ہوجائے تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ پوری جماعت یا اس کی اکثریت اس غلطی میں مبتلا ہوگئی تھی۔

دوسرے حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کا ان دونوں روایتوں سے استدلال بالکل کمزور اور بے جان ہے۔ ذیل کی سطریں اسے روشن کر دیں گی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت سعدؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفہ بنانے سے اختلاف کیا تھا۔ اس واقعہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا سبب قبائلی عصبیت کو قرار دینے کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

بخاری شریف میں اس واقعہ کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

قال واجتمعت الانصار الی سعد بن عبادۃ فی سقیفۃ بنی ساعدۃ فقالوا منا امیر ومنکم امیر فذھب الیھم ابوبکرؓ وعمرؓ بن الخطاب وعبیدۃ بن الجراح ثم تکلم ابوبکرؓ فتکلم ابلغ الناس	راوی کہتے ہیں کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت سعدؓ بن عبادہ کے پاس جمع ہوئے اور انہوں نے (مہاجرین سے) کہا ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے حضرات ابوبکر، عمر، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم ان کے پاس گئے اور

فقال فی کلامہ نحن الامراء وانتم الوزراء فقال حباب بن المنذر لا واللہ لا نفعل منا امیر ومنکم امیر (بخاری جلد اول باب مناقب ابوبکرؓ)	حضرت ابوبکرؓ نے بہت عمدہ تقریر فرمائی اور فرمایا ہم امراء ہوں گے اور تم وزراء اس پر حضرت حباب بن المنذر نے کہا بخدا ہم ایسا نہ کریں گے بلکہ ایک امیر تم میں سے ہوگا اور ایک ہم میں سے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار میں بعض حضرات کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت کا انتظام شخص واحد کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ دو امراء پر مشتمل ایک کمیٹی نظم ونسق کی زمام اپنے ہاتھ میں لے۔ منا امیر ومنکم امیر کے الفاظ صاف طریقہ سے حقیقت کو واضح کر رہے ہیں۔ اس نظریہ کا سبب یہ سوال تھا کہ آنحضورؐ کے بعد نظام مملکت کی نوعیت کیا ہو؟ یہ مسئلہ اس وقت تک منقح نہیں ہوا تھا آنحضورؐ نے اس کے بارے میں کوئی صریح اور واضح بیان نہیں دیا تھا اگرچہ اشارات فرمائے تھے لیکن اسے امت کے اجتہاد پر چھوڑ دیا تھا۔ انصار کے اجتہاد نے انہیں اس نظریہ تک پہنچایا۔ ان کے پیش نظر یہ امر تھا کہ حکومت میں ہر طبقہ کی نمائندگی ہونا چاہئے تاکہ ہر ایک کے مفاد کو سمجھ سکے اور ان کا تحفظ کر سکے، اس وقت صحابہ میں بھی دو طبقہ اور گروہ تھے جن کے دنیاوی مفاد میں کسی قدر اختلاف تھا۔ انصار زراعت پیشہ تھے، مہاجرین صنعت پیشہ یا تجارت پیشہ تھے ظاہر ہے کہ دونوں کے دنیاوی مفاد میں بعض اوقات تضاد ہو سکتا ہے مثلاً اگر حکومت صنعت وتجارت کی طرف زیادہ توجہ کرے اور زراعت کو نظر انداز کر دے تو اس سے کاشتکار طبقہ کی مالی حالت کو نقصان پہنچے گا، علی ہذا برعکس صورت میں صنعت وتجارت کو ضرر کا اندیشہ ہے۔ اسی قسم کے امور کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے انصار کو بھی حکومت میں شریک کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اگر صحابہ میں دوسرے طبقات موجود ہوتے تو وہ ان کے نمائندوں کو بھی امارت وخلافت میں شریک کرنے کی رائے دیتے، یہ اختلاف حکومت کی شکل کے بارے میں نظریہ کا اختلاف تھا۔ قبائلی عصبیت سے اسے کیا واسطہ؟ اس عصبیت کی تو کہیں بو بھی

اس میں محسوس نہیں ہوتی واللہ اعلم مودودی صاحب کو اس واقعہ میں قبائلی عصبیت کیسے نظر آگئی
بخاری کی روایت دیکھ لیجئے اس میں منا امیر و منکم امیر کا قائل حضرت سعد بن عبادہ کو
نہیں قرار دیا گیا ہے، نہ اس موقع پر ان کا کچھ فرمانا ہی منقول ہے۔ کہنے والے کون صاحب تھے،
اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے پھر آخر مودودی صاحب نے ان پر قبائلی عصبیت کا الزام کس بنا پر اور
ان کی کس بات کی بنا پر لگا دیا۔ اگر یہ قول انہیں کا ہو تو بھی اس سے قبائلی عصبیت کا کسی طرح بھی پتہ
نہیں چلتا ــ بلکہ حکومت کی شکل کے بارے میں نظریہ کا اختلاف معلوم ہوتا ہے، اسے اس عصبیت
سے کیا تعلق ؟

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی اس کی
وجہ یہ تھی کہ جب حضرات مہاجرین کی جانب سے وحدت امیر کا نظریہ پیش کیا گیا اور "نحن الامراء
وانتم الوزراء" ہم (مہاجرین) امیر ہوں گے اور تم (انصار) وزیر ہوگے، فرما کر انہیں
مطمئن کر دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر طبقہ کے مفاد کی حفاظت و رعایت کا یہ طریقہ مناسب ہے کہ
انہیں وزارت میں شامل کر لیا جائے۔ مرکزی طاقت میں تفرقہ اور انتشار مناسب نہیں ہے تو
جمہور انصار نے اسے پسند کیا اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی جس کی وجہ سے ان کا اجتہاد تبدیل ہو گیا لیکن
حضرت سعدؓ اپنے سابق اجتہاد پر بدستور قائم رہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ان کے نظریہ
کے خلاف تھی، اس لئے انہوں نے بیعت نہیں کی لیکن نہ کوئی سازش کی نہ بغاوت کی نہ خلیفۃ المسلمین
کے خلاف کوئی تحریک چلائی۔ ترک بیعت کا سبب اجتہاد اور نظریہ کا فکری اختلاف تھا، اسے
قبائلی عصبیت کے جذبہ پر مبنی سمجھنا ادعا محض اور ان پر بے جا و بے دلیل الزام ہے۔

اس الزام کے غلط ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں اور محض سوء ظن
کی پیداوار ہے لیکن اس پر مستزاد یہ واقعہ ہے کہ اس کے خلاف قرائن کی شہادت موجود ہے جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں قبائلی عصبیت کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ غور تو فرمائیے کہ انصار کی تعداد مہاجرین سے زائد بھی اور وہ مدینہ طیبہ کے قدیم باشندے تھے۔ بخلاف اس کے مہاجرین مسافر اور ان کے توطن کو بھی معتد بہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔ وہ مہاجرین کے محسن بھی تھے، دین کی خدمت اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نصرت میں وہ کسی طرح مہاجرین سے پیچھے نہیں رہے تھے۔ قربانی میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے اگر ان میں قبائلی عصبیت کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ "منا امیر ومنکم امیر" کے بجائے یہ کہتے کہ "نحن الامراء وانتم الوزراء" اور کم از کم صدیق اکبرؓ کی صرف ایک تقریر سن کر وہ اپنے موقف کو نہ چھوڑ دیتے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اگر خدانخواستہ اس بلا میں مبتلا ہوتے تو ان کا ایسا ذی اثر شخص سکوت سے کام نہ لیتا وہ اپنے قبیلہ سے کوئی بات تو ایسی کہتے جس سے ان کی قبائلی عصبیت میں ہیجان پیدا ہوتا۔ حالانکہ معتبر روایتیں شاہد ہیں کہ انہوں نے اس قسم کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔ ان قرائن سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت سعدؓ نے اگرچہ حضرت صدیق اکبرؓ کی تقریر سن کر اپنی رائے نہیں تبدیل کی اور دو امیروں کی حکومت کا نظریہ ترک نہیں فرمایا لیکن ان کے تفقہ نے انہیں اس وسعت قلب پر آمادہ کر دیا جو مجتہد فیہ مسائل میں ہونا چاہئے یعنی خود اپنے اجتہاد پر عمل کیا لیکن دوسرے کے اجتہاد پر زبان طعن بھی نہیں دراز کی۔ اس طرز عمل کو بھلا "قبائلی عصبیت" سے کیا نسبت ہے؟

علاوہ بریں میں مودودی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اسی سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات مہاجرین کی جانب سے کسی مہاجر اور قریشی کے خلیفہ ہونے پر زور دیا گیا تھا اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا۔ کیا یہ مطالبہ "قبائلی عصبیت" پر مبنی تھا؟ اگر ایسا تھا تو آپ کا یہ کہنا کہ حضرت ابو بکر وعمر وحضرت علی رضی اللہ عنہم کی حکومت عصبیتوں سے پاک تھی کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔؟

اور اگر یہ مطالبہ قبائلی عصبیت سے پاک اور کسی دوسرے اچھے جذبہ اور کسی مصلحت دینی سے پیدا ہوا تھا تو حضرت سعد بن عبادہؓ کے ترک بیعت کو آپ "قبائلی عصبیت" پر کیوں محمول کرتے ہیں ؟ آخر دونوں میں فرق کی کیا وجہ ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ مہاجرین ہوں یا انصار یا دوسرے صحابہ کرام قبائلی عصبیت کا ان میں نام و نشان بھی نہ تھا ۔ مودودی صاحب کو یہ چیز حضرت سعد بن عبادہؓ میں نظر آتی وہ ان کی نگاہ عیب جو کا فریب ہے جس کی وجہ سے وہ اس پاکیزہ اور لطیف جذبہ کا ادراک نہ کر سکے جو حضرت سعدؓ اور بعض انصارؓ کے اس طرز عمل کے تحت موجزن تھا ۔ صاحب ذوق اور منصف مزاج ناظرین کے لئے اس بات کا سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ مہاجرین کی طرح انصار بھی حب نبی کے نشہ میں سرشار تھے محبت میں اکثر طبائع میں غبطہ پیدا ہو جانا لازم ہے جو صرف جائز ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن بھی ہے ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر اہم کام میں حضرات انصار کو شریک رکھتے تھے ۔ آنحضورؐ ارواحنا فداہ کے بعد بھی انصار کا جذبہ حب نبی تقاضا کر رہا تھا کہ آنحضور کی خلافت میں شریک ہو کر اپنے محبوب رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے نسبت خلافت کو قائم کر لیں اور دربار رسالت میں وہی حیثیت قائم رکھیں جو حیات نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انہیں حاصل تھی ۔ اہل ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نسبت کس قدر رفعت و قیمت رکھتی ہے اور ایک محب رسول کے نزدیک اس کی کتنی عظمت و وقعت ہوتی ہے ۔ آنحضورؐ کے ساتھ اس سے بہت کم درجہ کی نسبت کے لئے اگر ہزار جانیں نثار کر دی جائیں تو بھی وہ سستی ہی کہی جائے گی ۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اس پاکیزہ اور نورانی جذبہ پر مودودی صاحب قبائلی عصبیت کی سیاہی پھیرنا چاہتے ہیں ۔

..... حدیث مذکور کی تشریح کرتے ہوئے فتح الباری میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے مندرجہ ذیل روایت نقل کی گئی ہے جو اس واقعہ کو بالکل روشن کر دیتی ہے۔

"انصار کے ایک خطیب کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب ہم میں کسی (مہاجر کو) کسی کام پہ مقرر فرماتے تھے تو اس کے ساتھ ہم میں سے (انصار سے) کسی شخص کو بھی شریک فرماتے تھے، تو اسی (طریقہ) پر بیعت بھی کرو (یعنی نظام خلافت بھی اسی اشتراک کے ساتھ چلاؤ)

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ پر الزام

اپنے دعوے کی شہادت میں مودودی صاحب نے حضرت ابوسفیانؓ کے متعلق مندرجہ ذیل روایت نقل کی ہے لکھتے ہیں:-

"حضرت ابوسفیانؓ کو بھی عصبیت کی بنا پر ان کی (حضرت ابوبکرؓ کی) خلافت ناگوار ہوئی تھی اور انہوں نے حضرت علیؓ سے جا کر کہا تھا کہ قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی کیسے خلیفہ بن گیا تم اٹھنے کے لئے تیار ہو تو میں وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں" ص ۹۷

اس روایت کے لئے انہوں نے کنز العمال، طبری اور استیعاب کا حوالہ دیا ہے۔ صفحات گذشتہ میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ طبری کے بعد اسلامی تاریخ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں دو صدیوں کے متعلق مواد طبری ہی سے لیا گیا ہے اس لئے درحقیقت یہ صرف طبری کی روایت ہے اور کنز العمال و استیعاب میں اس سے نقل کی گئی ہے تین کتابوں کا حوالہ دیکر مصنف نے خواہ مخواہ ناظرین کو مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے اگر ایک ہی کتاب سے کوئی روایت سو جگہ نقل کر دی جائے تو اس سے اس

کی قوت میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا۔

طبری کے متعلق مذکور ہو چکا کہ اس میں تشیع تھا اس کے بعد سند کے اعتبار سے روایت کا کوئی وزن نہیں باقی رہتا۔ ضعف سند سے قطع نظر اس کی صداقت کو درایت کی کسوٹی پر بھی جانچنا لازم ہے اس لئے کہ یہ تاریخی روایت ہے حدیث نبوی نہیں ہے۔ اس زاویہ سے دیکھئے تو یہ روایت کسی سبائی کی من گھڑت اور سراپا کذب و دروغ معلوم ہوتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ قبائلی عصبیت کی بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر راضی نہیں تھے۔ اور ان کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے اس کے ساتھ انہیں قوت بھی اتنی حاصل تھی کہ وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر سکتے تھے تو انہوں نے اس سازش کے لئے حضرت علیؓ کا انتخاب کیوں کیا؟ اموی عصبیت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ یا تو خود خلافت کے لئے کھڑے ہوتے یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کے لئے آمادہ کرتے جو اموی تھے، اور ان کے قریبی رشتہ دار تھے، اور جمہور امت میں حضرت علیؓ سے زیادہ مقبول بھی تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ عام طور پر صحابہ کرام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت کے لئے حضرت علیؓ پر انہیں ترجیح دی تھی۔ اس قسم کی گفتگو اور سازش کے لئے انہوں نے حضرت علیؓ کا انتخاب آخر کیوں کیا؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالفرض کسی مصلحت سے وہ اس معاملہ میں حضرت علیؓ ہی کو آگے بڑھانا چاہتے تھے مگر جب انہوں نے مایوس کن جواب دے دیا تو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے سامنے اپنی اعانت کا تحفہ کیوں نہ پیش کیا؟ اور ان سے ساز باز کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ یا خود کوئی شورش کیوں نہ برپا کی؟

وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دینے کی قوت و طاقت رکھنے کے باوجود وہ

عمر بھر خلافت صدیقی کے مطیع و منقاد رہے، اور ایک مرتبہ بھی خود خلافت حاصل کرنے یا کسی اپنے قبیلہ یا خاندان کے شخص کو خلیفہ بنانے کی کوشش نہیں کی؟ مفروضہ قبائلی عصبیت کے ساتھ اس طرز عمل کو آخر کیا مناسبت ہے؟

ان سوالات کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ روایت سرتاپا جھوٹ اور حضرت ابوسفیانؓ پر افترا و بہتان اور کسی سبائی کی وضع کردہ ہے۔

طبری نے اپنی شیعیت کی وجہ سے اسے لکھنا ضروری سمجھا، صاحب استیعاب نے تو وجہ خیال حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے متعلق ظاہر کیا ہے وہ صحابہ کرام کے متعلق ان کی بے جا بیباکی اور ان کے غیر محققانہ طرز عمل کو ظاہر کر رہا ہے۔ مزید یہ کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ استیعاب میں صحت روایت کا کوئی التزام نہیں کیا گیا ہے بلکہ نقل روایات و اخبار میں سخت بے احتیاطی برتی گئی ہے۔ کنز العمال میں بھی اس کا التزام نہیں ہے۔ واقدی کی بکثرت روایتیں اس میں موجود ہیں جس کا کذاب و وضاع اور مفتری ہونا معلوم و مشہور ہے۔ غالباً یہ روایت بھی اسی کے کارخانہ دروغ بافی کی مصنوعہ و موضوعہ ہے یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ کنز العمال کے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ جلال الدین سیوطی کے نقشہ میں رنگ بھرا ہے اور نقل روایت میں موصوف کے بے احتیاطی اس قدر مشہور و اقعہ ہے کہ انہیں حاطب اللیل کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے روایت اور درایت دونوں اعتبارات سے اس روایت کا موضوع اور کذب محض ہونا اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اگر مودودی صاحب ذرا بھی غور کرتے تو اسے نقل کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ لیکن حضرت ابوسفیانؓ کی عداوت اور صحابہ کرام کو مطعون کرنے کی بے پناہ خواہش نے انہیں مجبور کیا کہ اس تار عنکبوت کو اپنے غلط دعوے کا سہارا بنائیں۔ اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے وہ کافی ہے لیکن چند سطریں اور لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ پڑھنے

والوں کو سبائیوں کے ہتھکنڈوں کا مزید علم حاصل ہو جائے اور یہ بات ظاہر ہو جائے کہ ان روایتوں پر اگر درایت ہی کی روشنی ڈالی جائے تو جامہ کتان کی طرح ان کے تار و پود بکھر جاتے ہیں اور سبائیوں کے افترا کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ روایت مذکورہ کے بموجب حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے جواب میں فرماتے ہیں:

"تمہاری یہ بات اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے ہمیں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کوئی سوار اور پیادے لاؤ۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں خواہ ان کے دیار اور اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دور ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابوبکر کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انہیں اس منصب پر مامور نہ ہونے دیتے۔" ص۹

اس جواب اور اس کے طرز و اسلوب پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بالکل بے اصل اور موضوع ہے کسی سبائی نے یہ تیر ایسے زاویے سے چلایا ہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مجروح ہو جائیں۔ قدرا خط کشیدہ جملے ملاحظہ ہوں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت سفیان رضی اللہ عنہ کو دشمن اسلام کہہ رہے ہیں ظاہر ہے کہ دشمن اسلام کافر ہی ہو سکتا ہے دوسرے جملہ میں انہیں منافق بنا رہے ہیں۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ باطناً کافر اور ظاہراً مسلمان۔ کیا کسی مسلمان کی تکفیر جائز ہے؟ اور کیا محض کسی کی خلافت پر راضی نہ ہونا اور اس کے مقابلے میں جنگ کے لئے آمادہ ہو جانا کفر ہے؟ یا اس قسم کا ارادہ علامت کفر و نفاق ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ایسے فقیہہ و فہیم و متقی و محتاط جلیل القدر صحابی کی زبان سے کسی مسلمان کے لئے ایسے ناسزا کلمات نکل سکتے ہیں؟ حدیث و فقہ کی کتابیں دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا

کہ کسی مسلمان کی تکفیر پر کس قدر سخت وعید ہے اور اسے کتنا بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ اس گناہِ کبیرہ کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرنا ان کے کسی دشمن ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ان کا کوئی دوست اور معتقد ہرگز ان کے دامن تقدس پر اس سیاہ دھبہ کو دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی یاد رکھئے کہ یہ حضرت علی مرتضیٰؓ ہی ہیں جنہوں نے خوارج کی بھی تکفیر نہیں فرمائی جو ان کے مقابلے میں تلوار لیکر نکلے تھے اور خود علی الاعلان (معاذ اللہ) ان کی تکفیر کرتے تھے بلکہ انہیں حج وغیرہ کے سلسلہ میں پوری سہولت عطا فرمائی۔ یہ سب باتیں البدایہ والنہایہ ودیگر کتب تاریخ میں مفصل مذکور ہیں۔ کتنی عجیب اور خلاف قیاس بات ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ خوارج کے مقابلے میں اتنی احتیاط برتیں اور حضرت ابوسفیانؓ کے ایک جملہ پر ان کی تکفیر کرکے گناہِ عظیم کا ارتکاب کریں۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ مولفۃ القلوب میں ہیں، امّ المومنین حضرت ام حبیبہ علیٰ زوجہا علیہا الصلوٰۃ والسلام کے والد بزرگوار ہونے کی وجہ سے بارگاہِ نبوی میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ خود سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم اس بنا پر

ملہ «مولفۃ القلوب» کا یہ غلط مفہوم عام طور پر مشہور ہے کہ یہ وہ حضرات تھے جنہیں اسلام پر قائم رکھنے کے لئے عطیات دیئے جاتے تھے۔ یہ مفہوم بالکل غلط اور خلافِ حقیقت ہے بلکہ شاید سبائی پروپیگنڈے کا اثر ہے ظاہر ہے کہ اسلام مال کا لالچ دے کر نہیں پھیلایا گیا۔ نہ اس اسلام کا کوئی اعتبار ہے جس کی بنا سونے چاندی پر قائم ہو اسلام ہی سے ہو سکے بھی نہیں کہا جا سکتا۔ درحقیقت یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے قبل اسلام آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم اور دیگر مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہنچائی تھیں اسلام لانے کے بعد انہیں بجا طور پر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید آنحضور کے قلب مبارک میں اس رنج کا شائبہ موجود ہو گا سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ان کی طرف خصوصی توجہ فرما کر اور عطایا دیکر ان کے دل سے یہ شک مٹانا چاہتے تھے۔ محبت میں اس قسم کے شبہات کا پیدا ہونا تقریباً ناگزیر ہے خصوصاً اعزا و اقارب میں، اور یہ حضرات آنحضور کے اعزا و اقارب ہی تھے۔

ان کا اکرام فرماتے تھے خیال تو فرمائیے کہ جن صاحب کی تالیف قلب اور دلدہی و دلجوئی کا خیال خود آنحضور فرمائیں اور جن کا اکرام سید الانبیاء فرمائیں ان کے قلب کو حضرت علیؓ ایسے سخت اور دلخراش الفاظ سے مجروح کریں؟ اور انہیں دشمن اسلام اور منافق کہکر ذلیل کریں؟ جو شخص حضرت علی مرتضیٰؓ اور ان کی حسب رسول سے واقف ہے ہرگز اس کا یقین نہیں کر سکتا۔

ایک ام المومنین کے والد بزرگوار اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خسر نامدار ہونے کی وجہ سے ہر مسلمان پر ان کی تعظیم و تکریم واجب تھی۔ جب وہ حالت کفر میں تھے اس وقت بھی اس رشتہ کی وجہ سے ان کا اکرام اس حد تک ہر مسلمان پر واجب تھا جس حد تک شرعاً ایک کافر کا اکرام ہو سکتا ہے۔ چہ جائیکہ حالت اسلام میں۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا اکرام فرماتے تھے۔ کیا ان سے اس قسم کی گفتگو بے ادبی، گستاخی اور بد تہذیبی نہیں ہے؟ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوتا تو کیا یہ آنحضور کے لئے باعث رنج نہ ہوتا؟ کوئی سنی حضرت علیؓ کے متعلق وہم بھی نہیں کر سکتا کہ انہوں نے ایسی بے ادبی اور بد تہذیبی کا ارتکاب کیا ہوگا یا ایسی بات کی ہوگی جو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے موجب ایذا ہو سکتی تھی۔

آخر میں روایت کے ایک پہلو پر اور نظر ڈال لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان یہ گفتگو کب ہوئی تھی؟ کتب تاریخ ہی نہیں بلکہ کتب حدیث مثل بخاری و مسلم بھی بالالفاظ بتا رہی ہیں کہ امام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت حضرت علی مرتضیٰؓ موجود نہ تھے، اور انہوں نے کچھ مدت کے بعد بیعت فرمائی ہے۔ ان کی اس تاخیر سے غلط قسم کی افواہیں مشہور ہو گئیں اور بعض لوگوں میں ان کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ میں ملاقات ہوئی اور دوستانہ مخلصانہ شکوہ و شکایت کے بعد دونوں کی غلط فہمی بالکل دور ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے مجمع عام میں حضرت صدیق اکبرؓ کے دست مبارک پر

بیعت کرلی۔ سوال یہ ہے کہ حضرت ابوسفیان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کی مذکورہ گفتگو اس واقعہ
سے پہلے ہوئی تھی یا اس کے بعد؟ اگر پہلے ہوئی تھی تو اس ملاقات میں انہوں نے اس کا کوئی تذکرہ
کیوں نہ فرمایا؟ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ حضرت صدیق اکبرؓ کو
اس واقعہ سے آگاہ کرکے حضرت ابوسفیانؓ کی طرف سے ہوشیار کردیتے لیکن اس گفتگو میں اس
کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔

دوسرا مفروضہ یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؓ و حضرت ابوسفیانؓ کی یہ گفتگو حضرت علیؓ کی بیعت
کے بعد ہوئی ہو لیکن یہ مفروضہ بھی غلط معلوم ہوتا ہے۔ اولاً اس لئے کہ بیعت کے بعد تو اس کا تذکرہ
موصوف کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہم و دیگر اکابر صحابہ سے بدرجہ اولیٰ کرنا ضروری
تھا، اسلام و اہل اسلام کی خیر خواہی کا تقاضہ، اور خود صدیق اکبرؓ کے ساتھ ذاتی تعلق و محبت کا
مقتضا بھی یہی تھا۔ چونکہ دوستانہ شکر رنجی کے بعد صفائی ہوکر دونوں کے اخلاص باہمی میں اور
اضافہ ہوگیا تھا جیسا کہ عام طور پر دوستوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس واسطے نفسیاتی اعتبار سے
یہ لازم تھا کہ اس کا تذکرہ حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ سے ضرور کرتے، لیکن تاریخ میں اس کا کوئی نشان
بھی نہیں ملتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سرے سے اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہ تھا۔ علاوہ ازیں
کیا حضرت ابوسفیانؓ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ حضرت علیؓ بیعت کرنے کے بعد عہد شکنی نہ کریں گے؟
بیعت کے بعد ان سے اس قسم کی گفتگو کی انہیں جرأت ہی کیسے ہوسکتی تھی۔"

ان روشن دلائل و قرائن سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت علیؓ و حضرت سفیان
رضی اللہ عنہم دونوں حضرات اس اتہام سے بری ہیں جو ان پر اس روایت میں لگایا گیا ہے۔
روایت بالکل جھوٹ اور کذب خالص ہے جو کسی سبائی نے گھڑی ہے۔ نہ حضرت ابوسفیانؓ نے
یہ بات کہی نہ حضرت علیؓ نے جواب مذکور دیا۔ طبری وغیرہ تو کیا چیز ہیں (اگر بخاری و مسلم میں

بھی یہ روایت ہوتی تو مندرجہ بالا دلائل کی بنا پر مردود قرار پاتی) اور اگر سند سلسلۃ الذہب بھی ہوتی اور راوی کو کاذب کہنا ممکن نہ ہوتا تو اتنا ضرور کہنا پڑتا کہ کسی راوی کو سہو ہوگیا ہے لیکن روایت بہرحال موضوع اور مردود قرار پاتی اور کوئی معاند ہی اس کی صحت کا قائل ہو سکتا تھا۔

اسی روایت یا صحیح الفاظ میں من گھڑت افسانے پر مودودی صاحب نے اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کے منہدم ہونے کے بعد ان کے دعوے کی عمارت خود بخود زمین بوس ہو جاتی ہے اور صحابہ کرام میں قبائلی عصبیت کا نام و نشان بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

حضرت عثمانؓ پر مطاعنؓ و اعتراضات

درحقیقت مودودی صاحب کی اس کتاب کا مقصد تالیف صحابہ کرام کو مطعون و مجروح کرنا اور مسلمانوں کو جو اعتماد ان پر ہے اسے زائل کرنا ہے۔ اس لئے انہوں نے اسی باب سے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ پر طعن و طنز کا آغاز کر دیا۔ حالانکہ ان کا موضوع تو صرف یہ تھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اولین خلفاء کے زمانے میں خلافت کا معیار کس قدر بلند رہا اور فلاں حضرات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل جانشین ثابت ہوتے۔ اگر حضرت عثمانؓ اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے تو ان کا تذکرہ ہی نہ کیا جاتا۔ اور باب چہارم سے ان پر اعتراضات کا آغاز کیا جاتا۔ لیکن مودودی صاحب کو اپنے اصل مقصد تک پہنچنے کی اس قدر جلدی تھی کہ وہ صبر نہ کر سکے۔ اور اسی باب سے سیدنا امام عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیشین گوئی

امام عادل سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر مطاعن کی ابتدا کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں :۔

"حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد عرب قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلاب اثر کے باوجود ابھی بالکل ختم نہیں ہوگئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور ان کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا کہ اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی ابی معیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے۔ اور اگر عثمانؓ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے۔ اور عوام شورش کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے۔" ص ۹۸، ۹۹

استیعاب کے حوالے سے یہ روایت نقل کی گئی ہے، روایت کے اعتبار سے استیعاب کا جو حال ہے وہ ہم گذشتہ صفحات میں واضح کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں (کہ یہ کتاب ہرگز قابل اعتماد نہیں کہی جا سکتی) یہ روایت بھی ہماری اس رائے کی ایک دلیل بن سکتی ہے۔ درایت کے اعتبار سے تو یہ موضوع اور باطل ہے ہی (جیسا کہ ہم واضح کریں گے لیکن) سند کے لحاظ سے بھی یہ بالکل بے جان ہے۔ ذرا اس کے بعض راویوں کے چہرے ملاحظہ ہوں۔ اس میں ایک راوی عبدالوارث بن سفیان یا سلیمان ہے جو مجہول ہے۔

محمد بن احمد بن ایوب ضعیف الروایہ و منکر الحدیث ہے یحییٰ بن معین نے انہیں کذاب

کہا ہے (میزان الاعتدال ص۴۲۹) سلیمان بن داؤد کوئی شیعہ ہے، شیعوں کے مشہور عالم شیخ حلی نے بھی اسے شیعہ کہا ہے (خلاصۃ الاقوال ص۱۰۰) ظاہر ہے کہ شیعہ تو کوئی بھی مقبول الروایۃ نہیں ہو سکتا، خصوصاً ایسی صورت میں تو اس کی روایت بالاتفاق ساقط الاعتبار اور مردود ہوتی ہے، جبکہ اس کی روایت سے کسی صحابی پر جرح ہو رہی ہو۔ علی ہذا جس روایت میں کوئی کذاب بھی ہو اس کا مردود ہونا بالکل بدیہی ہے۔ مجہول کی روایت بھی نامقبول ہی ہے۔ ان امور سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ یہ روایت موضوع اور ساقط الاعتبار ہے۔

درایت کی روشنی میں تو اس کے کذب و دروغ کا مکروہ چہرہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی سبائی نے حضرات صحابہؓ کے متعلق بدگمانی پھیلانے کے لئے گڑھی ہے قرائن و علامات ملاحظہ ہوں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق اس روایت کے مطابق اس کے قائل ہیں کہ ان پر قبائلی عصبیت کا غلبہ ہے اور وہ خلیفہ ہوں گے تو اس سے کام بھی لیں گے یہاں تک کہ فتنہ اور ہنگامہ پیدا ہوگا اور خود خلیفہ شہید کر دیئے جائیں گے یہی نہیں بلکہ انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ اپنے قبیلہ کے جن لوگوں کو وہ مقرر کریں گے وہ معصیتوں کا ارتکاب بھی کریں گے گویا بالواسطہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ان معاصی کا سبب بنیں گے۔ یہ وہ چیز ہے جو مقصد خلافت ہی کو فوت کر دیتی ہے بلکہ اس کے ساتھ نسبت تضاد رکھتی ہے اس لئے کہ خلافت کا وجود ہی اطاعت الٰہی کو پھیلانے اور معاصی کو مٹانے کے لئے ہوتا ہے پھر ان سب باتوں کا حضرت فاروق اعظم کو اس قدر یقین تھا کہ انہوں نے قسموں پر قسمیں کھا کر ان کا اظہار فرمایا لیکن ان سب باتوں کے باوجود عین لقاء الٰہی کے قریب وہ جن حضرات کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کرتے ہیں ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی بھی ہے؟ کس قدر حیرت انگیز بات ہے

اور فاروق اعظمؓ کے ایسے محتاط شخص سے یہ کس قدر بعید ہے؟ وہی فاروق اعظمؓ جو اپنا جانشین مقرر کرنے سے بھی اس بنا پر گریز کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس ذمہ داری سے بری رہیں، لوگوں کے بہت اصرار پر چند آدمیوں کے نام بطور سفارش بتا دیتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو منتخب کر لو لیکن حضرت عثمان کی مبینہ قبائلی عصبیت اور اس سے پیدا ہونے والے دینی وملی نقصانات اور فتنوں کا علم ویقین رکھتے ہوئے بھی ان کا نام پیش کرتے ہیں؟ فیا للعجب؟

حقیقت یہ ہے کہ جس کذاب سبائی نے یہ روایت وضع کی تھی اس نے ایک تیر سے متعدد[1] شکار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ وغیرہ کے ساتھ وہ خود حضرت عمرؓ کو بھی مجروح کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اس فریب کو عام طور سے علماء اہل سنت سمجھنے سے قاصر رہے۔

(۲) اس روایت کے جعلی ہونے کا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ حضرت عثمانؓ کے ان عمال کے متعلق جنہیں مسلط کرنے کی پیشین گوئی موصوف نے فرمائی ہے قسم کھا کر اور یقین ووثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ وہ معاصی کا ارتکاب ضرور کریں گے۔ کسی مسلمان کے متعلق اس طرح کا سوءظن بھی جائز نہیں ہے، چہ جائیکہ سوءیقین۔ اور یہ بات ہرگز فاروق اعظمؓ کے شایان شان نہیں ہے اگر ممدوح کسی کے متعلق اسی قسم کی بات کسی ضرورت شرعی کی بنا پر فرماتے بھی تو زیادہ سے زیادہ احتمال اور اندیشہ کا اظہار فرماتے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کلام فاروقیؓ نہیں ہے بلکہ کسی سبائی کا گڑھا ہوا بے اصل وبے بنیاد افسانہ ہے اور یہاں بھی اس نے یک کرشمہ دو کار کا قاعدہ ملحوظ رکھا ہے۔

---

[1] اسی قسم کے مضمون کی ایک روایت استیعاب میں اور بھی ہے جس میں اس کے گھڑنے والے کسی سبائی کذاب نے حضرت سعدؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ متعدد حضرات پر فاروق اعظمؓ کی زبان سے نقد ونقل کیا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی جعلی اور سراپا کذب ودروغ روایت ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

یعنی حضرت عثمانؓ کے ساتھ حضرت عمرؓ کو بھی در پردہ مطعون کرنا چاہتا ہے۔

۱۳۔ جن اموی عمال کے متعلق ارتکاب معصیت کی یقینی پیشین گوئی فاروق اعظم فرما رہے ہیں وہ آخر ہیں کون؟ ان میں سے بعض تو وہی لوگ ہیں جو خود حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی مختلف عہدوں پر ممتاز رہے ہیں مثلاً حضرت معاویہؓ، حضرت ولیدؓ بن عقبہ، اگر حضرت عمرؓ ان کے متعلق رائے رکھتے تھے تو انہیں مقرر کیوں فرمایا تھا؟ اگر وہ عہد فاروقی میں عاصی نہ تھے تو ممدوحؓ نے ان کے متعلق بغیر کسی دلیل شرعی اس قسم کی رائے کیوں قائم فرمائی اور سوء ظن کیوں فرمایا، جو ہرگز جائز نہیں ہے اور ممدوح کی شان تو بہت فروتر ہے؟ اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت بالکل بے اصل اور سراپا دروغ ہے۔

ایک لطیفہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے استیعاب کی اس سراپا کذب و دروغ موضوع اور من گھڑت روایت میں بنی ابی معیط کے بعد قوسین میں بنی امیہ لکھ کر یہ مغالطہ دینا چاہا ہے، کہ دونوں ایک ہیں حالانکہ بنی ابی معیط بنو امیہ کا ایک چھوٹا سا خاندان تھا اور اس خاندان سے صرف ایک صاحب یعنی حضرت ولیدؓ بن عقبہ عہد عثمانیؓ میں گورنری کے عہدے پر فائز تھے اس مغالطہ انگیزی کی حاجت مودودی صاحب کو اس لئے محسوس ہوئی، بنی ابی معیط کا مسلط کر دینا بالکل خلاف واقعہ ہے، پھر حضرت فاروق اعظمؓ کی پیشین گوئی پوری ہونے کی کیا صورت باقی رہ گئی؟ اور اس کا پورا نہ ہونا روایت کے جعلی ہونے کا ایک قوی قرینہ بن جائے گا۔ حضرت عثمانؓ کی مخالفت کا جذبہ مودودی صاحب کو بے چین کر رہا تھا اور ان پر اعتراض کا کوئی پہلو پیدا ہو اس لئے مجبوراً انہیں مغالطہ انگیزی کی راہ اختیار کرنا پڑی وہ خود ہی فرمائیں کہ کیا اسی چیز کا نام تحقیق ہے؟

مصنف کی شانِ تحقیق کا اظہار ان کے اس طرز عمل سے بھی ہوتا ہے کہ موصوف نے

حضرت فاروق اعظمؓ کی اس رائے کا ذکر کیا جو استیعاب کی مندرجہ بالا موضوع بخاری روایت میں مذکور ہے لیکن اسی موضوع پر بخاری شریف کی روایت کو یکسر نظر انداز کر دیا، اپنے جانشینوں کے متعلق حضرت فاروق اعظمؓ نے جو وصیت فرمائی تھی وہ بخاری شریف میں اس طرح مذکور ہے :-

لوگوں نے کہا اے امیر المومنین وصیت فرما دیجئے اور کسی کو اپنا جانشین بنا دیجئے فرمایا اس امر کے متعلق چھ آدمیوں سے بہتر کسی کو نہیں پاتا۔ ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آخر تک راضی رہے پھر آپ نے علیؓ و عثمانؓ، زبیرؓ و طلحہؓ سعدؓ اور عبد الرحمنؓ بن عوف کے نام لئے اور فرمایا کہ عبد اللہ بن عمرؓ تمہارے ساتھ موجود رہیں گے ؛ ان کا اس معاملہ میں کچھ حصّہ نہ ہوگا۔ اب اگر حکومت سعدؓ کو ملے تو وہ اس کے اہل ہیں۔ ورنہ پھر تم میں سے جو کوئی بھی حاکم بنا لیا جائے اسے چاہیے کہ ان سے مدد لے۔ کیونکہ میں نے جو انہیں معزول کر دیا تھا تو کسی کمزوری و خیانت کی بنا پر نہیں کیا تھا "

پہلے تو بخاری شریف کی اس روایت اور استیعاب کی مذکورہ روایت کے درمیان اختلاف ملاحظہ فرمائیے :

استیعاب کی روایت بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ کے متعلق قبائلی عصبیت میں مبتلا ہونے کا سوءظن ظاہر کر رہے ہیں اور اپنی اس رائے پر انہیں یقین اور وثوق ہے، لیکن بخاری کی روایت ظاہر کر رہی ہے کہ وہ ان کے ساتھ کوئی سوءظن نہیں رکھتے ہیں بلکہ شہادت دے رہے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے تو ان سے راضی تھے۔ ظاہر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں جو قبائلی عصبیت کے جاہلی مرض میں

مبتلا ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس جاہلی عصبیت سے بالکل بری اور پاک تھے دونوں روایتوں میں یہ کھلا ہوا تعارض ہے۔

استیعاب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ کی خلافت کو موجب فتنہ سمجھتے تھے اور اس فتنہ کا بانی انہیں کو قرار دیتے تھے۔ بخاری کی روایت میں وہ انہیں جماعت صحابہ کے بہترین چھ افراد میں سے ایک قرار دے رہے ہیں اور منصب خلافت کے لئے موزوں ترین افراد میں ان کا شمار کر رہے ہیں، یہ بھی کھلا ہوا تعارض ہے۔

استیعاب کی دوسری روایت کو لیا جائے جس میں مذکورہ بالا سب حضرات میں کچھ نہ کچھ دق نکالی گئی ہے تو بخاری کی روایت اور اس کے درمیان تعارض و اختلاف کی خلیج اور بھی وسیع ہو جاتی ہے۔

مودودی صاحب نے پہلی زیادتی تو یہ کی کہ بخاری شریف کی اس روایت کو بالکل نظرانداز کر دیا حالانکہ جب ایک واقعہ کے متعلق ایک روایت اس کتاب کی ہو جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے لقب سے ملقب ہے اور دوسری ایسی کتاب کی ہو جس میں صحت کا کوئی التزام نہیں، پھر اس کی سند میں کذاب اور شیعی ہوں تو ہر صداقت پسند اور منصف مزاج شخص بخاری شریف کی روایت پر اعتماد کرے گا، اور استیعاب کی روایت کو رد کر دے گا مگر یہ وہی شخص کرے گا جس کی نیت درست ہو جو شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماہ تقدس و تقویٰ پر خاک ڈالنے پر تلا ہوا ہو وہ تو وہی کرے گا جو مودودی صاحب نے کیا ہے۔

ممکن ہے کہ کسی صاحب کو شبہ ہو کہ استیعاب اور بخاری کی دونوں روایتوں کا تعلق دو الگ الگ واقعات سے ہے اس لئے تعارض کے کوئی معنی نہیں ہیں، جواب یہ ہے کہ مسئلہ واقعات کی دوئی اور وحدت کا نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کی جو رائے استیعاب سے معلوم ہوتی ہے

وہ اس رائے کے بالکل خلاف ہے جو بخاری کی روایت سے معلوم ہوتی ہے ان دونوں میں تعارض ہے یا نہیں ؟ کیا ممدوح کی رائے اتنی جلد تبدیل ہو گئی ؟ اور اگر ہو گئی تو مودودی صاحب کے استدلال کا قصر خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ جس رائے کو خود حضرت فاروق اعظمؓ تبدیل فرما چکے تھے اس کا تذکرہ اور اس سے استدلال کس شرعی و اخلاقی قانون و ضابطے سے جائز ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ استیعاب کی دونوں روایتیں سراپا کذب و دروغ اور کسی سبائی کی وضع کردہ ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ حضرت عثمانؓ اور مذکورہ بالا سب حضرات کے متعلق کوئی سوءِ ظن نہ رکھتے تھے بلکہ وہی حسن ظن رکھتے تھے جس کا اظہار بخاری شریف کی صحیح روایت سے ہو رہا ہے اس سلسلہ میں مودودی صاحب حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں :-

> "بعض لوگ اس جگہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا حضرت عمرؓ کو الہام ہوا تھا جس کی بنا پر انہوں نے قسم کھا کر وہ بات کہی جو بعد میں جوں کی توں پیش آئی ؟"
>
> (حاشیہ ص ۹۹)

مگر وہ بات جوں کی توں پیش ہی کب آئی ؟ بزعم مودودی صاحب حضرت عمرؓ نے تو بنی ابی معیط کے تسلط کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ حالانکہ عہد عثمانی میں اس خاندان کے صرف ایک صاحب یعنی حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ عہدیدار بنے تھے اور وہ بھی عہد فاروقیؓ بلکہ عہد صدیقیؓ سے حاکمانہ خدمت پر مامور تھے۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں عامل زکوٰۃ مقرر فرمایا تھا۔ کیا اس کا نام تسلط ہے ؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو حضرت عمرؓ کی بات جوں کی توں کہاں پیش آئی ؟ اگر حضرت فاروق اعظمؓ نے کوئی بات فرمائی ہوتی تو پیش آتی لیکن جب سرے سے آپ نے اس قسم کی کوئی بات فرمائی ہی نہ تھی تو پیش کیسے آتی ؟ اب مولانا کی شان تحقیق ہے کہ اس خلاف واقعہ خبر کے بارے میں انہیں اصرار ہے کہ اسے بے دلیل بلکہ خلاف دلیل بھی تسلیم کر لیا جائے اور

مان لیا جائے کہ وہ بات جوں کی توں پیش آگئی۔

مندرجہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:۔

"اس کا جواب یہ ہے کہ ایک صاحب بصیرت آدمی بسا اوقات حالات کو دیکھ کر جب انہیں منطقی طریقہ سے ترتیب دیتا ہے تو اسے آئندہ رونما ہونے والے نتائج دو اور دو چار کی طرح نظر آنے لگتے ہیں وہ الہام کے بغیر اپنی بصیرت ہی کی بنا پر ایک صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ یہ جانتے تھے کہ عرب میں قبائلی عصبیت کے جراثیم کتنے گہرے اترے ہوئے ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ۲۵ - ۳۰ سال کی تبلیغ اسلام نے ابھی ان جراثیم کا پوری طرح قلع قمع نہیں کیا ہے اس بنا پر وہ یقین رکھتے تھے کہ اگر ان کی اور حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی میں ذرہ برابر بھی تغیر کیا گیا اور ان کے جانشین نے اپنے قبیلے کے آدمیوں کو بڑے بڑے عہدے دینے شروع کر دیئے تو قبائلی عصبیتیں پھر کسی کے دبائے نہ دب سکیں گی اور وہ لازماً خونی انقلاب پر منتج ہونگی"

حضرات ناظرین سے گذارش ہے کہ وہ مودودی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت کو غور سے پڑھیں خصوصاً خط کشیدہ جملوں پر توجہ فرمائیں تاکہ مندرجہ ذیل امور کا سمجھنا آسان ہو جائے جو عبارت مذکور کے متعلق مجھے عرض کرنا ہیں۔ اول پہلی ہی سطر کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حالات کیا تھے؟ اور کب پیش آئے، جنہیں دیکھ کر فاروق اعظمؓ نے قبائلی عصبیت کے وجود کا اندازہ فرمالیا؟ کیا عہد فاروقیؓ میں کوئی ایسا فتنہ پیدا ہوا تھا جو قبائلی عصبیت پر مبنی ہو؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آخر آں ممدوحؓ نے کن حالات سے اس کا اندازہ فرمالیا؟ تاریخ عہد فاروقیؓ میں اس قسم کے ایک واقعہ کی بھی اطلاع نہیں دیتی ہے۔ ایسی صورت میں حالات کا حوالہ مودودی

صاحب کی ذہنی اختراع نہیں تو اور کیا ہے ؟

مودودی صاحب کے اس ذہنی مفروضہ کی کوئی ادنیٰ دلیل بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حدیث سے اس کے خلاف دلیل ملتی ہے۔ بخاری کی روایت ذیل پر نظر کیجئے :۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو فتنہ کے بارے میں آنحضور صلے اللہ علیہ علیہ کی بات یاد ہے ؟ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ انسان اہل و مال و اولاد اور پڑوسیوں کے بارے میں فتنے میں مبتلا ہوتا ہے، جس کی تلافی نماز، صدقہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہو جاتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس فتنہ کے متعلق نہیں پوچھ رہا ہوں، میں اس فتنہ کے متعلق دریافت کر رہا ہوں جو موج دریا کی طرح رواں ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا کہ اس فتنہ سے آپ کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے آپ کے اور اس کے درمیان دروازہ بند ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ دروازہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا کہ توڑا جائے گا۔ اس پر فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ پھر کبھی بند نہ ہو سکیگا۔

(اس کے ایک راوی شقیق کہتے ہیں) کہ ہم نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمرؓ اس دروازے کو جانتے تھے انہوں نے کہا کہ ہاں ایسا جانتے تھے جیسے آج کے بعد کل کے دن کو جانتے تھے اس لئے کہ میں نے ان سے حدیث بیان کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے (شقیق کہتے ہیں) کہ ہم فرط رعب سے حضرت حذیفہؓ سے یہ نہیں پوچھ سکے کہ دروازے سے کیا مراد ہے لیکن ہم نے حضرت مسروقؓ سے دریافت

کرنے کے لئے کہا، ان کے دریافت کرنے پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ وہ دروازہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

(بخاری جلد ثانی کتاب الفتن باب الفتنۃ تموج کموج البحر)

بخاری شریف کی اس روایت سے واضح ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں کوئی قابل ذکر فتنہ و ہنگامہ نہیں ہوا سید الصادقین کی پیشین گوئی کے بموجب ہو بھی نہ سکتا تھا پھر وہ کون حالات تھے جن سے حضرت فاروقؓ نے قبائلی عصبیت کی موجودگی کا اندازہ کر لیا تھا اور اندازہ بھی ایسا کہ اس پر قسم کھا بیٹھے؟ سو اس کے کیا کہا جائے کہ مودودی صاحب فرضی حالات کا مبہم تذکرہ کر کے قاری پر اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا اثر صحابہ کرام پر سے وفات نبوی کے بہت قلیل عرصے بعد ہی زائل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ خالص شیعی نظریہ ہی جس کی طرف ذہن کا رخ موڑ کر موصوف شیعیت کی ایک اہم خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔

دوم: جناب مصنف نے یہ فرما کر کہ ۲۵۔۳۰ سال کی تبلیغ سے بھی عرب میں قبائلی عصبیت کے جراثیم فنا نہیں ہوئے تھے خالص شیعی طرز فکر کا اظہار فرمایا ہے۔ شیعہ بھی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تربیت و تزکیہ کو معاذ اللہ ناکام بدرجہ ناقص اور ناکام ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ درحقیقت یہی فاسد نظریہ ان کے مذہب کی حجیت کا ستون ہے۔ مودودی صاحب ان کی تائید فرما رہے ہیں کہ بیشک برسوں کی کدوکاوش کے بعد بھی معاذ اللہ آنحضور عرب سے قبائلی عصبیت زائل کرنے میں ناکام رہے۔ ہمارے علماء اور صاحبان معرفت کا دعویٰ ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک روشن معجزہ یہ بھی تھا کہ آپ نے بہت قلیل مدت میں ہزاروں سے متجاوز افراد کی کایا پلٹ دی اور ان افراد کو مکارم اخلاق اور پاکیزگی جذبات میں اوج کمال پر پہنچا دیا۔ جو پستی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ آنحضور کا یہ ایسا جلی اور واضح معجزہ ہے جس کا اعتراف و اقرار

غیر مسلموں نے بھی کیا ہے اور کرتے ہیں، لیکن مودودی صاحب کے قول کے بموجب تو اسے محض شاعری کہا جائے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

سوم: مصنف نے عرب کی قبائلی عصبیت کا تذکرہ کیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ عرب سے کیا مراد ہے؟ صحابہ کرام؟ یا صحابہ کے علاوہ دوسرے مسلمان؟ یا دونوں؟ اس معاملے کو مودودی صاحب نے قصداً مبہم رکھا ہے۔ وہ صحابہ کرام کو اس عصبیت میں ملوث ظاہر کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کے ثبوت سے عاجز ہیں۔ اس لئے عرب کا مجمل و مبہم لفظ استعمال کرتے ہیں تاکہ ناواقف پڑھنے والا صحابہ سے بدگمان بھی ہو جائے۔ اس لئے کہ ان کی اکثریت عرب ہی تھی بلکہ تقریباً سب ہی عرب تھے اور کوئی معترض ہو تو مفر یہ ہے کہ میں نے صحابہ کو کب کہا ہے میں نے تو عرب کو کہا ہے۔ آپ کا جی چاہے تو اس ہوشیاری کی داد دیجئے ورنہ اس پر اظہار افسوس کیجئے۔

ہم پچھلے صفحات میں واضح کر چکے ہیں کہ مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کہ عرب میں قبائلی عصبیتیں آنحضور اور احسان قدار کے بعد بہت شدت کے ساتھ ابھر آئی تھیں بالکل غلط، بے بنیاد اور بے دلیل ہے۔

چہارم: خالص شیعی زاویہ نظر اختیار کر کے مودودی صاحب نے اس زمانے کے سب فتنوں اور ہنگاموں کا سرچشمہ قبائلی عصبیت کو بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہی شیعہ کہتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مودودی صاحب کا محض مفروضہ اور خالص شیعی نقطہ نظر ہے جو سرتاپا غلط اور فاسد ہے۔ اس مسئلہ میں اہل سنت اور شیعہ کے نقطہ نظر کا اختلاف ظاہر کرنے کے لئے حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ کو سامنے رکھئے اہل سنت کے نزدیک یہ مناقشہ بعض نظریات میں اجتہادی اختلاف سے پیدا ہوا تھا اور شیعوں کے نزدیک یہ قبائلی عصبیت کا رہین منت تھا۔ مودودی صاحب بھی قاری کے ذہن کو اسی شیعی نظریہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں مگر بہت ہوشیاری کے ساتھ۔

تبصرہ: مودودی صاحب تاریخ اسلام کے فتنۂ اولیٰ (جو شہادت حضرت ذی النورین پر منتج ہوا) کا اصل سبب قبائلی عصبیت کو قرار دیتے ہیں۔ اسی جگہ سے دیوار کی خشت اول کج ہو جاتی ہے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان کا یہ بیان بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے لیکن مولانا اس فتنۂ عظیمہ کا رشتہ قبائلی عصبیت سے جوڑ کر سبائی مفسدین یعنی قاتلین حضرت عثمانؓ کا جرم ہلکا کرنا چاہتے ہیں اور ان کے جرم عظیم کا ایک حصہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دامن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

فاروق اعظمؓ کی وصیت

مودودی صاحب نے طبری اور طبقات ابن سعد کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:-

"اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا، چنانچہ آخری وقت میں انہوں نے حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو بلا کر ہر ایک سے کہا کہ اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا، مزید براں چھ آدمیوں کی انتخابی شوریٰ کے لئے انہوں نے جو ہدایات چھوڑیں ان میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ منتخب خلیفہ اس امر کا پابند رہے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا۔" ص ۹۹

صرف انتخابی شوریٰ کے لئے مندرجہ بالا ہدایات کے سلسلہ میں انہوں نے فتح الباری کا حوالہ بھی دیا ہے۔ تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد کے متعلق واضح کیا جا چکا ہے کہ ان کا کیا درجہ ہے۔ فتح الباری کی تاریخی روایتیں بھی انہیں کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اس کی وضاحت بھی ہم پہلے کر چکے ہیں۔ صاحب فتح الباری خود نہ کوئی مورخ تھے نہ ابن اسحاق، طبری، واقدی کے علاوہ تاریخ میں ان کا

کوئی دوسرا ماخذ تھا۔ اس لئے اس بارے میں ان کی نقل کو کوئی خاص وزن نہیں دیا جا سکتا۔ پچھلے صفحات میں اس مسئلہ پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں اس مختصر تمہید کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وصیت پر نظر کیجیے جو صحیح بخاری میں منقول ہے:۔

"لوگوں نے کہا اے امیر المومنین (انتخاب خلیفہ کے بارے میں) کچھ وصیت کر دیجیے اور کسی کو اپنا جانشین بنا دیجیے فرمایا کہ میں خلافت کا مستحق ان چھ آدمیوں سے زیادہ کسی کو نہیں پاتا۔ ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آخر وقت تک خوش رہے وہ حضرات عثمان، علی، زبیر، طلحہ، سعد، عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہم) ہیں اور عبداللہ بن عمرؓ تمہارے ساتھ موجود تو رہیں گے مگر خلافت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا (حضرت ابن عمرؓ کے موجود رہنے کو شاید ان کی دل دہی کے لئے فرمایا تھا) اگر خلافت سعدؓ کو ملے تو وہ اس کے اہل ہیں ورنہ پھر تم میں سے جو خلیفہ ہو اسے ان سے امداد لینا چاہئے، کیوں کہ میں نے جو انہیں معزول کیا تھا وہ ان کی کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں کیا تھا"

(صحیح بخاری جلد اول قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمانؓ)

ملاحظہ ہو کہ ان ہدایات میں کہیں بھی اس کا تذکرہ ہے کہ خلیفہ اپنے قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہ کرے گا؟ بخاری شریف کی اسی روایت میں امام عادل فاروق اعظم کی ان گراں قدر وصیتوں کا بھی تذکرہ ہے جو انہوں نے اپنے امکانی جانشین کو کی ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

"حضرت عمرؓ نے (زخمی ہونے کے بعد شہادت سے کچھ دیر پہلے) فرمایا میں اپنے بعد کے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ ان لوگوں کا حق ضرور پہنچائیں جنہوں نے شروع ہی میں ہجرت کی تھی۔ ان کے اعزاز و احترام کی حفاظت کریں اور میں انہیں انصا

کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں جنہوں نے ایمان کی پختگی کے ساتھ
مہاجرین اولین کو ٹھکانا دینے کا انتظام کیا۔ ان کے خطا کار دل سے چشم پوشی کرنا
چاہیئے اور میں (اپنے جانشین کو) مختلف بلاد اسلامیہ میں رہنے والوں کے ساتھ
بھلائی کی وصیت کرتا ہوں اس لئے کہ وہ اسلام کے پشت پناہ ہیں، وہی مملکت
اسلامیہ کے لئے آمدنی کا ذریعہ اور دشمنوں کے لئے دل جلنے کا سبب ہیں ان سے
محاصل میں (زکوٰۃ وغیرہ) وہی زائد مال لیا جائے جو وہ خوشی سے دیں انہیں
میدانوں میں بسنے والوں کے متعلق بھی وصیت کرتا ہوں وہی اصل عربی خمیر اور
مادۂ اسلام ہیں۔ ان سے جو زکوٰۃ لی جائے وہ انہیں کے محتاجوں کو تقسیم کر دی
جائے میں انہیں ذمیوں کے متعلق وصیت کرتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے
رسول کی حمایت میں ہیں ان سے جو معاہدہ ہوا ہے اسے پورا کیا جائے اور ان کی
حفاظت کے لئے ہر حملہ آور سے جنگ کی جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ
ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔ (۴۰)

روایت کو پھر ایک بار پڑھ جائیے کہیں بھی یہ مذکور ہے کہ خلیفہ اپنے قبیلہ کے لوگوں کو عوام کی
گردنوں پر مسلط نہ کر دے؟ یا کوئی جملہ ایسا ہے جس کا مفہوم یہ ہو کہ وہ اپنے قبیلہ کے لوگوں کے
ساتھ امتیازی برتاؤ نہ کرے؟ ان دونوں باتوں کا روایت کے دونوں اقتباسوں میں سے کسی میں
بھی شائبہ تک نہیں ہے؟ لیکن مودودی صاحب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی روایت
تو پسند نہ آئی اور طبری کی روایت پسند آئی جس کا بخاری شریف کے مقابلہ میں کوئی درجہ
نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی صاحب یہ شبہ کریں کہ اگرچہ بخاری شریف کی روایت میں ان دونوں

باتوں کا تذکرہ نہیں ہے، مگر کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو ان کے معارض ہو، ہو سکتا ہے کہ جس روایت میں یہ دونوں باتیں ہیں وہ امام بخاری کے شرائط پر پوری نہ اترتی ہو اس لئے انہوں نے اپنی کتاب میں اسے درج نہیں کیا لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت نامقبول ہو اہو سکتا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنی وصیتوں میں یہ بات بھی فرمائی ہو مگر بعض رواۃ نے اسے ضبط نہ کیا ہو۔

لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے وجوہ درج ذیل ہیں :۔

اوّل : اس قسم کا احتمال اس وقت وزنی ہو سکتا تھا جب حدیث کی کسی معتبر کتاب میں بخاری کی روایت پر زیادتی ہوتی۔ تاریخ کی کتاب اور بخاری شریف کا کیا مقابلہ ؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اس کی روایت کا اتنا ہی حصہ قابل اعتبار قرار پائے گا جو مؤلف کی خوش نصیبی سے حدیث کے موافق ہو گا باقی ساقط الاعتبار ہے۔ ایک ہی مرض کا ایک ہی نسخہ دو کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر ایک کتاب کسی مستند فن داں حاذق طبیب کی لکھی ہوئی ہے اور دوسری کسی عطائی اور کم علم کی، تو اس دوسری کتاب میں کچھ اجزاء نسخہ میں اول سے زائد ہیں۔ ایسی صورت میں ہر عاقل صرف انہیں اجزائے نسخہ کو صحیح اور قابل اعتماد سمجھے گا جو ماہر و حاذق طبیب کی کتاب میں ہیں اس غیر ماہر کی زیادتی پر ہرگز اعتماد نہ کرے گا۔

دوم : ہم عرض کر چکے ہیں کہ طبری میں خود تشیع کی بدعت ہے اور مبتدع کی روایت جو اس کے مسلک کی موئد ہو باتفاق محدثین و فقہاء قابل قبول نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر فاروق اعظمؓ کی وصیت میں زیر بحث دونوں باتیں شامل ہیں تو اس سے حضرت عثمانؓ پر اقربا نوازی کا غلط الزام عائد کرنے میں امداد ملتی ہے اور شیعوں کے اس فاسد و خلاف حقیقت نظریہ کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ فاروق اعظمؓ کے بعد فتنوں میں اصل سرچشمہ قبائلی عصبیت تھی۔ اس لئے یہ دونوں حصے ہرگز

قابل قبول نہیں رہی۔

سوم: نفسیاتی اعتبار سے انسان وصیت کو بہت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے خصوصاً جب وصیت اتنی بڑی شخصیت کی ہو اور ایسے غیر معمولی حالات میں کی جائے اہمیت میں مزید اضافہ اس وجہ سے بھی ہو جاتا ہے۔ ان وصایا کا تعلق سیاسی امور سے تھا۔ اس غیر معمولی اہمیت اور قوی نفسیاتی محرک کے باوجود یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ بخاری کے رواۃ نے تو اسے محفوظ نہیں رکھا لیکن طبری کے رواۃ نے اسے محفوظ رکھا۔ حالانکہ بخاری کے رواۃ حفظ و ضبط اتقان و احتیاط میں طبری کے رواۃ سے کہیں بہتر و برتر ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ اضافہ کسی سبائی نے کیا ہے اور حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔ طبری نے حسب عادت غلط صحیح سب کو سمیٹ لیا یا کچھ عجیب نہیں کہ یہ الحاق خود طبری نے اپنے تشیع کی وجہ سے کر دیا ہو۔

اس کے علاوہ اس روایت کو مشکوک بنا دینے والی ایک علامت یہ ہے کہ بخاری شریف کی روایت، نیز خود طبری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت فاروق اعظمؓ نے مذکورہ بالا تینوں حضرات کو بلایا ہے تو چند خاص خاص حضرات صحابہ موجود تھے، مجمع عام نہ تھا۔ بخاری کی اسی روایت میں ہے کہ:

"پھر آپ نے لوگوں کو آنے کی اجازت دی اور مہاجرین و انصار مکان میں داخل ہو گئے"

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ انصار میں سے ہیں، جو حضرات شروع میں موجود تھے ان میں ان کا نام کہیں نہیں آتا۔ نہ انہیں اتنی خصوصیت حاصل تھی کہ ان کا ابتدا ہی سے موجود ہونا سمجھ میں آتا ہو۔ بظاہر انصار کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور اس وصیت کے بعد وہاں پہنچے، انہوں نے وصیت نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ حضرت مسور ابن مخرمہ تو غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ مابعد کے راویوں

میں سے کسی نے ان کی طرف اس کی غلط نسبت کی ہے۔

طبری کی اس روایت میں مزید کمزوری یہ ہے کہ اس کا ایک راوی سلیمان بن عبد العزیز غیر معروف شخص ہے۔ طبری کی اس روایت کے غلط ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے البدایۃ والنہایۃ میں علامہ ابن کثیر نے وصیت فاروقی کے ذیل میں اتنا ہی حصہ ذکر کیا ہے جتنا بخاری میں مذکور ہے۔ طبری کی روایت کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طبری کی روایت جسے مولانا نے اپنے نظریہ کی تائید میں نقل کیا ہے، باطل اور قابل رد ہے۔ بخاری کی روایت چھوڑ کر اسے اختیار کرنے کی وجہ سوا اس کے اور کوئی نظر نہیں آتی کہ اس سے مولانا کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنے کا راستہ قدرے ہموار ہو جاتا ہے۔

روایت کے ساقط عن الاعتبار ہونے سے قطع نظر مولانا نے اس کا مفہوم بھی سوء ظن اور عداوت صحابہ کے اندھیرے میں سمجھنے کی کوشش فرمائی ہے، اسی لئے اس کا صحیح مطلب بھی ان پر روشن نہیں ہو سکا۔ اگر بالفرض ہم اس روایت کو قبول بھی کرلیں تو بھی مولانا کا مدعا غیر ثابت رہتا ہے۔ اپنے قبیلے والوں کو عوام کی گردنوں پر مسلط کرنے سے منع کرنے کا کیا یہ مطلب ہے کہ کسی اپنے قبیلے والے کو کبھی کسی منصب پر مقرر نہ کرنا خواہ اس کے مقرر کرنے میں کوئی اہم مصلحت ہی کیوں نہ ہو؟ گویا دستوری قانون یہ مقرر ہوا کہ جس قبیلہ کا آدمی خلیفہ مقرر ہو جائے اس کے سب افراد ملازمت کے حق سے محروم کر دیئے جائیں، یہ کون سا اسلامی قانون ہے؟ اور کس دلیل شرعی سے ثابت ہے؟ حکومت میں منصب پانے کا حق ہر جمہوری مملکت میں ہر شہری کو حاصل ہوتا ہے جو اسے شہریت کی بنیاد پر لازماً ملتا ہے۔ کیا فاروق اعظمؓ شہریت کے اس حق سے اپنے جانشین کے اہل خاندان کو محروم کرنا چاہتے تھے؟ آج کل نسلی عصبیت کے بجائے وطنی عصبیت کا زور زیادہ ہے اس لئے اس اصول کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خلیفہ کے وطن کے کسی شخص کو بھی کوئی سرکاری ملازمت

نہ ملنا چاہئے مثلاً صدر ایوب[1] خان صاحب مغربی پاکستان کے رہنے والے ہیں تو مودودی صاحب کی اس تشریح کی بنا پر مغربی پاکستان کے کسی باشندے کو کم از کم حکومت کا کوئی اہم عہدہ نہ ملنا چاہئے؟ کیا خوب تشریح ہے۔

جناب والا! اس کا سیدھا سادھا اور صاف مفہوم یہ ہے کہ اپنے قبیلہ کو حکومت کی پالیسی پر اس قدر موثر نہ بنادیں کہ خلافت میں بجائے جمہوریت کے پارٹی ڈکٹیٹر شپ کی طرح خاندان اور قبائلی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے جیسا کہ آج کمیونسٹ ممالک میں ہو رہا ہے کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود کمیونسٹ پارٹی پوری مملکت پر چھائی رہتی ہے اور سیاہ و سپید صرف اسی کے اختیار میں رہتا ہے اس صورت میں اور آئین کے ماتحت عہدے اور مناصب عطا کرنے کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

اسی طرح چند مناصب اور عہدے دیدینا اپنے قبیلے کے ساتھ امتیازی برتاؤ کے مرادف نہیں ہے۔ امتیازی برتاؤ کی صرف یہ صورت ہے کہ دوسروں کے حقوق کو ان کے مقابلے میں نظر انداز کیا جائے۔ بطور مثال مناصب ہی کے معاملے کو لے لیجئے اگر دو شخص ایک منصب کے اہل ہیں لیکن ایک شخص کی اہلیت زیادہ ہے اور اسے مقرر کرنے میں اجتماعی مصلحت بھی زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر دوسرے کا تقرر محض رشتہ اور قرابت کی بنا پر کر دیا گیا اور پہلے پر اسے ترجیح دی گئی تو یقیناً اسے امتیازی برتاؤ اور ناانصافی کہا جائے گا۔ لیکن اگر ا قریب شخص صلاحیت کے لحاظ سے دوسرے پر فائق ہے یا دینی و ملی مصلحت اس کے تقرر سے زیادہ حاصل ہوتی ہے تو

---

[1] طبع ثانی کے وقت ایوب خان صاحب اپنی بے راہ روی اور نادانیوں کی وجہ سے ایک سبائی سازش کا شکار ہو کر صدارت سے معزول ہو چکے ہیں۔ اب ان کی جگہ ایک شیعہ یحییٰ خان صاحب صدر جمہوریہ ہیں۔

محض خاندانی تعلق ہونے کی وجہ سے اس کے تقرر کو امتیازی برتاؤ ہرگز نہیں کہا جا سکتا مگر مودودی صاحب کو چونکہ حضرت عثمانؓ پر اعتراض و طعن کرنا بہر حال مقصود ہے، اس لئے انہوں نے حضرت عمرؓ کی ان دونوں فرضی وصیتوں کا رخ اسی سمت موڑا جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"مگر بد قسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ اس معاملے میں معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے ان کے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے عطیے دیئے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔" ص ۹۹

وہ معیار مطلوب کیا تھا؟ اور کسے مطلوب تھا؟ اسے مولانا نے بالکل واضح نہیں فرمایا۔ اگر اس سے مراد وہی ہے جس کا تذکرہ وصیت فاروقی کے ذیل میں مودودی صاحب نے کیا ہے یعنی خلیفہ کے خاندان و قبیلہ کا کوئی شخص کسی منصب پر فائز نہ ہونے پائے تو ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ خود مودودی صاحب کا وضع کیا ہوا معیار ہے جو انہیں کو مطلوب ہے وہ بھی صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا ان صحابہ کے متعلق جن پر طعن کرنا انہیں مطلوب ہو ورنہ یہ معیار نہ شریعت نے مقرر فرمایا ہے اور نہ حضرات خلفائے راشدین نے اسے کسی اصول و معیار کی حیثیت دی۔ علیٰ ہذا یہ فی نفسہ مطلوب بھی نہیں ہے، نہ شرعاً نہ عقلاً اس کا تعلق حالات و مصالح سے ہے جن کے اعتبار سے کبھی اس پر عمل کرنا مطلوب ہوتا ہے اور کبھی ترک کرنا۔

مودودی صاحب نے اپنے خود ساختہ معیار مطلوب کو قائم نہ رکھنے کی تشریح میں حضرت ذی النورین پر بنو امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے دینے اور انہیں بیت المال سے عطیے دینے کا الزام لگایا ہے۔ ان الزاموں کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

عہدِ عثمانی میں بنو امیہ کے عہدے

تاریخ اسلام کی معروف کتابیں واضح کر رہی ہیں کہ عہد عثمانیؓ میں صرف مندرجہ ذیل اموی حضرات حکومت کے نمایاں مناصب پر فائز تھے۔

(۱) حضرت مروان ابن الحکم (۲) حضرت ولید بن عقبہ (۳) حضرت سعید بن العاص (۴) حضرت عبداللہ بن عامر (۵) حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہم وارضاہم۔

ان کے علاوہ اس ذیل میں حضرت عبداللہ بن ابی سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا نام بھی لیا جاتا ہے لیکن وہ اموی نہیں ہیں۔

ان حضرات میں حضرت معاویہؓ اور حضرت ولیدؓ دونوں عہد فاروقیؓ سے بڑے عہدوں پر فائز چلے آرہے تھے ان کا تقرر حضرت عثمانؓ نے نہیں کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح کا تقرر بھی عہد فاروقی میں ہوا تھا۔ البتہ تین حضرات ایسے ہیں جنہیں حضرت عثمانؓ نے اہم عہدوں پر فائز کیا یعنی حضرت مروانؓ حضرت سعیدؓ ابن العاص اور حضرت عبداللہؓ بن عامر۔

عہد نبوی کے اموی عہدہ دار

(۱) بنو امیہ میں سے مندرجہ ذیل حضرات کو اعلیٰ مناصب پر خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا (۱) حضرت عثمان بن عفان (۲) حضرت عمرو بن سعید (۳) حضرت عبداللہ بن سعید (۴) حضرت ابان بن سعید (۵) حضرت سعید بن سعید (۶) حضرت عثمان بن سعید (۷) حضرت ابوسفیان بن حرب (۸) حضرت معاویہ بن ابی سفیان (۹) حضرت یزید بن ابی سفیان (۱۰) حضرت خالد بن سعید حضرت عتابؓ بن اسید رضی اللہ عنہم اجمعین۔

عہد صدیقی کے اموی عہدیدار

مندرجہ ذیل حضرات جو سب کے سب بنو امیہ میں سے تھے۔ عہد صدیقی میں مختلف اہم عہدوں پر مامور رہے۔ حضرت عتابؓ بن اسید۔ حضرت خالدؓ بن سعید۔ حضرتؓ ابان بن سعید۔ حضرتؓ ابوحذیفہ بن عتبہ۔ حضرتؓ یزید بن ابی سفیان۔ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہم ان میں سے ۵ تا ۶ آنحضور ہی کے مقرر فرمائے ہوئے تھے۔ صدیق اکبرؓ کے عہد میں بھی مامور رہے۔ حضرت ولیدؓ بن عقبہ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے شرق اردن پر لشکر کشی کے سلسلہ میں ایک لشکر کا سپہ سالار بنا کر بھیجا

عہد فاروقی کے اموی عہدیدار

حضرتؓ عتاب بن اُسید۔ حضرتؓ یزید بن ابی سفیان۔ حضرتؓ معاویہ بن ابی سفیان۔ حضرتؓ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہم۔ اوپر کی فہرست دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بعض حضرات تو عہد نبوی ہی سے اہم خدمات پر مامور چلے آ رہے ہیں۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ بنو امیہ میں سے گیارہؓ حضرات عہد نبوی میں عہدیدار تھے، عہد صدیقی میں چھؓ، عہد فاروقی میں پانچؓ اور عہد عثمانی میں صرف چارؓ۔ ۱۱ - ۶ - ۵ چار سے زیادہ ہیں یا چار ان اعداد سے زیادہ ہے؟ حساب کا سادہ سوال ہے، مگر مودودی صاحب کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ چار ان سب اعداد سے زیادہ ہے۔ ہر منصف مزاج سمجھ سکتا ہے کہ اموی عہدیدار عہد عثمانی میں ماقبل کے تینوں ادوار سے کم تھے لیکن مودودی صاحب کو یہ قلت ۔ کثرت نظر آ رہی ہے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی پیش نظر رکھئے کہ عہد عثمانی میں اسلامی خلافت کے حدود کس قدر

وسیع ہو گئے تھے، براعظم ایشیا کا اکثر حصہ اور براعظم افریقہ کا ایک وسیع حصہ اسلامی حکومت کے زیر نگیں آچکا تھا، لاکھوں مربع میل کے اس وسیع رقبہ پر معمولی عہدیداروں کی نہیں موثر اور اونچے درجہ کے منصب داروں کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ ان میں چار نفر اموی عہدیداروں کا وجود آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن مودودی صاحب کو یہ قلیل اور غیر معتد بہ تعداد کثیر نظر آتی ہے اور الفاظ کا وزن کئے بغیر نہایت بے احتیاطی کے ساتھ مولانا فرماتے ہیں کہ انہوں نے بنو امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے دیئے تھے، اب سوا اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کو جو تعلق حضرت ذی النورینؓ اور بنو امیہ کے ساتھ ہے وہی انہیں اس صریح غلط بیانی پر آمادہ کر رہا ہے مولانا کو خود بھی اپنی غلط بیانی اور اس کمزوری کا احساس تھا اس لئے انہوں نے آگے چل کر پہلو بدلنے کی بھی کوشش کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اموی حضرات کو بہت اہم عہدوں پر مامور کر دیا تھا جس سے ان کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ لیکن اول تو اس صورت حال کو کثرت کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اگر یہی کہنا تھا تو یوں کہتے کہ انہوں نے بنو امیہ کو بہت اہم عہدے دے دیئے تھے، "کثرت" کے معنی "اہم" کے آخر کس لغت میں ہیں؟ مگر مولانا نے درحقیقت ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیا ہے، وہ حضرت ذی النورینؓ کے خلاف جذبات ابھارنا چاہتے ہیں، اس لئے پہلے تو انہوں نے "کثرت" کا بے بنیاد دعویٰ کر دیا، اس کے بعد عہدوں کی اہمیت کا قصہ چھیڑ دیا تاکہ اس بحث میں الجھ کر پڑھنے والا اس غلط دعوے کو پرکھنے کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے اور اس سے متاثر ہو کر حضرت عثمانؓ سے بدعقیدہ ہو جائے اس لئے کہ کم از کم بعض کے عہدوں کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا، ایک ناواقف اسے صحیح پا کر کثرت کے دعوے کو بھی اس پر قیاس کر سکتا ہے۔ یہ ہے مولانا کی شان تحقیق جسے اہل علم کی لغت میں ہوشیاری اور مغالطہ دہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس سے کوئی واقف اور سمجھدار تو متاثر ہو نہیں سکتا البتہ اس "شیخ ٹکنک" نے مولانا

کی شیعیت کو اور نمایاں کر دیا ہے۔

اس پر تفصیلی بحث تو انشاء اللہ اسی مقام پر آئے گی جہاں مولانا نے ان عہدوں کی اہمیت کی بحث چھیڑی ہے یہاں اتنی بات عرض کر دوں کہ عہدے کتنے ہی اہم اور بڑے کیوں نہ ہوں اگر ماتحت افسران و حکام تعاون نہ کریں تو ان کی اہمیت کچھ بھی باقی نہیں رہتی۔ کسی صوبہ کا گورنر کوئی پالیسی اختیار کرے لیکن اگر اضلاع کے ڈپٹی کمشنر اس سے تعاون نہ کریں تو وہ پالیسی ہرگز عملی جامہ نہیں پہن سکتی۔ یہ روز مرہ کے تجربات و مشاہدات ہیں۔ جن کا انکار کوئی معاند و مکابر ہی کر سکتا ہے۔ تو کیا صرف ان چار اموی حضرات کے اہم عہدوں پر فائز ہو جانے سے بنو امیہ سب کی گردنوں پر سوار ہو گئے تھے؟ اور کیا صرف اتنی سی بات کی وجہ سے بنو امیہ کا اقتدار سب پر قائم ہو سکتا تھا؟ اگر یہی ہے تو پھر یوں کہیے کہ آپ کو خود حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی خلافت ہی ناگوار ہے اس لئے کہ ان کا اقتدار تو بالکل مسلم ہے اور ان چار حضرات کے مجموعی اقتدار سے بھی زیادہ وزنی تھا۔ تو بقول آپ کے اس اہم ترین عہدے پر ان کے فائز ہونے کی وجہ سے بنو امیہ سب پر مسلط ہو گئے تھے۔

مودودی صاحب کا یہ اشارہ "دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے" مغالطہ کی ایک اچھی مثال ہے۔ بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ کے علاوہ دوسرے قبائل مثلاً بنو ہاشم۔ بنو عدی وغیرہ سب کو یہ چیز ناگوار تھی مولانا یہی اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ چیز بالکل غلط اور حقیقت کے خلاف ہے۔ میں موصوف سے پوچھتا ہوں کہ مصر و کوفہ وغیرہ کے ان مفسد اور شوریدہ سر سبائیوں کے علاوہ جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت بلکہ خلافت اسلامیہ کو برباد کرنا اور فتنہ پیدا کر کے مسلمانوں کی قوت کو منتشر کرنا اپنا مقصد زندگی بنا لیا تھا یا بعض ان کم فہم شوریدہ سر افراد کے علاوہ جو ان کے فریب میں گرفتار ہو گئے تھے اور کس قبیلے نے بقول آپ کے

یہ تلخی محسوس کی تھی ؟ براہ کرم ذرا ایک دو قبیلوں کے نام تو لیجئے جو حضرت ذی النورین کے اس طرز عمل کی وجہ سے تلخ کام تھے ؟

جن لوگوں نے حضرت عثمان ذی النورینؓ کے خلاف شورش برپا کی تھی اور حضرت ممدوح کو شہید کرنے کے لئے مدینہ طیبہ پر چڑھ دوڑے تھے ان کے متعلق مودودی صاحب خود لکھتے ہیں :-

"پھر باہمی قرارداد کے مطابق یہ لوگ جن کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی مصر ، کوفہ اور بصرے سے بیک وقت مدینہ پہنچے یہ کسی علاقہ کے بھی نمائندے نہ تھے بلکہ سازباز سے انہوں نے اپنی ایک پارٹی بنائی تھی ۔" ص۱۱۴

گویا مودودی صاحب کی بیان کردہ تلخی کا احساس رکھنے والے صرف یہ دو ہزار افراد تھے جو کسی علاقہ کے بھی نمائندے نہ تھے ، تو پھر وہ قبائل کون تھے جو جناب مصنف کی مبینہ تلخی محسوس کر رہے تھے ؟ اسا پھر یہ کہنا کہ " دوسرے قبائل " تلخی محسوس کرنے لگے " معاذ اللہ نہیں تو اور کیا ہے ؟

دوسری گزارش یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندان کے نہیں مگر قریش کے کثیر افراد کو تو بڑے بڑے عہدوں پر مقرر فرمایا تھا بلکہ اکثر و بیشتر عمال و عہدیدار قریشی ہی تھے ہاشمی بھی ، اور دیگر بطون قریش کے افراد بھی فاروق اعظمؓ کے زمانے میں بھی یہی کیفیت رہی پھر کیا وجہ ہے کہ غیر قریش قبائل میں مودودی صاحب کی مبینہ قبائلی عصبیت نے سر نہیں اٹھایا ؟ حضرت علیؓ کے زمانے میں تو بڑے بڑے عہدوں پر بکثرت ہاشمی مقرر کئے گئے تھے کیا ان کے دور میں بھی ان قبائل نے جو اموی عہدیداروں کی وجہ سے " تلخی محسوس کرنے لگے تھے " ہاشمی عمال و ولاۃ کی وجہ سے کوئی تلخی محسوس کی ؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آخر یہ حضرت عثمانؓ ہی میں کیا خصوصیت تھی کہ انہوں نے جو چند اموی عمال مقرر کر دیئے تو اس سے تلخی پیدا ہو گئی اور وہ بھی اتنی تیز کہ ۱۳ سو برس گذرنے کے بعد مودودی صاحب کا کام و دہن بھی اسے محسوس اور حضرت امام برحق کے حق میں تلخ کلامی پر انہیں

مجبور کر رہا ہے۔

حق یہ ہے کہ سوا ان شورش پسندوں اور مفسدہ پردازوں کے جنہوں نے بالآخر امام برحق سیدنا عثمان ذی النورین کو شہید کیا اور کسی قبیلہ کو بھی چند امویوں کے تقرر سے کوئی تلخی نہیں محسوس ہوئی اور خود ان لوگوں نے بھی قبائلی عصبیت کی بنا پر یہ ہنگامہ نہیں برپا کیا بلکہ یہ پارٹی تو وہ تھی جس کی بنیاد عبداللہ ابن ابی سلول نے ڈالی تھی، پھر عبداللہ ابن سبا المعروف بابن سودا نے اسے دوبارہ زندہ کیا اس کے اصل کارپرداز تو سخت دشمن اسلام اور منافق تھے۔ کچھ عجمی کچھ یہودی۔ البتہ انہوں نے مسلمانوں کی ایک تعداد کو بھی (جس میں ایک بھی صحابی نہ تھا) ورغلا کر اپنا آلہ کار بنالیا تھا انہیں بنو امیہ یا بنو ہاشم سے مخصوص طور پر کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا مقصد تو نظام خلافت کو پارہ پارہ اور مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو منتشر کر کے خود حصول اقتدار تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ کی جگہ حضرت علیؓ ہوتے تو یہ لوگ ان کے ساتھ بھی یہی طریقہ برتتے۔ اموی اگر زد میں لائے گئے تھے اگر ہاشمی یا عدوی یا انصاری ہوتے تو یہ ان کے متعلق شکایت اختراع کر لیتے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں ایک تو یہ مفسد پارٹی کمزور تھی، دوسرے ان دونوں حضرات خصوصاً حضرت فاروق اعظمؓ کی گرفت ایسی مضبوط تھی کہ انہیں کسی قابل ذکر شورش کا موقع نہ مل سکا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں انہوں نے بعض ناواقف اور غیر تربیت یافتہ نومسلموں کو ملا کر اپنی طاقت بڑھالی، پھر ابن سبا کا ایسا کیا دلیڈر انہیں مل گیا، اس لئے یہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب ہوگئے۔ ان واقعات کو، قبائلی عصبیت کے ذرے میں پرونا صرف مودودی صاحب کی ذہانت و طباعی ہے جس سے ان کا مقصد اس مفسد سبائی پارٹی کے جرم کو ہلکا کرنے اور حضرت عثمانؓ پر ایک غلط اتہام چسپاں کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے حقیقت سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

رہا بڑے بڑے عطیات کا معاملہ تو اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے گا، یہاں مودودی صاحب نے مجملاً یہ الزام سیدنا عثمانؓ پر لگایا ہے اس کا مجمل جواب یہ ہے کہ محض اتہام اور بہتان ہے خود حضرت عثمانؓ نے مفسدوں کے اسی اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا۔

- عطیات کا معاملہ یہ ہے کہ میں ان لوگوں کو (اپنے اقربا کو) اپنے ذاتی مال میں سے عطیات دیتا ہوں اور مسلمانوں کا مال (یعنی بیت المال کی دولت) نہ اپنے لئے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی دوسرے کے لئے۔

(طبری جلد ۵ ص۱۳۵ کے احوال خطبہ حضرت عثمانؓ)

اس کے بعد مودودی صاحب اپنے اس غلط اتہام کو سنگین بنانے کے لئے دو روایتیں نقل کرتے ہیں:

- ان کے نزدیک یہ صلہ رحمی کا تقاضا تھا چنانچہ وہ کہتے تھے کہ عمرؓ خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں ایک موقع پر انہوں نے فرمایا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ بیت المال کے معاملہ میں اس بات کو پسند کرتے تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقربا کو بھی خستہ حال رکھیں مگر میں اس میں صلہ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں" ص۱۰۰

دونوں روایتوں کے لئے طبقات ابن سعد، طبری اور کنز العمال کا حوالہ دیا گیا ہے۔ موخر الذکر حوالہ تو محض ناواقف لوگوں کو دھوکہ دینے اور مرعوب کرنے کے لئے ہے اس لئے کہ کنز العمال صدیوں بعد کی تالیف ہے اور اس کا ماخذ اس قسم کی روایتوں میں طبری، ابن سعد، ابن اسحاق کے سوا اور کچھ نہیں ہے پھر یہ بھی یاد رہے کہ کنز العمال کا شمار اگرچہ کتب حدیث میں ہوتا ہے، لیکن کتب حدیث بھی دو قسم کی ہیں ایک وہ ہیں جن میں صحت روایت کا التزام کیا گیا ہے اور دوسری قسم میں وہ کتابیں ہیں، جو

ہیں جو روایات کا ذخیرہ محض ہیں۔ صحت روایات کا اس میں کوئی اہتمام و التزام نہیں ہے۔ کنز العمال کا شمار اسی دوسری قسم میں ہے محض اس کا حوالہ روایت حدیث کی صحت کا بھی ضامن نہیں ہے چہ جائیکہ تاریخی روایت کا۔ اس آگاہی کے بعد ان شاء اللہ کوئی سمجھدار آدمی مودودی صاحب کے مغالطہ میں مبتلا نہ ہوگا جو انہوں نے کنز العمال کا نام لکھ کر دینا چاہا ہے۔

اب روایتوں کا حال سنیئے، یہ دونوں روایتیں واقدی کی ہیں جس کا کذاب اور یاوہ گو ہونا ہم صفحات سابقہ میں واضح کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھئے کہ طبری و طبقات ابن سعد دونوں غیر معتبر کتابیں ہیں۔ ان کی حیثیت و حقیقت پر بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں روایتیں بالکل جعلی، موضوع اور سراپا کذب ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صلہ رحمی اپنے مال میں سے کی جا سکتی ہے نہ کہ بیت المال میں سے۔ کیا معاذ اللہ حضرت عثمانؓ اتنا بھی نہ سمجھتے تھے؟ ایسے جلیل القدر خلیفہ رسول کے متعلق یہ سوء ظن کہ وہ اپنے اور بیت المال کے مال میں فرق نہیں سمجھ سکتے تھے یا صلہ رحمی کی حدود سے ناواقف تھے، کوئی سبائی ہی کر سکتا ہے جو حضرت ممدوح کی عداوت میں اپنی بصیرت سے ہاتھ دھو چکا ہو۔

○

اس باب کا عنوان مودودی صاحب نے "خلافت راشدہ سے ملوکیت تک قائم فرمایا ہے" اور یہی باب درحقیقت ان کی کتاب کا نچوڑ ہے جس میں وہ نقاب تقیہ الٹ کر سامنے آگئے ہیں اور صحابہ کرام کو مطعون کرنے میں، اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ گذشتہ ابواب درحقیقت اس کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور آئندہ ابواب ضمیمہ کی۔ اس میں موصوف نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے بلکہ ۱۴ سو برس سے شیعہ صاحبان جو تیر چلاتے رہے ہیں انہیں پر جلا کرکے مودودی صاحب نے نشانہ بازی کی سعی لاحاصل کی ہے۔ اس سے اہل سنت کے قلوب تو ضرور مجروح ہوئے لیکن ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کے مرتبہ رفیع تک ان کی رسائی کہاں ہو سکتی ہے، ۱۴ سو برس سے ناکام معترضین کی جو فہرست مرتب ہو رہی ہے ان میں ان کا نام بھی درج کر لیا گیا۔ البتہ ان کے نامہ اعمال کی سیاہی

ا؎ مودودی صاحب کی کتاب خلافت و ملوکیت کے باب چہارم کا جائزہ۔

میں اضافہ ہوگیا جس کا نتیجہ وہ ان شاء اللہ قیامت کے دن دیکھیں گے۔

اس باب میں انہوں نے صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرت عثمانؓ و حضرت معاویہؓ پر وہی اعتراضات کئے ہیں جو عام طور پر شیعہ حضرات کرتے ہیں لیکن انہیں ایک جدید عنوان سے متعارف کرا دیا ہے یہی کتاب کی خصوصیت کہی جا سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی یہ ایک واقعہ ہے اور اس کی ابتدا حضرت عثمانؓ کی ایک غلطی سے ہوئی، جس کی وجہ سے خلافت کا رجحان ملوکیت کی طرف شروع ہوگیا یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں خلافت ختم ہو کر ملوکیت قائم ہوگئی حضرت معاویہؓ خلیفہ نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔ یہ پورے باب کا ماحصل ہے جو ہم نے مختصر طور پر بیان کر دیا ہے۔ باقی صفحات انہیں کے مزعومہ دلائل وغیرہ میں تحریر کئے گئے ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو دین سے واقف سنی کی نظر کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے مولانا کا یہ دعویٰ ہے کہ دور صحابہؓ ہی میں خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی تھی، اس دعوے کو مولانا نے اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا یہ ایک مسلمہ اور ناقابل انکار حقیقت ہے۔ مودودی صاحب کا یہ دعویٰ بہت تحیر خیز اور مغالطہ انگیز ہے حقیقت یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک صحابہ کرام کے زمانے میں مودودی صاحب کی اصطلاحی ملوکیت کا نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی امام برحق اور خلیفہ راشد تھے۔ دور صحابہ گذرنے کے بعد یہ اصطلاحی ملوکیت آئی یا نہیں؟ اس سے ہمیں اس وقت تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ لیکن اتنا اجمالاً عرض کر دیں تو مضائقہ نہیں ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کا دور خلافت ہی کا دور تھا۔ مودودی صاحب کی اصطلاحی ملوکیت کا وہاں بھی پتا نشان نہیں ملتا۔ البتہ اس کا درجہ وہ نہیں تھا جو صحابہ کرام کی خلافت کا تھا۔ یہ خلافتیں دور صحابہ کی خلافتوں سے بہت فروتر تھیں اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا۔ لیکن کسی طرح انہیں حدود خلافت سے نکال کر مودودی صاحب کی مزعومہ ملوکیت کے حدود میں

نہیں داخل کیا جاسکتا۔ مناسب مقام پر اس مسئلہ پر بھی ان شاء اللہ بقدر ضرورت بحث کی جائے گی۔ یہاں ہمیں قاری کو صرف اس مغالطہ سے آگاہ کرنا تھا جس میں مودودی صاحب نا واقفوں کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

مودودی صاحب بزعم خود خلافت کو ملوکیت بنا دینے کی اصل ذمہ داری امام برحق امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اس مسئلہ میں ان کے استدلال کی غیبت اس شعر کے مصداق ہے۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

چنانچہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"اس تغیر کا آغاز ٹھیک اسی مقام سے ہوا جہاں سے اس کے رونما ہونے کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔" (صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶)

مگر تعجب ہے کہ آپ نے اس آغاز کی ذمہ داری میں خود حضرت عمرؓ کو کیوں نہ شریک کیا؟ اس لیے کہ جب حضرت عمرؓ کو حضرت عثمانؓ سے اقربا پروری کا اندیشہ تھا تو انہوں نے اپنے امکانی جانشینوں کی فہرست میں ان کا نام ہی کیوں رکھا؟ حقیقت میں یہ بات بھی مودودی صاحب کہنا چاہتے ہیں مگر مصلحتاً نہیں کہتے لیکن استیعاب کی موضوعہ روایت نقل کر کے اور اس کی بناء پر حضرت عمرؓ کی جانب اپنا اختراعی اندیشہ منسوب کر کے قاری پر اثر بھی ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں موصوف نے مستشرقین کی پوری پوری پیروی فرمائی ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو حضرت عثمانؓ سے ہرگز اس قسم کا کوئی اندیشہ نہ تھا بلکہ وہ انہیں بہت بلند مرتبہ اور خلافت کے لئے موزوں ترین اشخاص میں سے ایک سمجھتے تھے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت سے ظاہر ہے۔

مودودی صاحب نے حضرت ذی النورین پر جو طعن و تشنیع کی گرد اڑانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا جواب دینے سے قبل ہم اختصار کے ساتھ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ خلافت عثمانی کا درجہ اہلسنت والجماعت کے نقطہ نظر سے کیا تھا اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک میں ان کا کیا مرتبہ تھا۔

خلافت عثمانی کی حیثیت اور اُس کا درجہ

امام المسلمین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا مرتبہ عنداللہ بہت بڑا ہے پوری امت محمدیہ علیہ الف الف تحیہ میں صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے بعد سب سے بلند مرتبہ انہیں کا ہے۔ خلفائے راشدین میں وہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں اور سیدنا حضرت حسنؓ سے تو ان کا مرتبہ بدرجہا زائد بلند ہے اس لئے کہ حضرت حسنؓ صغرسنی کی وجہ سے قبل فتح مکہ کوئی دینی خدمت نہیں انجام دے سکے۔ اور حضرت عثمانؓ کی خدمت دین قبل فتح مکہ بالکل واضح ہے قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ قبل فتح مکہ اللہ کی راہ میں جان و مال صرف کرنے والے سب حضرات۔ ان سب حضرات سے افضل و برتر ہیں جنہوں نے بعد فتح مکہ دین کی نصرت فرمائی تھی۔[1] اسی طرح حضرت معاویہؓ سے وہ بدرجہا افضل و برتر ہیں وہ مہاجر اور السابقون الاولون میں سے ہیں۔ ان کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہے۔ آنحضور نے انہیں جنت کی خوشخبری سنائی۔ بیعت رضوان میں اپنے

---

[1] دیکھئے سورہ حدید لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ۔ تم میں سے جن لوگوں نے قبل فتح مکہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور جہاد و قتال کیا وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہیں جنہوں نے انفاق و قتال بعد فتح مکہ کیا ہے بلکہ وہ ان سے (بعد والوں سے) درجہ میں بڑے ہیں اور یوں تو ان سب ہی سے اللہ تعالیٰ نے اچھے اجر کا وعدہ فرمایا ہے

دست مبارک کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دے کر ان کی طرف سے بیعت فرمائی۔ ان کو شہادت کی خوشخبری دی اپنی دو صاحبزادیوں حضرت رقیہ و حضرت کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے ساتھ فرمایا، اور ان کے انتقال کے بعد فرمایا کہ اگر میری کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں اس کا نکاح بھی عثمانؓ کے ساتھ کرتا۔ ان فضائل کے علاوہ بھی ان کے بہت سے فضائل و مناقب ہیں۔ ان سب کا استقصاء یہاں مطلوب نہیں ہے۔ ان کی شخصیت عظیمہ کا یہ مختصر تعارف ان کی خلافت کی حیثیت بیان کرنے کی تمہید ہے۔ آئندہ سطروں میں ان کی حیات طیبہ کے اسی گوشہ پر روشنی ڈالی جائیگی۔

احادیث دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا خلیفہ اور جانشین نہیں بنایا تھا اور اس کام کو امت کے اختیار پر چھوڑ دیا تھا مگر قولی اور عملی طور پر بعض اشارے ایسے کئے تھے جنہیں بعض خلفاء کی خلافت کی پیش گوئی کہا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا منصب پر فائز ہونا پسند بھی تھا۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ و سیدنا عمر فاروقؓ کے متعلق تو یہ اشارے اس قدر واضح ہیں کہ گویا آپ نے ان دونوں کو بنفس نفیس مقرر فرما دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے متعلق بھی اس قسم کے اشارے موجود ہیں، مگر اتنے نہیں ہیں جتنے ان دونوں حضرات کے متعلق ہیں۔ علیٰ ہذا حضرت علیؓ کے متعلق بھی یہ چیز موجود ہے مگر نسبتاً حضرت عثمانؓ سے کم۔

یہاں گفتگو حضرت عثمانؓ کے متعلق ہے اس لئے ہم ان احادیث کو نقل کرتے ہیں جو ان کی خلافت سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے:

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم دخل	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک باغ میں
حائطا وامرنی بحفظ باب الحائط	داخل ہوئے اور مجھے اس کا دربان بنایا
فجاء رجل یستاذن فقال ائذن	اتنے میں ایک شخص نے آکر اندر آنے کی

لہ وبشرہ بالجنۃ فاذا ابوبکرؓ	اجازت چاہی۔ آنحضور نے فرمایا کہ انہیں
ثم جاء آخر یستاذن فقال	آنے کی اجازت دیدو اور جنتی ہونے
ائذن لہ وبشرہ بالجنۃ	کی خوش خبری سنادو دیکھا تو یہ ابوبکر صدیقؓ
فاذا عمرؓ ثم جاء آخر	تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرے
یستاذن فسکت ھنیۃ	شخص نے آکر اجازت چاہی آنحضور نے فرمایا کہ
ثم قال ائذن لہ وبشرہ	آنے دو اور انہیں جنت کی بشارت دیدو
بالجنۃ علی بلوی تصیبہ	یہ حضرت عمرؓ تھے۔ کچھ دیر کے بعد ایک اور
فاذا عثمانؓ بن عفان۔	صاحب نے اجازت چاہی آنحضور نے کچھ دیر
	سکوت کے بعد فرمایا کہ انہیں بھی آنے دو۔ اور
	انہیں اس آزمائش و امتحان کی جزا میں جس میں وہ
(بخاری شریف جلد اول مناقب عثمانؓ بن عفانؓ)	عنقریب مبتلا ہوں گے جنت کی بشارت دیدو" (یہ عثمان بن عفانؓ تھے)

اس حدیث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دی گئی ہے اور اسے ایک ابتلاء وامتحان کا صلہ قرار دیا گیا ہے جس میں پڑنے کی پیشین گوئی موصوف کے متعلق فرمائی گئی ہے۔

"بلویٰ" یا امتحان کا لفظ خود اس بات کو بتاتا ہے کہ شریعت مطہرہ کی جانب سے موصوف سے کوئی مطالبہ کیا جائے گا۔ اس مطالبہ کو پورا کرنے میں سخت شدائد و مشکلات ہوں گے، امتحان اسی کا ہو گا کہ موصوف شریعت کے حکم پر قائم رہتے ہیں یا نہیں؟ اور ان شدائد و مشکلات کے علی الرغم مطالبہ شریعت پورا کرتے ہیں یا نہیں؟

اس کے علاوہ جو حضرات قرآن وحدیث کی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ عموماً "بلویٰ" "بلاء" "ابتلاء" کے الفاظ جب مومن کے لئے بولے جائیں تو اچھے ہی معنی میں استعمال

ہوتے ہیں اور خود ان الفاظ میں کامیابی کی طرف اشارہ پنہاں ہوتا ہے اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ابتلا میں شریعت پر حضرت عثمانؓ کی استقامت دیکھی جائے گی وہ حق پر ہوں گے اور امتحان میں کامیاب ہوں گے۔

اس سے قطع نظر اس "بلوی" یا امتحان و آزمائش پر جنت کی بشارت تو اس کی آفتاب سے زیادہ روشن دلیل ہے اور حضرت عثمانؓ کی حقانیت استقامت اور کامیابی کو روز روشن سے زیادہ روشن کر رہی ہے۔

حدیث صرف اتنا ہی نہیں بتا رہی ہے بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آزمائش وکامیابی پر جنت کی بشارت دینا صاف طور پر اس حقیقت کو نمایاں کر رہا ہے کہ اس ابتلا اور اس میں کامیابی کے زمانے میں حضرت عثمانؓ کی پوزیشن اور ان کی روشنی عین مرضی الہی اور مرضی رسالت پناہی کے مطابق ہوگی۔

ان تمہیدی مقدمات کے بعد ملاحظہ فرمایئے کہ یہ ابتلا و بلوی جس پر حدیث مذکور میں حضرت ذی النورین کو جنت کی بشارت دی گئی ہے وہی ابتلا و امتحان تھا جو انہیں اپنے آخری دور خلافت میں پیش آیا اور جو ان کی شہادت پر منتہی ہوا۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا ابتلا انہیں اس ارشاد نبوی کے بعد نہیں پیش آیا۔ باتفاق محدثین وشارحین وعلماء سلف وخلف اس ابتلا سے مراد یہی ابتلا ہے۔ غالباً مودودی صاحب بھی اس سے اختلاف کی جراءت نہ کر سکیں گے۔

علاوہ اس اجماع کے، تاریخ و حدیث کی کتابوں پر نظر کیجئے اور ان کی روشنی میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات دیکھئے تو آپ کو مذکورہ بالا امتحان کے علاوہ مذکورہ بالا ارشاد نبوی کے بعد ان کی زندگی میں کوئی ایسا امتحان و ابتلا نظر نہ آئے گا جس کی اہمیت و شدت مذکورہ بالا امتحان کی عشر عشیر بھی ہو۔ پھر یہ کہ اگر کچھ آزمائشیں "نو" بھی آئیں تو وہ حضرت عثمانؓ

کے ساتھ مخصوص نہ تھیں وہ سب ہی صحابہ کو پیش آئیں، پھر حدیث میں ان میں تخصیص کی کیا وجہ ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ حدیث میں قطعی اور یقینی طور پر "بلویٰ" اور ابتلاء سے مراد مذکورہ بالا ہی ابتلاء ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ابتلا کیا تھا؟ احادیث و تاریخ متفق ہیں کہ بلوائی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت سے معزول کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ حضرت عثمانؓ تخت خلافت سے دستبردار ہو کر اپنی جان بچا سکتے تھے، لیکن انہوں نے جان دینا پسند کیا اور ترک خلافت کو پسند نہیں فرمایا۔ حدیث مذکور کو مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں پھر ایک مرتبہ دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی یہ روش یعنی منصب خلافت پر قائم رہنا اللہ تعالےٰ اور ان کے رسول کے نزدیک پسندیدہ تھا جس پر انہیں جنت کی بشارت سے شادکام فرمایا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمانؓ کی خلافت پسند تھی اس لئے اس پر قائم رہنے اور اس استقامت کی وجہ سے اپنی جان دے دینے پر آنحضور نے ان کو جنت کی بشارت دی۔ اگر یہ خلافت پسندیدہ رسول نہ ہوتی تو اس پر استقامت کیوں پسندیدہ ہوتی؟ اس پر جنت کی بشارت کیوں دی جاتی؟ پھر جو چیز نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میں مرغوب تھی وہ یقیناً حق تعالےٰ شانہ کی مرضی و پسندیدگی کے مطابق ہے۔

حدیث سے خلافت عثمانی کی پیشین گوئی بھی سمجھ میں آتی ہے۔

تیسرا مضمون جو حدیث سے مستنبط ہوتا ہے وہ جمہور مسلمین کو اشارۃً ہدایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنائیں۔ اشارہ بالکل واضح ہے۔ مومن کا کام یہی ہے کہ جس بات کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے۔ اسی کو پسند اور اختیار کرے۔ آنحضورؐ نے خلافت عثمانیؓ

کے متعلق اپنی پسندیدگی و رضا کا اظہار فرما کر اہل ایمان کو اشارہ فرما دیا کہ جب موقع آئے تو انہیں کو خلیفہ بنانا۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کی شہادت کے بعد یہ موقع آیا اور جمہور مسلمین نے آقائے نامدار کی مرضی پوری کی۔

حدیث مذکور سے یہ مضامین معمولی غور و تامل کرنے سے سمجھ میں آجاتے ہیں بشرطیکہ حدیث کا ذوق ہو۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں صحابہ کرام سے محبت و عقیدت نہیں ہوتی وہ قرآن و حدیث کے ذوق سے محروم کر دیئے جاتے ہیں اس لئے ہمیں اس کی اس قدر طویل تفصیل کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ایسے لوگ بھی ان امور کو سمجھ سکیں یا کم از کم ان پر اتمام حجت ہو جائے۔

دوسری حدیث

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے دو سندوں کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک طویل روایت ذکر فرمائی ہے، جس کا ایک حصہ یہ ہے:۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یا عثمانؓ ان اللہ عسی ان یلبسک قمیصا فان ارادک المنافقون علی خلعہ فلا تخلعہ حتی تلقانی ثلاثا۔	آنحضور نے حضرت عثمانؓ سے تین مرتبہ فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائیں گے اگر منافقین تم سے وہ قمیص اتروانے کا ارادہ کریں تو اسے ہرگز نہ اتارنا یہاں تک کہ تم میرے پاس آجاؤ۔

یہ روایت دوسرے محدثین مثلاً ترمذی و ابن ماجہ نے بھی ذکر کی ہے اور امام ترمذی نے اسے حسن غریب فرما کر اس کے مقبول ہونے کی شہادت دی ہے۔ اس حدیث میں قمیص سے مراد بالاتفاق شارحین خلافت ہے، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جسے چھوڑنے

پر بلوائیوں کو اصرار تھا بلکہ ان کی فتنہ پردازی کا مقصد ہی یہی تھا، معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس میں خلافت عثمانی کی پیشین گوئی کے ساتھ آنحضور نے اس کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو حضرت عثمانؓ کو معزول کرنا چاہتے تھے منافق کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ اس کے بعد اس تصریح کی ضرورت نہیں ہے کہ آنحضور نے جمہور مسلمین کو اشارۃً یہ حکم دیا ہے کہ مناسب موقع پر حضرت عثمانؓ ہی کو خلیفہ منتخب کریں۔

تیسری حدیث

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابرؓ ابن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ ایک دن آنحضور نے فرمایا:۔

آج ایک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابو بکرؓ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے چمٹے ہوئے ہیں اور حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ سے اور حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ سے۔

(حضرت جابر فرماتے ہیں کہ) جب ہم آنحضور کی مجلس مبارک سے واپس ہوتے تو ہم نے ایک دوسرے سے (اس کی تعبیر کے طور پر کہا) رجل صالح تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں ان حضرات کا ایک دوسرے سے چمٹنا آنحضور کے بعد ان کی خلافت سے عبارت ہے۔

اور ابو داؤد نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے۔

اس میں خلافت عثمانی کی جانب صاف اشارہ ہے چنانچہ صحابہ کرام نے اس سے یہی سمجھا۔

چوتھی حدیث

عن قیس ثنی ابو سھلۃ قال قال   حضرت قیس حضرت ابو سہلہ سے روایت

لی عثمانؓ یوم الدار ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قد عہد الی عہدا فانا صابر علیہ ھذا حدیث حسن صحیح	کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے محاصرے کے دن مجھ سے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا ۔ میں اس عہد پر قائم ہوں ۔

(ترمذی ج ۲ مناقب عثمانؓ)

یہ عہد کیا تھا ؟ واقعات و بیانات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ عہد خلافت پر متمکن رہنے کا تھا ۔ گویا حدیث قمیص کا جو مضمون ہے اسی کو یہ حدیث بھی بیان کر رہی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کو خود جناب رسالتمآب نے سریر خلافت کے لئے منتخب فرمالیا تھا اور ان کی خلافت آنحضور کی پسندیدہ خلافت آخری مرحلہ تک رہی ۔

پانچویں حدیث

بیعت رضوان کا واقعہ مشہور ہے ۔ باتفاق اہل سنت اس بیعت میں شریک ہونے والے حضرات ان سب اہل ایمان سے افضل و برتر ہیں جو اس بیعت میں شریک نہیں تھے ۔ حضرت عثمانؓ اس کلیہ سے مستثنی ہیں اس لئے کہ بیعت انہیں کا قصاص لینے کے لئے لی گئی تھی اس لئے بیعت رضوان کی فضیلت انہیں پوری پوری حاصل ہوئی ۔ بلکہ ایک مزید فضیلت یہ حاصل ہوئی کہ نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم نے اپنے داہنے دست مبارک کو یہ فرما کر کہ :

ھٰذہ ید عثمان (بخاری) یہ عثمان کا ہاتھ ہے ۔

اپنے بائیں ہاتھ پر مارا اور ان کی طرف سے خود بیعت فرمائی ۔ بخاری شریف باب مناقب عثمانؓ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے ۔

اس حدیث سے بھی اہل فدق خلافت عثمانؓ کی پسندیدگی کی جانب اشارہ سمجھ سکتے ہیں

اپنے دست مبارک کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ فرمانا غایت تعلق کو بتاتا ہے اور چونکہ اس زمانے میں بیعت کی شکل یہی مروج تھی کہ ہاتھ پہ ہاتھ مارا جائے، اس لئے یہ اشارہ سمجھ میں آتا ہے کہ دست عثمانی پر بیعت خود دست نبوی صلے اللہ علیہ وسلم پر بیعت کرنے کے ہم معنی ہے، ظاہر ہے کہ آنحضور کے مقدس ہاتھ پر بیعت کرنا اللہ تعالے کے نزدیک کتنا پسندیدہ فعل ہے اسی سے سمجھ لیجیے کہ حضرت عثمانؓ کے دست مبارک پر بیعت کرنا اور آنجناب کا خلیفہ ہونا اللہ تعالے اور ان کے رسول کے نزدیک کس قدر پسندیدہ ہوگا۔

قرآن مجید میں بھی خلافت عثمانیؓ کی جانب بعض اشارات ملتے ہیں جن سے اس خلافت کا رضی عند اللہ ہونا واضح ہوتا ہے۔ لیکن بخوف طوالت ہم نے ان کا تذکرہ نہیں کیا، منصف مزاج اور سمجھدار کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

ان احادیث سے جو باتیں ظاہر ہیں، انہیں ایک مرتبہ پھر ذہن میں مستحضر فرما لیجئے ملاحظہ ہو:

اول: خلافت عثمانی کی پیشین گوئی خود حضور نے فرمائی تھی۔

دوم: خود آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مرضی یہ تھی کہ حضرت عثمان خلیفہ منتخب کئے جائیں۔

سوم: ان کی خلافت اللہ تعالے اور ان کے رسول کی مرضی اور پسند کے موافق تھی۔

چہارم: یہ رضا کسی محدود زمانے کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ ان کا پورا زمانۂ خلافت اللہ تعالے اور ان کے رسول کے نزدیک مرضیہ و پسندیدہ تھا، اگر ان کا آخری زمانۂ خلافت آنحضور کو پسند نہ ہوتا تو آخر دم تک اس منصب پہ باقی رہنے کا حکم کیوں فرماتے؟ اور اس استقامت کی بشارت کیوں دی جاتی؟

خلافت عثمانی کی یہ نوعیت و کیفیت ہے، اس کے درجۂ عالیہ اور مرتبۂ عظیمہ کو دیکھیے اور اس پر مودودی صاحب کی طعنہ زنی کو جو خلافت اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے

وہ خلافت الٰہیہ کے داعی کے نزدیک ناپسندیدہ اور قابل اعتراض ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مودودی صاحب سے گذارش ہے کہ :-

مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبیست

طعن اوّل کا اعادہ

تحریر فرماتے ہیں :-

"لیکن جب حضرت عثمان جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ انہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایتیں کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدف اعتراض بن کر رہیں۔" صـ ۱۰۶ (بحوالہ طبقات ابن سعد)

جناب مصنف نے اسی طعن کا یہاں اعادہ کیا ہے جس کا جواب ہم پچھلے صفحات میں دے چکے ہیں۔ لیکن یہاں ہم پھر اس پر مزید روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ خلیفہ کا اپنے رشتہ داروں کو اہم عہدے دینا کیا شرعاً ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو اس کے عدم جواز کی دلیل کیا ہے؟ کوئی آیت قرآنیہ؟ یا حدیث؟ کچھ تو پیش فرمائیے، یہ نہیں تو یہی فرمائیے کہ کونسا قیاس فقہی کے عدم جواز کو ثابت کر رہا ہے؟ ایک دلیل شرعی اجماع بھی ہے، اس کے متعلق فرمایا جائے کہ کب منعقد ہوا تھا؟ ادلۂ اربعہ میں سے کوئی دلیل تو آپ نے پیش کی ہوتی ؟۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کسی دلیل شرعی سے بھی اس کا عدم جواز تو کیا مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہونا بھی نہیں ثابت ہو سکتا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اپنے بعض اقرباء کو بعض اہم عہدوں پر مامور کرنا شرعاً ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے، جو شخص ان پر اعتراض کرتا ہے وہ بالواسطہ شریعت اسلامیہ پر معترض ہوتا ہے کہ اس نے کیوں ایسی معیوب و قابل اعتراض شے کو ممنوع نہیں قرار دیا۔ خود مودودی صاحب بھی اسے تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفہ اپنے اقرباء کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے کسی جزء کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کہا جا سکتا" (ص ۳۲۲ ضمیمہ)

مسئلہ پر نظر کرنے کے لئے دوسرا زاویہ عقلی ہے۔ اس کے متعلق بھی یہ عرض ہے کہ کوئی ایسی عقلی دلیل موجود نہیں ہے جو فی نفسہٖ اس فعل کو قابل اعتراض ثابت کرتی ہو۔ اگر ہو تو اسے پیش کیجئے اس اعتراض کو دہراتے ہوئے تیرہ سو برس سے زائد گذر چکے ہیں لیکن آج تک کوئی ایسی دلیل عقلی نہیں پیش کی جا سکی اور نہ قیامت تک پیش کی جا سکتی ہے، جو فی نفسہٖ اس فعل کو مذموم اور قابل اعتراض ثابت کرتی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ یا سربراہ مملکت کا اپنے اعزا و اقارب کو بڑے مناصب پر مقرر کرنا فی نفسہٖ نہ مذموم ہے نہ محمود۔ بلکہ اس کے حسن و قبح کا دارومدار مصالح و مفاسد اور ایک حد تک مقرر کرنے والے کی نیت پر ہے۔ اگر کسی شخص کا تقرر محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ سربراہ مملکت کا عزیز ہے حالانکہ وہ اس خدمت کی اہلیت سے محروم ہے تو یقیناً سربراہ مملکت کا یہ فعل مذموم اور قابل اعتراض کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر ایسے شخص کے تقرر سے باوجود اہلیت کوئی دینی یا قومی مفسدہ لازم آتا ہے تو بھی اس کے منصب کو مذموم اور محل اعتراض کہا جائے گا۔

لیکن اگر سربراہ مملکت اپنے کسی عزیز قریب کو کسی دینی یا قومی مصلحت کی بناء پر مقرر کرتا ہے اور جس شخص کو مقرر کرتا ہے وہ اس کا اہل بھی ہے تو خلیفہ کا یہ فعل کسی عاقل کے نزدیک مذموم نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس مصلحت کے حصول کے لحاظ سے لائق مدح و ستائش گردانا جائے گا۔

امیر المومنین امام برحق سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے اعزا اقارب کو مناصب عطا فرمائے، کیا وہ ان مناصب کے اہل نہ تھے؟ اور کار مفوضہ انجام دینے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے؟ یا حضرت عثمانؓ نے ان کا تقرر محض قرابت کی بناء پر کیا تھا اور اس کے علاوہ کوئی دینی یا قومی و اجتماعی مصلحت ان کے سامنے نہ تھی؟

جو شخص ان حضرات کے حالات سے واقف ہے وہ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور بہترین قابلیتوں سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا۔ خود مودودی صاحب کو بھی اس کا اعتراف بادل ناخواستہ کرنا ہی پڑا چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اپنے خاندان کے جن لوگوں کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے مناصب دیئے انہوں نے اعلیٰ درجہ کی انتظامی و جنگی قابلیتوں کا ثبوت دیا اور ان کے ہاتھوں بہت سی فتوحات ہوئیں: صفحہ ۱۰۵

جو شخص سنی ہونے کا مدعی ہو وہ امام برحق سیدنا عثمان ذی النورین کی نیت کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں کرسکتا، ان کے فضائل و مناقب ان کا تقویٰ اور ان کی پاکیزہ بے داغ زندگی کو دیکھنے کے بعد ایک غیر مسلم بھی اس اعتراف پر مجبور ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنے چند اعزا و اقارب کو جو مناصب دیئے تھے اس میں یقیناً کوئی دینی و ملی مصلحت پیش نظر ہوگی محض اقربا پروری یا حکومت پر اپنے خاندان کو غالب کردینا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

ان کی پاکیزہ اور روشن زندگی کے علاوہ ان کے حسن نیت کا ایک بہت قوی ثبوت یہ بھی ہے کہ خود ان کے زمانے میں ان مفسد باغیوں کے علاوہ کسی نے بھی ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا۔ کسی نے ان سے یہ کہا کہ آپ اقربا پروری کر رہے ہیں یا آپ اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں یا گران کی نیت پر ذرا بھی شک وشبہ ان حضرات کو ہوتا جو دن رات انہیں دیکھتے رہتے تھے اور ان سے خوب واقف تھے تو یہ ضرور اس خیال کا اظہار برملا خود ان سے کرتے اور خود انہیں معزول کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہم اور ان کے مثل دوسرے صحابہؓ جن کی حق گوئی اور حق پسندی ضرب المثل اور مثالی ہے کیا ایسی صورت میں خاموش رہتے ؟

تاریخ کی ایک روایت بتاتی ہے کہ حضرت علیؓ بھی ان حضرات کو مناصب دینے کی بنا پر حضرت عثمانؓ پر معترض تھے۔ یہ روایت ناقابل اعتماد اور موضوع ہے۔ لیکن اسے صحیح فرض کرلینے کے بعد بھی اس دلیل میں کوئی کمزوری نہیں پیدا ہوتی اس لئے کہ اس سے بھی کسی طرح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت علیؓ کو ان کی نیت پر کوئی شبہ تھا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ ممدوح کے اس طرز عمل کو بعض اقربا سے خلاف مصلحت سمجھ رہے تھے۔

مودودی صاحب کے زیر بحث مضمون پر جب اعتراض ہوا تو وہ بھی بادل ناخواستہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے :۔

" سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقرباء کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا اس کے متعلق میرے وہم وگمان میں بھی کبھی یہ شبہ نہیں آیا کہ معاذ اللہ وہ کسی بدنیتی پر مبنی تھا " (ص ۳۲۱ ضمیمہ)

چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

• کون صاحب عقل آدمی یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس سیرت و کردار کا انسان بدنیتی کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کر سکتا ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں خویش نوازی (NEPOTISM) کہا جاتا ہے؟ (۲۰)

مندرجہ بالا سطور نے یہ بات بالکل روشن کر دی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا طرز عمل یعنی اپنے بعض اعزا و اقارب کو بعض اہم عہدوں پر مقرر کرنا شرعاً و عقلاً ہر طرح جائز تھا۔ ان ممدوح کی نیت کے متعلق بھی پورا اطمینان ہے کہ وہ درست تھی جن لوگوں کا تقرر کیا گیا وہ ان مناصب کے اہل تھے۔ یہ سب باتیں مودودی صاحب نے بھی تسلیم کی ہیں اگرچہ محض معترضین کی شدید گرفت سے گھبرا کر بطور مفر بادل ناخواستہ انہیں ان باتوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ حضرت عثمان ذی النورین پر اعتراض کا کیا موقع باقی رہ گیا؟ اور اس اعتراض کی بنیاد نہ شرعی ہے نہ عقلی، تو آخر اس کی بنیاد ہے کیا؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ اعتراض کلمہ

(قرآن مجید) کا مصداق ہے۔

حضرت عثمانؓ کی نیک نیتی کا اعتراف کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آنجناب نے ان حضرات کا تقرر کسی دینی و ملی مصلحت ہی سے کیا ہوگا۔ وہ مصلحت کیا تھی؟ تیرہ سو برس گزرنے کے بعد اس کا معلوم ہونا ضروری نہیں لیکن منصب یافتہ حضرات کی اہلیت و قابلیت اور حضرت عثمانؓ کی نیک نیتی اور فہم و فراست تسلیم کرنے کے بعد اتنی بات تو تسلیم کرنا ہی پڑے گی کہ ان کا یہ طرز عمل یقیناً کسی دینی و اجتماعی مصلحت ہی کے حصول کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد اعتراض و طعن کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

مودودی صاحب کی کج بحثی

مودودی صاحب کی کتاب دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے سے طے کر لیا تھا کہ حضرت عثمانؓ پر اعتراض کرنا اور ان کی وقعت و عظمت کو خاکم بدہن اہل سنت کی نگاہ میں گھٹانے کی کوشش کرنا لازم ہے خواہ اس کے لئے کوئی راستہ موجود ہو یا نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے خواہ مخواہ کی بحثیں نکالی ہیں اور خالص شیعی طرز بحث اختیار کیا ہے۔

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ اپنے اقرباء میں سے جن حضرات کا تقرر حضرت عثمانؓ نے کیا تھا وہ ان مناصب کی پوری اہلیت و قابلیت رکھتے تھے جن کا انہوں نے بعد میں ثبوت دیا۔ مودودی صاحب فوراً گریز فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لیکن ظاہر ہے کہ قابلیت صرف انہی لوگوں میں نہ تھی دوسرے لوگ بھی بہترین قابلیتوں کے مالک موجود تھے اور ان سے زیادہ خدمات انجام دے چکے تھے۔ (...)

میں مودودی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ جو کام حضرت عثمانؓ نے ان حضرات کے سپرد فرمائے تھے ان کے لئے ماحول مطلوبہ اور مصالح کے اعتبار سے یہ حضرات موزوں تر اور قابل ترجیح تھے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ شرعاً و عقلاً حضرت عثمانؓ کے اختیار میں ہونا چاہئے یا ۱۳ سو برس بعد آپ کی رائے کو اس بارے میں فیصلہ کن تسلیم کرنا چاہیے؟ اول تو انتظامی یا جنگی، سیاسی وغیرہ اہلیتیں بارگاہِ الٰہی میں درجات قرب پر موقوف نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا مرتبہ عند اللہ بہت بلند ہو اور وہ ولایت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو مگر اس میں انتظامی قابلیت یا حرب و ضرب کی صلاحیت بالکل نہ ہو۔ دوسرا شخص جو درجۂ ولایت و قرب کے لحاظ سے اس سے فروتر ہو، اس قسم کی قابلیتوں اور صلاحیتوں

میں اس سے بدرجہا زائد فائق ہو، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حضرات سبقت اسلام اور اپنے سابق خدمات دینی کی وجہ سے ان حضرات سے عنداللہ افضل تھے اس قسم کی قابلیت وصلاحیت میں بھی ان سے فائق ہوں، ہو سکتا ہے کہ ان کے مساوی یا ان سے کم ہوں۔ سابقہ خدمات کی وجہ سے عنداللہ درجات و مراتب میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن یہ انتظامی اہلیت وقابلیت کے مرادف بہرحال نہیں ہے اس لئے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ سب حضرات ان اموی صاحبان سے زیادہ انتظامی وحربی صلاحیت وقابلیت رکھتے تھے جنہیں حضرت عثمانؓ نے مقرر فرمایا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم دوسرے حضرات کی انتظامی وحربی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے منکر نہیں ہیں، بیشک ایسے حضرات کی خاصی تعداد موجود تھی جو بہت اعلیٰ درجہ کی انتظامی وجنگی قابلیت رکھتے تھے اور ان میں اس صلاحیت کے اعتبار سے ان اموی حضرات کے مساوی تھے لیکن بسا اوقات دینی وانتظامی مصالح کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ کسی خاص شخص کو عطائے منصب کے لئے ترجیح دی جائے اور اس شخص کو اس کے مقابلے میں منصب نہ دیا جائے جو عنداللہ اس سے زیادہ درجہ و مرتبہ رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات تو سربراہ مملکت کی رائے اور ان کے صوابدید پر منحصر ہے۔ اگر خلیفہ کے حسن نیت پر اعتماد ہو تو اعتراض کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور اگر اعتماد نہ ہو تو بدنیتی کا الزام لگانے کے لئے ثبوت کی ضرورت ہوگی۔ اس زمانے میں بھی کسی کو بلادلیل اس پر اعتراض کا حق نہ تھا چہ جائیکہ آج تیرہ سو برس کے بعد اس زمانے کے حالات وظروف، رجحانات، شخصیات، مصالح ومفاسد وغیرہ سے بے خبر یہ کہ کوئی شخص چند روایتوں کی بنا پر اس پندار آمیز رائے کا اظہار کرے کہ حضرت عثمانؓ کو فلاں کا تقرر کرنا چاہئے تھا اور فلاں کا نہیں۔ ے

پری نہفتہ رو و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

مودودی صاحب ذرا غور سے سنیں حضرت زید اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کو خود آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان لشکروں کا سردار بنایا ہے جس میں بعض صحابہ ان سے افضل و برتر اور اسلامی وجنگی قابلیت میں بھی ان سے فائق شریک تھے[1]۔ اور حضرات ابوبکر وعمر عثمان وعلی رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو اس لشکر کی سپہ سالاری کے لئے نہیں مقرر فرمایا، حالانکہ یہ حضرات ان سے زیادہ اہلیت بھی رکھتے تھے اور ان سے زیادہ خدمت دین بھی انجام دے چکے تھے۔

اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکابر صحابہ کو نظر انداز فرماکر حضرت عتاب ابن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا گورنر مقرر فرمایا۔ اس عہدے پر وہ عہد نبوی میں بھی فائز رہے، اس کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی انہیں اسی عہدے پر سرفراز رکھا۔

اسی طرح حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو آنحضور نے نجران کا گورنر بنایا حالانکہ وہ فتح مکہ سے ایک رات پہلے اسلام لائے تھے مگر اس عہدے پر سابقین اولین کو چھوڑ کر انہیں مقرر فرمایا۔ حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تیما کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں ایک لشکر کا سپہ سالار بناکر شام پر حملے کے لئے بھیجا حالانکہ اس میں سابقین اولین بھی تھے۔ انہیں کو حضرت فاروق اعظمؓ نے دمشق کا گورنر بنایا۔ حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کو صدیق اکبرؓ نے ایسے لشکر کا سپہ سالار بنایا جس میں بدری صحابہ بھی شریک اور ان سے افضل و برتر افراد داخل تھے۔ حضرت عتبہؓ بن ابی سفیانؓ عہد نبوی میں طائف کے عامل تھے صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ کے زمانے میں گورنری پہ فائز رہے۔ حضرت عبداللہؓ بن سعد بن ابی سرح کو فاروق اعظمؓ نے مصر کا وزیر مالیات مقرر فرمایا تھا۔ اسی طرح حضرت باذانؓ یمنی عہد رسالت میں یمن کی گورنری پر فائز رہے۔ ان سب حضرات کا جب تقرر فرمایا

---

[1] دیکھئے بخاری شریف کتاب المناقب واقعہ بہت مشہور ہے اور عام کتب حدیث و تاریخ میں مذکور ہے۔

گیا ہے تو ان کی ایسی قابلیت رکھنے والوں کی کمی نہ تھی اور بہت سے قابلیت رکھنے والے ان سے بہت زیادہ دینی خدمات انجام دے چکے تھے۔ اس کے بعد عہد مرتضوی پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ حضرت علیؓ نے حضرت عبید اللہ ابن عباسؓ، حضرت قثم بن عباسؓ، حضرت جعدہ بن ہبیرہ اور بعض دوسرے اصحابؓ کو اعلیٰ مناصب پر فائز فرمایا، حالانکہ ان سے زیادہ قابل ان سے زیادہ دین کی خدمتیں انجام دینے والے اور ان سے افضل و برتر اشخاص بھی موجود تھے۔ ان میں سے اول الذکر کو ایک تجربہ کار صحابی یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے یمن کا گورنر بنایا گیا۔ ثانی الذکر کو حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ صحابی کی جگہ مکہ کا گورنر بنایا گیا۔ آخر الذکر بزرگ کو کوفہ کا گورنر مقرر فرمایا گیا۔ یہ سب حضرات نوعمر تھے اور ان سے زیادہ تجربہ کار افراد اس وقت موجود تھے جن کے دینی خدمات بھی ان سے زائد تھے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد صدیق اکبر، فاروق اعظم، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل آپ کے سامنے ہے۔ اس پر نظر کرنے کے بعد کون شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مندرجہ بالا طرز عمل قابل اعتراض تھا؟ یہ واقعات مشہور اور کتب حدیث و تاریخ میں عام طور پر مذکور ہیں۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مودودی صاحب جو خلافت و ملوکیت میں تاریخ کے ایک محقق کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ہیں ان سب سے بے خبر تھے پھر تعجب ہے کہ ان واقعات سے باخبر ہونے کے باوجود انہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے اس طرز عمل پر اعتراض کیا؟ اس حیرت انگیز واقعہ کی توجیہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عثمانؓ اور بنو امیہ سے بغض و عداوت کے غلبہ کی وجہ سے سب واقعات ان کے ذہن سے اوجھل ہو گئے یعنی حبک الشیئ یعمی ویصم کا ایک نمونہ یہ بھی ہے۔

ان مثالوں کو دیکھ کر ایک فقیہ تو یہ مسئلہ مستنبط کرے گا کہ خلیفہ کو اس کا اختیار اور حق حاصل ہے کہ وہ کسی مصلحت مشروعہ کی وجہ سے عطائے منصب میں مفضول کو افضل پر ترجیح دے اور اس کے اس فعل پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

عطائے مناصب کے مصالح

اوپر کی بحث سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو گئی کہ حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ نے جو اپنے چند اقربا کو بعض اہم مناصب پر مقرر فرمایا تھا وہ ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے ، اور کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس سے اسے غلط یا مذموم قرار دیا جا سکے ۔ ایک منصف مزاج کے لئے یہ بحث بالکل کافی و شافی ہے ۔ خصوصاً ایسے شخص کے لئے جو اہل سنت و الجماعت میں ہونے کا مدعی ہو ۔ اس کے بعد اس کی کوئی ضرورت نہیں باقی رہتی ، کہ حضرت عثمانؓ کے اس انتخاب کی مصلحتیں بیان کی جائیں لیکن ازدیاد بصیرت کے لئے میں ان چند مصالح کا تذکرہ بھی کرتا ہوں جو اس انتخاب میں سیدنا ذی النورین رضی اللہ عنہ کے پیش نظر تھیں

۱۔ ان میں بعض حضرات تو وہ تھے جن کا تقرر حضرت صدیق اکبر یا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا مثلاً حضرت ولید بنؓ عقبہ کو حضرت صدیق اکبرؓ نے شرق اردن پر حملہ کے لئے ایک لشکر کا سپہ سالار بنایا تھا ۔ حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت معاویہؓ کا تقرر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا تھا ، بلکہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو کتابت وحی کی اہم اور عظیم الشان خدمت پر مامور فرمایا تھا ۔ اور حضرت ولید بن عقبہؓ کو بعض قبائل میں عامل زکوٰۃ (کلکٹر) مقرر فرمایا تھا اور ان کی اعلیٰ درجہ کی دیانت داری اور معاملہ فہمی کی وجہ سے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے بھی انہیں جزیرہ اور بلاد مغرب میں عامل و مبلغ مقرر فرمایا تھا ؎

مودودی صاحب کے نزدیک یہ بات اہم ہو یا نہ ہو مگر حضرت عثمانؓ کے نزدیک یہ بات بہت اہم تھی اور ہم سب اہلسنت کے نزدیک بھی بہت اہم ہے کہ ان حضرات کو خود نبی کریم

؎ طبری ج ۲

صلے اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ نے ملکی و مالی خدمات کا اہل سمجھا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم معصوم اور غلطی سے بالاتر ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ جوہر شناس بھی شان اعجاز رکھتی تھی جس کو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جس کام پر مامور فرما دیا گویا اسے اہلیت کی سند دے دی اور اس کا تقرر اس بات کی قوی دلیل ہے کہ وہ اس قسم کے کام کے لئے موزوں ترین اشخاص میں شامل تھا۔ آنحضور کے بعد صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ کی مردم شناسی بھی ضرب المثل کی حد تک معلوم و معروف تھی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اعتماد فرمایا تو بالکل برمحل اور بجا تھا۔ کیا ان حضرات کو اہلیت کی ان اعلیٰ سندوں اور ان کی بہترین کارکردگی کے باوجود صرف اس وجہ سے معزول کر دیتے کہ وہ ان کے رشتہ دار تھے؟ آخر کس شرعی یا عقلی دلیل سے یہ ان پر واجب یا کم از کم ان کے لئے مستحب تھا؟

۲۔ تاریخ کا ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قریش کے مختلف اجتماعی کام ان کے مختلف خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ چنانچہ بیت اللہ کی سدانت بنو ہاشم کے حصہ میں تھی، اور امور خارجہ جنگ و دفاع کا شعبہ بنو امیہ کے ہاتھ میں تھا۔ انتظامی، حربی اور سیاسی امور کا تجربہ نسلاً بعد نسل ہونے کی وجہ سے انہیں ان شعبوں سے خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی اور اس حیثیت سے بحیثیت مجموعی ان کی امتیازی شان کا انکار کرنا روز روشن میں طلوع آفتاب کا انکار کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے تو کہ ان حضرات کے داخل اسلام ہوتے ہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگہ جوہر شناس نے مختلف قسم کی انتظامی و حربی خدمتوں کے لئے بنو امیہ کو کثرت کے ساتھ منتخب فرمایا۔ اگر ان کی ان اعلیٰ صلاحیتوں سے حضرت عثمانؓ نے قوم و ملت کو فائدہ پہنچانا چاہا تو آخر کیا غلطی کی؟

خصوصاً جبکہ سراپا حکمت نبی آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی ان کے پیش نظر تھا
خیارکم فی الجاہلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقہوا[1] (ترجمہ) تم میں سے جو لوگ جاہلیت

---
[1] بخاری

میں بہتر تھے وہ تفقہ حاصل کرنے کے بعد اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوں گے۔ مقصد یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں جو اچھی صلاحیتیں برے مصارف میں صرف ہو رہی تھیں اسلام لانے کے بعد وہ خیر کا رُخ اختیار کر کے اور زیادہ روشن ہو جائیں گی۔ گویا آنحضور نے اس دور میں مردم شناسی کے ایک قانون کی تعلیم دی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اسلام لانے کے بعد کس سے دین کا کون کام لینا چاہئے۔

بنو امیہ کی انتظامی و حربی قابلیت و صلاحیت زمانۂ جاہلیت میں ممتاز درجہ رکھتی تھی۔ اسلام لانے کے بعد ان کا یہ جوہر اور بھی چمک اٹھا۔ کیا حضرت عثمانؓ ان کے اس جوہر قابل کو محض اپنی قرابت کی وجہ سے ضائع کر دیتے؟ اور قوم و ملت کو اس سے فائدہ نہ پہنچنے دیتے؟ انہوں نے امت پر یہ احسان فرمایا کہ ان حضرات کی اعلیٰ صلاحیتوں سے اسے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا اور واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنی قابلیتوں سے جو فائدۂ عظیم ملت اسلامیہ کو پہنچایا اس کا انکار اول درجہ کی احسان فراموشی اور بدترین قسم کا کفران نعمت ہے۔

۳۔ حضرت عثمانؓ کے مبارک دور میں فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا اور دنیا کے بڑے حصے پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ لوگ جوق جوق دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور نو مسلموں کی تعداد روز افزوں تھی۔ قدیم مسلمانوں کی بھی نئی نسل وجود میں آ چکی تھی۔ جو شخص ممدوح کے دورِ خلافت کا مطالعہ غائر نظر سے کرے گا۔ اس کے سامنے یہ واقعہ روشن ہو جائے گا کہ ان کی خاص توجہ علوم دینیہ کے تحفظ اور عام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بہت زیادہ تھی اور انہوں نے اپنی خلافت کا سب سے اہم مقصد اسی کو قرار دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ضرورت بھی اسی طرز عمل کی تھی۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ ایک دور خاتمہ کے قریب تھا اور دوسرے کی ابتدا ہونے والی تھی۔ ماخذ دین کی حفاظت اور نئی نسل کی تربیت کی حاجت اس وقت عہد شیخینؓ سے زیادہ شدید ہو گئی تھی بسیدنا عثمانؓ کی دانشمندی اور فراست ایمانی نے ان خطرات کا بر محل ادراک کر لیا جو

آئندہ درپیش ہونے والے تھے اور دین عزیز کے گرد ایسا حصار کر دیا کہ اسے ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچ سکا۔ قرآن مجید کو ایک لغت پر جمع کرنا اور اس کی اشاعت کا خاص اہتمام کرنا ان کی اس مخصوص توجہ کا ثبوت ہے جنہیں ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

امت کی تعلیم و تربیت۔ علوم دینیہ کا تحفظ اور اس امانت نبویہ کو احتیاط کے ساتھ آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا ان کے نزدیک فتوحات و حکمرانی سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس خدمت عظیمہ کے لئے موزوں ترین اور احق ترین افراد صحابہ کرام ہی تھے۔ خصوصاً حضرات اکابر مہاجرین و انصار، سابقین اولین اور قدیم الاسلام صحابہ ان کی اس رائے کی صحت بالکل غیر مشتبہ اور قطعی ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ پالیسی اختیار فرمائی کہ اکابر صحابہ کو حتی الامکان سیاسی و انتظامی الجھنوں سے فارغ رکھا جائے اور انہیں امت جدیدہ کی تربیت و تعلیم اور علوم دینیہ کے تحفظ اور ان کی اشاعت کا پورا موقع دیا جائے۔ رہ گئے انتظامی و حربی امور تو وہ ان صحابہ کرام کے سپرد کئے جائیں جنہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا شرف نسبتاً کم حاصل ہوا تھا ان کے طرز عمل میں اس مصلحت کی رعایت نمایاں ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انہوں نے اکابر صحابہ کو کسی انتظامی یا حربی خدمت پر مامور کرنا اپنے لئے بالکل ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہ عام پالیسی تھی جس سے کسی دوسری مصلحت کے پیش نظر استثنا کی بھی گنجائش تھی۔

۴۔ سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے طرز عمل پر نظر ڈالنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اکابر صحابہ جیسے حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر و امثالہم رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے قریب رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان سے امور خلافت میں بر وقت مشورہ حاصل ہو سکے، نیز یہ کہ مدینہ طیبہ کی علمی مرکزیت قائم رہے۔ خصوصاً حضرت علی رضی کو تو وہ امور خلافت میں بہت دخیل بنائے ہوئے تھے اور برابر ان سے مشورہ کرتے تھے جس کی ایک وجہ تو خود حضرت علی کی وقعت و منزلت

اور ان کی صلاحیت و قابلیت تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ دونوں حضرات میں تعلق بھی بہت قوی تھا۔ خاندان کی وحدت کے علاوہ دونوں حضرات ہم زلف بھی تھے۔ دونوں السابقون الاولون میں داخل ہونے کی وجہ سے ابتدائے عہد اسلام سے ایک دوسرے کے مخلص تھے۔ یہ بھی ایک مصلحت تھی جس کی رعایت سے حضرت عثمانؓ نے اعاظم صحابہ کے بجائے ان حضرات صحابہ کو دوسرے مقامات پر اعلیٰ مناصب دیکر بھیجا۔

ان حضرات میں مودودی صاحب کو جس شخصیت کے ساتھ سب سے زیادہ عداوت ہے وہ امیرالمومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ صوبہ شام پر ان کا تقرر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے تقرر کا ذمہ دار نہیں سمجھا جا سکتا لیکن مودودی صاحب کو یہ امر بھی قابل اعتراض نظر آتا ہے کہ ممدوح نے انہیں اس عہدے پر برقرار کیوں رکھا؟ اور انہیں بغیر کسی وجہ کے معزول کیوں نہ کر دیا۔ گویا ان کے حسن کارکردگی، اعلیٰ انتظامی و حربی قابلیت اور ان کے روحانی برکات سے جو فائدہ امت کو پہنچ رہا تھا اس سے امت کو محروم کیوں نہ کر دیا؟ یعنی محض اس غیر اختیاری جرم کی وجہ سے کہ وہ خلیفۃ المسلمین کے عزیز دار ہیں ان کی اعلیٰ قابلیتوں اور صلاحیتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا اور اس حقیقت کو بھی ناقابل اعتنا سمجھا جاتا کہ وہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے اور ان کے قریبی عزیز ہیں یعنی علاوہ آنحضور کے ہم قبیلہ اور ہم جد ہونے کے ام المومنین حضرت ام حبیبہ علیٰ زوجہا علیہا السلام کے حقیقی بھائی بھی ہیں۔ فیا للعجب۔

لیکن مودودی صاحب کو بھی غالباً معلوم ہوگا کہ جس طرح بعض ڈاکٹر اور اطبا بعض اعضاء کے علاج میں اسپیشلسٹ ہوتے ہیں اسی طرح سیاسیات و تدبیر مملکت میں بھی بعض اشخاص ان کے مخصوص شعبوں یا بعض مقامات کی سیاست کے بارے میں متخصص اور اسپیشلسٹ ہو جاتے ہیں۔ اور ہر عہد بر سر اقتدار حکومت ایسے افراد کو ان شعبوں یا مقامات کے بارے میں کار پرداز بنانے میں

دوسروں پر ترجیح دیا کرتا ہے۔ بطور مثال اسی ہندوستان کے انگریزی دور میں قاضی سر عزیز الدین مرحوم اور سر مرزا اسمٰعیل کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ دونوں صاحبان ریاستی سیاست کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور حکومت برطانیہ ریاستوں کے متعلق امور میں ان سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس شعبہ کے بہت سے اہم عہدوں پر انہیں ممتاز کرتی رہی اور دوسروں پر انہیں ترجیح دیتی رہی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کیفیت بھی یہی تھی۔ وہ صوبہ شام کے داخلی معاملات و انتظامات کے ماہر خصوصی ہونے کے علاوہ رومی سیاست کے بھی ماہر خصوصی اور اسپیشلسٹ تھے۔ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں چھ سال تک اس حصہ مملکت کی سربراہی پر برقرار رکھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس حکمت عملی کے پیش نظر انہیں بدستور اسی جگہ اور اسی منصب پر قائم رکھا۔ بلاشبہ یہ ان کے اعلیٰ تدبر اور بہترین انتظامی قابلیت کا ایک نمونہ ہے۔ اسے غلطی وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے دل میں سیدنا ذی النورینؓ کے بغض و عناد کی آگ بھڑک رہی ہو اور اس کے تیرہ و تار دھوئیں نے اس کی چشم انصاف کو کور کر دیا ہو۔

رومی حکومت کوئی معمولی حکومت نہ تھی وسیع عریض خطہ ارضی پر قابض ہونے کے علاوہ وہ ایک مخصوص تمدن اور طرز زندگی کا نمونہ تھی، اور اسے یورپ و ایشیا میں غیر مسلموں کی تمدنی امامت و قیادت کا درجہ حاصل تھا۔ اس تمدن کی پشت پناہی محرف مسیحیت کر رہی تھی، جو حکومت و سیاست کے بل بوتے پر دعوت کے لباس میں بھی ملبوس ہو گئی تھی۔ اس عظیم الشان تمدن اور رنجبر سیاست کی شان و طاقت و حکومت سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ ان کے مقابلے کے لئے حضرت معاویہؓ کی عظیم و عبقری شخصیت ہی موزوں و مناسب تھی۔ ممدوح دور فاروقی میں چھ سال تک اس کا تجربہ کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پدر نامدار حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں روم جاتے

آتے رہتے تھے جیسا کہ بخاری شریف جلد اول کتاب الایمان میں حدیث ہرقل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ بھی اپنے والد صاحب محترم کے ساتھ روم آئے گئے ہوں گے۔ ورنہ ان کے ذریعے سے انہیں رومی سیاست و تمدن کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہوئے ہوں گے ان امور پر نظر کرنے سے رومی امور کے متعلق ان کی مہارت خصوصی کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ کی نگاہ جوہر شناس نے شام کی گورنری کے لئے ان کا انتخاب کیا اور حضرت عثمانؓ کی فراست و دانائی نے بھی اس تقرر کی تحسین کی اور انہیں اس اہم جگہ پر برقرار رکھا جس کے لئے بلاشبہ وہ موزوں ترین شخص تھے۔

۶۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کی گورنری پر مقرر کرنے اور اس پر آخر تک برقرار رکھنے کا اصل راز حدیث ذیل سے منکشف ہوتا ہے۔ مودودی صاحب ذرا غور سے نظر فرمائیں:۔

عن اسحٰق بن عبد اللہ بن طلحۃ عن	اسحاق بن عبد اللہ بن طلحہ بیان کرتے ہیں کہ
انس بن مالک انہ سمعہ یقول کان	حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدخل	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام حرام
علی ام حرام بنت ملحان فتطعمہ	بنت ملحان رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف لے
وکانت ام حرام تحت عبادۃ	جایا کرتے تھے اور وہ آنحضور کی خدمت میں
بن الصامت فدخل علیہا رسول اللہ	کھانے کی چیزیں پیش کیا کرتی تھیں۔ ایک دن
صلی اللہ علیہ وسلم فاطعمتہ وجعلت	حسب معمول ان کے یہاں تشریف لے گئے انہوں
تفلی راسہ ثم نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ	نے آنحضور کو کھلایا اور سر مبارک کے بال دیکھنے
وسلم ثم استیقظ وھو یضحک قالت	لگیں کہ شاید خس و خاشاک میں سے کچھ پڑ گیا ہو

ؔ حضرت ام حرام آنحضور کی رضاعی خالہ تھیں

فقلت ما يضحكك يا رسول الله قال
ناس من امتي عرضوا علي غزاة في
سبيل الله يركبون ثبج هذا البحر
ملوكا على الاسرة او مثل الملوك
شك اسحاق قالت فقلت يا رسول الله
ادع الله ان يجعلني منهم فدعا لها رسول
الله صلى الله عليه وسلم ثم وضع راسه
ثم استيقظ وهو يضحك فقلت ما
يضحكك يا رسول الله قال ناس من امتي
عرضوا علي غزاة في سبيل الله كما
قال في الاولى قالت فقلت يا رسول
الله ادع الله ان يجعلني منهم قالت انت
من الاولين. فركبت البحر في
زمان معاوية بن ابي سفيان
فصرعت عن دابتها حين خرجت
من البحر فهلكت۔

(بخاری جلد اول کتاب الجهاد باب الدعاء
والجهاد والشهادة للرجال والنساء ص ۳۹۱)

تو صاف کر دیں) اس کے بعد آنحضور سو گئے
اور کچھ دیر بعد ہنستے ہوئے بیدار ہوئے
حضرت ام حرامؓ نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو آپ
نے فرمایا کہ میری امت سے کچھ لوگ
میرے سامنے پیش کئے گئے جو اس سمندر (کی
معروف جہاد فی سبیل اللہ تھے (ان کی
شان و شوکت ایسی تھی) جیسے وہ تخت
پر بیٹھے ہوئے ملوک (بادشاہ) ہوں ام موصوفہ
فرماتی ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ، اللہ
تعالیٰ سے دعا کر دیجئے کہ مجھے بھی ان لوگوں میں
شامل فرما دیں۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے
ان کے لئے دعا فرمائی اس کے بعد پھر آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلم سر مبارک رکھ کر سو گئے اور تھوڑی دیر
کے بعد ہنستے ہوئے بیدار ہوئے حضرت ام حرام
نے جب سبب خندہ دریافت کیا تو فرمایا
کہ میری امت کے کچھ لوگ میرے سامنے پیش
کئے گئے جو جہاد فی سبیل اللہ میں معروف
تھے جیسا کہ آپ نے پہلے فرمایا تھا (یعنی بحری
جہاد میں) موصوفہ نے عرض کیا یا رسول اللہ دعا

کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل کر دیں۔

آنحضور نے فرمایا کہ تم پہلی جماعت میں شامل ہوگی۔

(چنانچہ ویسا ہی ہوا) موصوفہ حضرت معاویہ

بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں

بحری جنگ میں شریک ہوئیں اور خشکی پر اترنے

کے بعد سواری سے گر کر انتقال فرما گئیں۔

حدیث سے کالشمس فی نصف النہار یہ بات واضح ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت شام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ امارت تھی اس لئے کہ انہیں کے زمانۂ امارت میں وہ بحری غزوہ واقع ہوا جس کے بارے میں آنحضور نے اظہار مسرت فرمایا جسے بارگاہ رسالت سے سند قبولیت عطا فرمائی گئی اور جس کے لشکر کا سید الاولین والآخرین کی نگاہ مبارک میں مغفور و مقبول اور آنحضور کے پسندیدہ امتی تھے۔ جس شخص کی امارت میں ایسا مقبول بارگاہ الٰہی اور پسندیدہ قلب رسالت پناہی غزوہ واقع ہوا، اس کے اور اس کے امارت کے عند اللہ مقبول اور عین مرضیِ رسول ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن معاملہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مورخین و اصحاب سیر متفق ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خود بنفس نفیس اس غزوہ میں شریک اور اس کے امیر تھے۔ یہ فتح قبرص کی مہم تھی جو حضرت معاویہؓ ہی کے اصرار پر شروع کی گئی تھی۔ اس کے سپہ سالار اعظم خود حضرت معاویہؓ ہی تھے اور اس میں حضرت ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا نے شرکت فرمائی اور انتقال فرمایا۔[1]

---

[1] دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۷ تذکرہ حضرت عثمانؓ۔ نیز الجزا الیاری شرح بخاری از علامہ کرمانی شرح حدیث مذکور ۱۲

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے سمجھ لیا ہو گا کہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کو امیر شام مقرر فرمایا جائے، اس لئے آپ نے کبھی انہیں اس منصب سے معزول کرنے یا ان کا تبادلہ کرنے کا ارادہ نہیں فرمایا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو خود آقائے دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم نے امیر بنانا پسند فرمایا حضرت عثمانؓ کی کیا مجال تھی کہ انہیں اس سے معزول کرنے کا خیال بھی دل میں لاتے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت عثمانؓ نے اس حدیث سے مذکورہ بالا نتیجہ کیسے نکالا حالانکہ یہ استنباط تو غزوۂ قبرص کے بعد ہی ہو سکتا تھا جو ۲۸ھ میں واقع ہوا، اور حضرت عثمان ۲۴ھ میں خلیفہ ہوئے۔ اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ موصوف نے اجتہاد و استنباط ہی سے کام لیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان اشخاص میں سے بعض کے نام بتا دیئے ہوں مثلاً خود حضرت معاویہؓ کا نام بتا دیا ہو یا کچھ ایسی علامتیں بتا دی ہوں جن سے انہوں نے شناخت فرما لیا ہو۔ عین ممکن بلکہ ظن غالب یہ ہے کہ آنحضورؐ نے حضرت ام حرامؓ راویہ حدیث کو ان اشخاص میں سے بعض کے نام یا ایسی علامتیں بتائی ہوں گی جس سے وہ اس غزوہ اور اس جماعت غزوہ کو پہچان سکیں، تاکہ مدینہ سے شام جا کر ان میں شامل ہو سکیں، اور موصوفہ نے حضرت عثمانؓ کو ان امور سے آگاہ کر دیا ہو۔ اس کے علاوہ متعدد قرائن بھی ایسے موجود تھے جن سے حضرت عثمانؓ کے ایسے فہیم و فقیہہ شخص کا اس نتیجہ تک پہنچ جانا بہت آسان تھا۔ مثلاً حضرت معاویہؓ کی بحری طاقت اور بحری غزوات سے دلچسپی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی حکومت میں بحری بیڑہ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ ہی نے تیار فرمایا تھا، نیز بحری جنگ کی ابتدا کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ اس طرح حضرت عمرؓ سے ان کا اصرار کے ساتھ غزوۂ قبرص کی اجازت مانگنا۔ پھر خود حضرت عثمانؓ سے اجازت مانگنا، اس کے ساتھ ان کی اعلیٰ کارکردگی اور مدبرانہ تنظیم و تنسیق ایسے قوی اور عملی قرائن تھے جن سے

حضرت عثمانؓ کا ان کی امارت کو حدیث مذکورہ کا مصداق اور مرضی عند اللہ وعند الرسول سمجھنا آسان اور سہل تھا۔[1]

حضرت معاویہؓ کی امارت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو تو پسند تھی مگر مودودی صاحب کو سخت ناگوار ہے۔

الحاصل یہ مصلحتیں اور حکمتیں تھیں جن کی وجہ سے حضرت ذی النورینؓ نے ان حضرات کو اہم عہدوں اور مناصب پر مقرر فرمایا تھا جو اتفاق سے ان کے قریبی رشتہ دار بھی تھے یوں تو وہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بھی رشتہ دار تھے لیکن حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کا رشتہ زیادہ قریب کا تھا، ہو سکتا ہے کہ کچھ اور بھی مصلحتیں حضرت عثمانؓ کے پیش نظر ہوں جن کا علم ہمیں نہ ہو، جو شخص ذرا بھی انصاف سے کام لے گا اس کا فیصلہ یہی

---

[1] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حدیث مذکورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی امارت خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پسند تھی تو حضرت علیؓ نے انہیں کیوں معزول کیا؟
جواب یہ ہے کہ یہ اجتہاد کا اختلاف ہے اور اس میں حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ دونوں سے کسی پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ حدیث سے آنحضورؐ کی پسندیدگی تو ظاہر ہوتی ہے لیکن انہیں معزول کرنے کی کوئی مخالفت نہیں ثابت ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک کسی دوسری مصلحت کی بنا پر انہیں معزول کر دینے میں کوئی مضائقہ نہ ہو جس طرح حضرت عثمانؓ پر انہیں برقرار رکھنے کے سبب کوئی اعتراض نہیں وارد ہوتا، اسی طرح حضرت علیؓ پر انہیں معزول کرنے کی وجہ سے اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اس فعل سے یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت معاویہؓ اس حدیث کے مصداق نہ تھے۔ اسی طرح اس سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کو اس عہدے کے لئے موزوں و مناسب نہیں سمجھتے تھے جیسے حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو معزول فرمایا باوجودیکہ وہ انہیں اس عہدے کے لئے مناسب و موزوں سمجھتے تھے، معزول کرنے میں دوسری مصلحت تھی۔

ہوگا کہ حضرت عثمانؓ کا طرز عمل بالکل صحیح اور بہت مدبرانہ اور دوراندیشانہ تھا۔ مودودی صاحب اور ان کے پیشرو سبائیوں کا اعتراض بالکل بے بنیاد اور قطعی طور پر غلط و مہمل ہے۔

شیخینؓ کی پالیسی

بات تو ختم ہو چکی لیکن مودودی صاحب نے اس سلسلہ میں شیخینؓ کی جس پالیسی کا تذکرہ کیا ہے اس کے متعلق بھی دو لفظ عرض کر دیئے جائیں۔

یہ صحیح ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو کسی منصب پر مقرر نہیں فرمایا۔ فاروق اعظمؓ نے اپنے اقارب میں سے صرف دو صاحبوں یعنی حضرت نعمانؓ بن عدی اور حضرت قدامہؓ بن مظعون رضی اللہ عنہما کو منصب عطا فرمایا جس کا تذکرہ خود مودودی صاحب نے زیر نظر کتاب ص۹۵ پر کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط اور ادعائے بے دلیل ہے کہ ان حضرات نے اپنے اقربا کو مناصب حکومت سے محروم رکھنا اپنی پالیسی بنائی تھی۔ حق یہ ہے کہ نہ تو اپنے خاندان و قبیلہ کے افراد کو مناصب حکومت پر مقرر کرنا ان کی پالیسی تھی اور نہ ان کے لئے مناصب کو شجرۂ ممنوعہ قرار دینا ان کی پالیسی تھی۔ دونوں باتوں سے صرف نظر کر کے وہ حالات و مصالح کی روشنی میں اس مسئلہ کو دیکھتے تھے اور جس کا جس منصب پر تقرر قوم و ملت کے لئے زیادہ مفید اور مصالح دینی و دنیاوی کے زیادہ مطابق و مناسب پاتے تھے اس کا تقرر کر دیتے تھے، خواہ وہ ان کا کوئی عزیز قریب ہو یا نہ ہو۔ جو پالیسی مودودی صاحب نے ان کی طرف منسوب کی ہے وہ محض ان کی ذہنی اختراع ہے، جس کی کوئی دلیل وہ ان حضرات کے قول یا عمل سے نہیں پیش کر سکتے۔ فاروق اعظمؓ کے متعلق اس قسم کی جو روایت استیعاب سے مصنف نے نقل کی ہے اس کے متعلق ہم صفحات سابقہ میں مدلل طور پر واضح کر چکے ہیں کہ وہ بالکل جعلی سبائیوں کی وضع کردہ ہے اور محض افترا و بہتان کا درجہ رکھتی ہے۔

صدیق اکبرؓ کا خاندان تعداد کے لحاظ سے بہت چھوٹا تھا اور ان کا زمانہ خلافت بھی بہت

کم تھا۔ اگر اس مختصر گروہ اور مختصر زمانے میں انہیں اپنے خاندان کا ایسا فرد نہ مل سکا جسے کسی منصب پر مقرر کرنے کی انہیں ضرورت محسوس ہوتی۔ تو یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے۔ اور اس سے اس غلط دعوے پر استدلال کرنا کہ مناصب و خدمات مملکت کے سلسلے میں تقرر اقرباء سے اجتناب ان کی پالیسی تھی بالکل غلط بلکہ مضحکہ خیز استدلال ہے۔

یہ استدلال ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی عجمی کو کسی بڑے عہدے پر مقرر نہیں فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور کی پالیسی یہ تھی کہ کسی عجمی کو کوئی بڑا عہدہ نہ دیا جائے جس طرح یہ استدلال مہمل اور لغو قرار دیا جائے گا اسی طرح مودودی صاحب کا استدلال بھی لغو اور مہمل سمجھا جائے گا۔

فاروق اعظمؓ کا معاملہ تو اور زیادہ واضح ہے۔ ان کے یہاں تو اس اقرباء گریزی کی پالیسی کا نام و نشان بھی نہیں ملتا جس کا دعویٰ مودودی صاحب نے بڑے طمطراق کے ساتھ کیا ہے ان کا خاندان بھی چھوٹا تھا مگر مودودی صاحب نے خود تسلیم کیا ہے کہ انہوں نے حضرت نعمانؓ بن عدی اور حضرت قدامہؓ ابن مظعون کو منصب عطا فرمایا۔ دونوں فاروق اعظمؓ کے قریبی عزیز تھے۔ اگر عطائے مناصب میں اقرباء کو نظر انداز کرنا ان کی پالیسی تھی تو انہوں نے ان دونوں کا تقرر کیوں فرمایا؟ مودودی صاحب کا یہ کہنا بالکل بے وزن اور غیر منطقی ہے کہ انہوں نے ان دونوں کو معزول کر دیا تھا اس لئے کہ سوال تو تقرر کا ہے۔ جب تقرر فرما دیا تو مودودی صاحب کی مزعومہ پالیسی کے ہاتھ سے تنکے کا سہارا بھی نکل گیا بلکہ الٹا یہ ثابت ہو گیا کہ ان کی مزعومہ اقرباء گریزی فاروق اعظمؓ کی پالیسی نہ تھی۔ بعد کو معزول کرنے یا نہ کرنے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیا ان دونوں حضرات کو سیدنا فاروق اعظمؓ نے اس بنا پر معزول کیا تھا کہ وہ ان کے رشتہ دار ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ان کی معزولی سے مفروضہ پالیسی پر

استدلال - مادرِ مں گفتنا بچوٹے آنکھ" کا مصداق نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کیا اسی طرزِ استدلال کا نام تحقیق ہے؟ -

اس کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ کا طرزِ عمل دیکھئے۔ انہوں نے اپنے قریب ترین اقربا میں سے متعدد حضرات کو بڑے بڑے اور اہم ملکی و انتظامی عہدوں پر مامور فرمایا۔ ملاحظہ ہو حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو نو عمر صحابی تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو معزول کر کے کوفے کے گورنر بنائے گئے۔ حضرت عبیداللہ ابن عباس حضرت یعلی بن منیہؓ صحابی کو معزول کر کے یمن کے گورنر بنائے گئے۔ حضرت قثمؓ ابن عباسؓ کو مدینہ کی گورنری پر مقرر فرمایا گیا۔ یہ تینوں حضرات حضرت مرتضیٰؓ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے اسی طرح حضرت جعدہؓ بن ہبیرہ جو حضرت علیؓ کے بھانجے اور خویش تھے عہد علوی میں کوفہ کے گورنر مقرر کئے گئے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی بھی یہ پالیسی نہ تھی کہ اپنے اعزا و اقارب کو مناصب اور عہدوں سے دور رکھا جائے اور ان کے حکومت کے مناصب و خدمات کو شجرۂ ممنوعہ قرار دیا جائے۔[1]

---

[1] مودودی صاحب نے حضرت علیؓ کے اس طرزِ عمل کی یہ توجیہ کی ہے کہ انہوں نے اپنے اقارب کو اس لئے مقرر فرمایا کہ بکثرت اکابر صحابہ غیر جانبدار ہو گئے تھے۔ اور وہ حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ کی طرف سے عہدے قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے اس توجیہ کی کمزوری سے قطع نظر اس کا اثر ان لوگوں پر تو پڑ سکتا ہے جو حضرت مرتضیٰؓ کے اس طرزِ عمل پر معترض ہوں لیکن بحمد اللہ ہم حضرت مرتضیٰؓ اور ان کے اس طرزِ عمل پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں اس لئے کہ ہمیں ان کے تقویٰ، اخلاص اور تدبر و حکمت پر اعتماد ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کسی دینی مصلحت ہی سے ایسا کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اقربا کا تقرر فی نفسہٖ کوئی قابلِ اعتراض چیز ہے ہی نہیں، اور ان پر کوئی اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا اس لئے ہمیں کسی توجیہ کی حاجت نہیں ہے۔ مگر کیا یہ توجیہ یا اس قسم کی کوئی دوسری توجیہ خود حضرت علیؓ سے منقول ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو مودودی صاحب کی اس نکتہ آفرینی کے

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

جہاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قدم رکھا وہاں ان حضرات نے اپنا سر رکھا اور یہ حضرات ہر چیز میں اسوۂ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر رکھتے تھے وہ ایسی کسی چیز کو سلطنت کی پالیسی کیسے بنا سکتے تھے جس کے خلاف خود سرور کائنات نے عمل فرمایا تھا۔ حدیث سے جسے ذرا بھی تعلق ہے وہ جانتا ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر اور متولی خمس مقرر فرمایا اور مختلف اوقات میں مختلف عہدے دیئے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو غزوہ موتہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بعد سپہ سالار بنانے کا حکم دیا۔ اسد الغابۃ جلد اول میں حضرت حارث بن نوفل ہاشمی رضی اللہ عنہ کے تذکرے میں مذکور ہے کہ انہیں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جدہ کا عامل مقرر فرمایا تھا۔ موصوف آنحضور کے بھتیجے تھے۔ اپنے سسرالی رشتہ داروں کو تو آپ نے اور زیادہ مناصب عطا فرمائے۔ خلیفۃ المسلمین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے کتابت وحی کے اہم عہدے پر مقرر فرمایا جسے آج کل کی اصطلاح میں سکریٹری کا عہدہ کہہ سکتے ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی اور آنحضور کے برادر نسبتی تھے۔ اسی طرح اپنے خسر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور اپنے برادر نسبتی حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ اول الذکر کو نجران کا اور ثانی الذکر کو تیما کا گورنر مقرر فرمایا۔ اس کے علاوہ حدیث و سیرۃ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ بارگاہ رسالت میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما

(پچھلے صفحہ سے آگے) باوجود ان کا بدعا عنقا ہی رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پالیسی یہ تھی کہ خلیفہ اپنے اعزہ و اقربا کو مناصب عطا کرنے سے اجتناب کرے تو اس پالیسی کے خلاف عمل کرنے کی کوئی توجیہ خود انہوں نے کیوں نہیں بیان فرمائی؟ اگر ان کی یہ پالیسی ہوتی تو یقیناً وہ اپنے اس عمل کی یہ یا اور کوئی توجیہ کرتے۔ جب انہوں نے کسی توجیہ کی ضرورت نہیں محسوس فرمائی تو اس کے صریح معنی یہ ہیں کہ ان کی یہ پالیسی ہرگز نہ تھی۔ بلکہ وہ مناصب حکومت پر اعزا و اقربا کے تقرر کو بالکل جائز اور صحیح سمجھتے تھے۔ مودودی صاحب کا دعویٰ بے دلیل و باطل ہے۔

کے قرب و منزلت کی جو کیفیت تھی وہ صحابہ کرام میں سے کسی کو بھی حاصل نہ تھی اور دونوں حضرات کو آنحضور نے مختلف مناصب پر بھی مامور فرمایا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر تھے۔ حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کو دربار نبوی میں جو ممتاز مرتبہ حاصل تھا وہ بھی ایک معلوم و مشہور واقعہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی محتاج بیان نہیں ہے کہ یہ دونوں حضرات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خویش تھے۔ ان حقائق اور واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مودودی صاحب کا یہ قول بہت ہی حیرت انگیز ہے کہ :۔

"اگر قرابت کی بنیاد پر آپ کسی کو آگے بڑھانے والے ہوتے تو سب سے زیادہ بنی ہاشم کو آگے بڑھاتے لیکن ان میں سے صرف حضرت علیؓ کو آپ نے وقتاً فوقتاً بعض مناصب پر مقرر فرمایا"۔ (ص ۳۲۳)

بالکل صحیح ہے کہ محض قرابت کی بنیاد پر آپ نے کسی کو بھی کوئی عہدہ نہیں دیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ محض قرابت کی بنیاد پر آنحضور نے کسی کو کسی عہدے سے محروم بھی نہیں رکھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ آپ کی پالیسی یہ تھی کہ اپنے اہل قرابت کو ہمیشہ عہدوں اور مناصب سے محروم رکھا جائے محض باطل اور ادعائے بے دلیل ہے۔ مزید حیرت ان کے اس بیان پر ہے کہ اگر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اقارب کو بڑھانا چاہتے تو سب سے زیادہ بنی ہاشم کو بڑھاتے۔ گویا موصوف کے نزدیک قرابت صرف جد قریب میں اشتراک کا نام ہے۔ اسے ان کی بے خبری کہا جائے یا تجاہل عارفانہ۔ دنیا جانتی ہے کہ جد بعید میں اشتراک بھی قرابت کہلاتا ہے، اور یہ سراسر امر واقعہ ہے کہ اقارب کا لحاظ انسان بسا اوقات اپنے جد قریب میں اشتراک رکھنے والے اقارب سے زیادہ کرتا ہے، اور یہ کم رواج عام بلکہ ایسا قاعدہ ہے جسے تقریباً کلیہ کہا جا سکتا ہے کہ لوگ اپنے حقیقی برادر نسبتی یا خسر کو عم زاد بھائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ شریعت کا بھی صاف اشارہ ہے کہ مصاہرت سے دو خاندان ایک

ہو جاتے ہیں اور بیوی یا شوہر کے اقارب مثل اپنے نسبی اقارب کے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بیوی کی ماں داماد پر اسی طرح ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے جس طرح اپنی ماں حرام ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے سسرالی رشتہ داروں کو کسی معاملہ میں ترجیح دیتا ہے، عرفاً اس کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اقارب کو ترجیح دے رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے اس شخص پر اقربا پروری کا الزام لگایا جاتا ہے، جو اپنے سگے بھائی یا جو جد قریب میں شرکت رکھنے والے کسی رشتہ دار کو کسی عہدے یا منصب کے لئے محض قرابت کی بنا پر بغیر کسی دوسری وجہ ترجیح کے ترجیح دیتا ہے۔

مودودی صاحب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ایک غلط الزام لگانے کے لئے ان سب حقائق سے چشم پوشی کی اور آنحضور کا رشتہ معاذ اللہ سب اہل خاندان و قبیلہ سے توڑ کر صرف بنی ہاشم تک محدود کر دیا۔ گویا جد بعید میں شرکت ان کے نزدیک رشتہ داری میں داخل نہیں ہے، علیٰ ہذا مصاہرت کا تعلق بھی قرابت سے خارج ہے۔ یہ عجیب و غریب تحقیق اسی شخص کے نزدیک قابل قبول ہو سکتی ہے جو اپنی عقل و انصاف دونوں سے دست بردار ہو جائے اور حقائق کی طرف سے منہ چھپا لے۔

اپنی غلط بیانی کی تکمیل اور بیجا الزام تراشی کی تائید کے لئے مودودی صاحب نے لفظ "صرف" کا اضافہ فرمایا۔ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم میں سے بھی کتنے حضرات کو مناصب عطا فرمائے۔ یہ اس قدر مشہور واقعات ہیں جن سے انکار ناممکن ہے۔ مگر موصوف کی شان تحقیق ملاحظہ ہو کہ ان سب کو نظر انداز کر کے صرف حضرت علیؓ کے متعلق عطائے منصب کا تذکرہ فرمایا اور قاری پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم کو کوئی منصب دینے سے احتراز فرماتے تھے، صرف حضرت علیؓ کو آپ نے کسی خاص مصلحت سے بعض مناصب عطا فرمائے کیا اسی کا نام جماعت اسلامی کے یہاں تحقیق ہے؟ علمی دنیا میں تو اسے منا اللہ ذہبی کے مذموم لقب

سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اسی قسم کا مغالطہ موصوف کی اس عبارت میں بھی پنہاں ہے ۔

" حالانکہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ بنی ہاشم میں لائق آدمی ناپید تھے "

(صفحہ ۳۷۲)

محترم یہ کون کہتا ہے کہ بنو ہاشم میں لائق آدمی ناپید تھے ؟ لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جن افراد کو آنحضور نے مناصب عطا فرمائے وہ ان مناصب کے لئے بنو ہاشم کے افراد سے لائق تر ہوں ؟ یا یہ بھی نہ ہو ، لیکن کسی دوسری دینی مصلحت سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں مقرر فرمایا ہو اور انہیں جیسی لیاقت رکھنے والے ہاشمیوں کو نظر انداز فرمایا ہو ؟ دیکھئے حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو آنحضور سفر کے موقع پر مدینہ طیبہ میں اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گئے حالانکہ وہ نابینا بھی تھے اور ان سے لائق تر اصحاب بھی موجود تھے ۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ خلاف واقعہ بات بھی تسلیم کر لی جائے کہ آنحضور نے بنو ہاشم کو مناصب نہیں عطا فرمائے تو بھی اس امر کی کیا دلیل ہے کہ آنحضور نے انہیں قرابت ہی کی بنا پر نظر انداز فرمایا تھا ؟ کیا آنحضور نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی ؟ یا آپ کے کسی ارشاد سے یہ مستنبط ہوتا ہے ؟ حق یہ ہے کہ مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا سب جمع ہو کر بھی کوشش کریں تو بھی اس کی کوئی دلیل قیامت تک نہیں پیش کر سکتے ۔

مودودی صاحب نے اس معاملہ میں جس مغالطہ انگیزی کی کوشش کی ہے اس کی محرک صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت اور ان پر الزام بیجا لگانے کی شدید خواہش ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک دوسرا راز بھی پنہاں ہے جس کے اظہار کے بغیر ان کے طرز فکر کی ضرر رسانی کی مکمل تصویر سامنے نہیں آسکتی ۔ یہ راز کتب شیعہ دیکھنے سے منکشف ہوتا ہے ۔ شیعہ رواۃ و مورخین نے مختلف طریقوں سے اس کی کوشش کی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا رشتہ سوا بنو ہاشم کے قریش کے سب گھرانوں سے منقطع کر دیں ۔ وہ واقعات کی اس طرح تصویر کھینچتے ہیں کہ گویا خاندان بنو ہاشم قریش سے ایک علیحدہ

مستقل قبیلہ تھا اور اس کا کوئی نسبی تعلق بنو امیہ وغیرہ دوسرے خاندانوں کے ساتھ نہ تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قریش ایک خاندان تھا جس کی یہ سب شاخیں تھیں۔ سب کی رگوں میں ایک ہی خون تھا۔ اور سب کی اصل ونسل ایک ہی تھی۔ اس میں بنو امیہ و بنو ہاشم کا تعلق تو بہت قریب کا تھا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار خواجہ عبد اللہ کے دادا خواجہ ہاشم اور امیہ (یعنی سیدنا حضرت ابوسفیانؓ کے دادا) کے والد عبد شمس حقیقی بھائی تھے۔ یعنی دونوں خواجہ عبد مناف کے بیٹے تھے۔ گویا صرف دو پشتوں کے بعد سیدنا حضرت ابوسفیانؓ اور سید الاولین والآخرین صلے اللہ علیہ وسلم کا نسب ایک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قریش کے دیگر گھرانے ایک دوسرے مل جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان سب گھرانوں میں بعد کو جو رشتہ داریاں ہوتی رہیں انہوں نے ان سب کو اس طرح جوڑ دیا تھا، اور ایک دوسرے سے اس طرح گتھ گئے تھے کہ قریب وبعید میں امتیاز کرنا محتاج تامل وفکر ہوتا تھا۔ اس کی مثالیں بکثرت مشاہدے میں آتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک آرین نسل کے شخص کا حقیقی خالو کوئی سامی النسل شخص ہے۔ دونوں کے نسب اور اجداد میں بون بعید ہے لیکن اس کی خالہ کا بیٹا اس کا حقیقی خالہ زاد بھائی اور بہت قریبی رشتہ دار ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس کے خالہ زاد بھائی کو اس کا زیادہ قریبی رشتہ دار کہا جائے گا یا اس کے باپ کے چچا زاد بھائی کو، جو نسب میں اس کا شریک اور رشتہ میں اس کا چچا ہے؟ ظاہر ہے کہ خالہ زاد بھائی اس سے قریب تر ہے۔ حالانکہ باپ کی طرف سے دونوں کا نسب بالکل مختلف ہے۔ اس قسم کے رشتے قریش کے سب گھرانوں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھے، جو بعید کو قریب بنا دیتے تھے اور بسا اوقات قریب کو نسبتاً بعید کر دیتے تھے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نسب کے اعتبار سے سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ کی بہ نسبت سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ سے زیادہ قریب ہیں۔ دونوں کا نسب عبد مناف میں جا کر مل جاتا ہے جو دونوں کے جد مشترک ہیں۔

بخلاف اس کے صدیق اکبرؓ سے ان کا نسب قصی میں جا کر ملتا ہے جو عبد مناف کے والد ہیں۔ لیکن سیدنا صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی سیدنا حضرت اسماءؓ، سیدنا حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی والدہ ہیں اور وہ حضرت صدیق اکبرؓ کے حقیقی نواسے ہیں۔ اب فرمایئے کہ ان کا رشتہ صدیق اکبرؓ سے زیادہ قریبی ہے یا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے؟ سیدنا عقیلؓ ابن ابی طالب باعتبار نسب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ نسبت سیدنا فاروق اعظمؓ و سیدنا صدیق اکبرؓ زیادہ قریب ہیں، لیکن ان دونوں بزرگوں کی صاحبزادیاں زوجیت رسول کے شرف سے مشرف ہوئیں اور اس اعتبار سے رشتہ کا جو قرب انہیں حاصل ہو گیا وہ سیدنا عقیلؓ کے قرب رشتہ سے زیادہ ہے علیٰ ہذا سیدنا حضرت معاویہؓ کا رشتہ اگرچہ نسب کے اعتبار سے بعض دوسرے صحابہ کرام کی بہ نسبت آنحضور کے ساتھ دور کا ہے لیکن ام المومنین سیدتنا حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی اور آنحضور کے برادر نسبتی ہونے کی حیثیت سے ان کا رشتہ بہت سے قریب النسب صحابہ سے زیادہ قریب ہو گیا۔

یہ چند مثالیں محض صورت حال سمجھنے کے لئے ہم نے پیش کی ہیں، قریش کے مختلف گھرانوں میں اس طرح کے تعلقات بکثرت تھے جنہوں نے سب کو ایک ساتھ جوڑ دیا تھا اور پورے قبیلہ کو ایک گھرانا بنا دیا تھا۔ یہ تعلقات اور رشتے جاہلیت کے زمانے میں بھی ہوتے رہے اور اسلام کے بعد بھی اس لئے یہ کہنا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا خاندان صرف بنو ہاشم تک محدود تھا یا آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار صرف ہاشمی تھے حقیقت سے مجرمانہ چشم پوشی سخت نا انصافی اور غلط بیانی ہے۔

بانیان مذہب شیعہ نے اپنے بعض مخالف اسلام مقاصد کے لئے تاریخ کی تعبیر ایک خاص عنوان سے کی ہے جس طرح مارکس نے پوری انسانی تاریخ کو معاشی جدوجہد کی ایک نمود قرار دیا ہے اور تاریخی حوادث کی تعبیر معاشی طرز پر کی ہے، اسی طرح شیعوں نے اسلام کی ابتدائی تاریخ

اور مشاجرات صحابہ کی تعبیر و توجیہ صرف خاندانی عصبیت، تحاسد و تباغض، طلب جاہ و مال کی کشمکش کے ساتھ کی ہے۔ اس کذب و دروغ کو نباہنے کے لئے ان کے لئے لازم تھا کہ تا بہ امکان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ بنو ہاشم کے علاوہ سب اہل خاندان و قبیلہ سے منقطع کر دیں۔

افسوس ہے کہ مودودی صاحب نے بھی بالکل شیعی طرز فکر اختیار کیا ہے۔ ان کا منقولہ بالا جملہ اسی ذہنیت و طرز فکر کی غمازی کر رہا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی اسلام کی ابتدائی تاریخ کی شیعی تعبیر ہی کو بڑی حد تک اختیار کیا ہے اور انہوں نے بھی مشاجرات صحابہ کا رشتہ قبائلی عصبیت سے جوڑنے کی نارو ا اور ناکام کوشش کی ہے اس لئے ان کا قلم بھی بھٹک کر اسی سبائی راہ پر چلنے لگا۔ جو بخالف حقیقت منزل کی طرف جاتی ہے اسلام کی مقدس تاریخ کی یہ تعبیر غلط اور گمراہ کن ہے جس کی غلطی پر ہم پچھلے صفحات میں روشنی ڈال چکے ہیں، اس کے علاوہ خود منشاء نبوی کے بالکل خلاف اور مزاج رسالت پناہ کے مخالف ہے۔ غور تو کیجئے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رضاعت کے رشتوں کو مثل نسبی رشتہ کے قرار دیا ہے اور مصاہرت و مناکحت سے پیدا ہونے والے رشتوں کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ ازواج مطہرات کی کثرت میں جو حکمتیں پنہاں تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ قبائل عرب کی کثیر تعداد کے ساتھ آپ کا رشتہ قائم ہو جائے اور انہیں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جسمانی رشتہ کا بھی شرف حاصل ہو جائے۔ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور روایت یہ ہے کہ آپ نے بکثرت عورتوں سے اس طرح نکاح فرمایا کہ نکاح فرما کر جلدی طلاق دے دیتے تھے، وجہ یہ تھی کہ بہت سے لوگ ان سے رشتہ قائم کر کے ان کے واسطے سے سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے رشتہ داری کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے چونکہ بیک وقت چار سے زائد ازواج کا جمع کرنا حرام تھا اس لئے آپ کو کسی کو طلاق دینا پڑتی تھی۔ ذرا سوچئے کہ ان واقعات پر نظر کرنے سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابی آنحضور کے ساتھ رشتوں کو بھی اہمیت دیتے

تھے یا اس کی اہمیت کو نظر انداز اور کم کرنے کی کوشش کرتے تھے ؟ آنحضور کے ساتھ رشتہ جوڑتے تھے یا آنحضور کے قریبی رشتہ داروں کا رشتہ بھی آپ سے توڑتے تھے ؟ اس کے برعکس ان لوگوں کا طرزِ عمل کس قدر افسوسناک اور تعجب خیز ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ صرف بنو ہاشم سے جوڑتے ہیں اور دوسرے قریشی خاندانوں سے توڑتے ہیں ۔

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

اس فصل کی ابتدا تو " بلا فصل " والوں کی طرف سے ہوئی لیکن اب بہت سے سنی الاصل حضرات کا بھی یہ حال ہے کہ وہ بھی حضرت حسن حضرت حسین و امثالہم رضی اللہ عنہم کا تو ادب ہر حالت میں ملحوظ رکھتے ہیں اور ملحوظ رکھنا چاہئے ۔ لیکن ان کا وہی قلم جو قدم قدم پر ان مقدس حضرات کی قدم بوسی کرتا ہے اور ان کے سامنے سر نیاز خم کرتا ہے ، حضرت معاویہ اور حضرت ابو سفیان و امثالہما رضی اللہ عنہم کی جناب میں گستاخی و بے ادبی میں بے باک ہو جاتا ہے ۔ حالانکہ رتبہ صحابیت سے قطع نظر کر کے بھی محض سرکار رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ داری کے زاویہ سے دیکھا جائے تو بھی اس بے باکی اور آزادہ روی کی گنجائش نہیں نکل سکتی ، اس لئے کہ یہ حضرات بھی آنحضور کے بہت قریبی رشتہ دار اور آپ کے خاندان کے افراد تھے ۔ اول الذکر بزرگوں کی شان میں گستاخی سے جس طرح آنحضور کے منور و مقدس قلب کو تکلیف پہنچ سکتی ہے یقیناً اسی طرح حضرت معاویہؓ وغیرہ ثانی الذکر بزرگوں کی بارگاہ میں بے ادبی و گستاخی بھی پہنچے گی ۔ سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ اہم ہے ۔ وہ آنحضور کے ساتھ قرابت میں اگر ایک اعتبار سے حضرت علی مرتضیٰؓ سے نسبتاً بعید ہیں تو ذی النورین ہونے کے اعتبار نسبتاً قریب تر ہیں آنحضور کے ساتھ قرابت و رشتہ داری کے شرف میں وہ کسی طرح حضرت علی مرتضیٰ سے کم نہیں ہیں ۔ مودودی صاحب کا انہیں ہدفِ اعتراض

بنانا یقیناً نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ناگواری کا سبب بنے گا۔

جمہور صحابہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ مصاہرت کا کتنا لحاظ ملحوظ فرماتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو صحاح ستہ میں مذکور ہے کہ جب سیدتنا حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ بننے کا شرف حاصل ہوا تو ان کے قبیلہ کے جتنے باندی غلام صحابہ کرام کے پاس تھے انہیں سب نے یہ کہکر آزاد کر دیا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سسرالی رشتہ داروں کو ہم غلام یا باندی کیسے بنا سکتے ہیں۔

مسلم شریف کتاب الفضائل میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مصر کی پیشین گوئی فرمائی اور وہاں کے باشندوں سے مخصوص طور پر حسن سلوک کی وصیت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان سے رحمی یا فرمایا کہ مصاہرت کا رشتہ ہے۔ رحمی رشتہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے اور مصاہرت رشتہ سیدتنا ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے۔

اس طویل جملہ معترضہ کو ختم کرکے پھر سر مطلب آیئے۔ گفتگو مناصب کے متعلق آنحضور اور خلفائے راشدین کی پالیسی پر ہو رہی تھی۔ گذشتہ سطور میں اس کے متعلق مودودی صاحب کی غلط بیانی کی وضاحت کرنے کے بعد میں اجمالی طور پر ان حضرات کی اصل پالیسی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

جو شخص فہم سلیم و علم دین کی نعمت سے بہرہ یاب ہوگا اور اس نقطۂ نظر سے حدیث و سیرت کا مطالعہ غائر نظر سے کرے گا یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عطائے منصب میں صرف اہلیت و قابلیت اور دینی مصلحت و ضرورت کو ملحوظ فرمایا ہے۔ اپنے ساتھ قرابت کی وجہ سے نہ کسی کو منصب عطا فرمایا اور نہ کسی کو اس سے محروم کیا۔ ہمیں کوئی بھی ایسی دلیل نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ آنحضور نے کسی صاحب کو محض اس بناء پر کسی منصب سے محروم رکھا ہو یا معزول فرمایا ہو کہ وہ آپ کے عزیز اور رشتہ دار ہیں اور نہ اس کی کوئی دلیل ملتی ہے کہ آپ نے کسی شخص کو کوئی

منصب صرف اس لئے عطا فرمایا ہو کہ وہ آپ کے رشتہ دار ہیں۔ ہر جگہ حکمت و مصلحت اور جس شخص کی مادّی و روحانی اہلیت ہی پیش نظر معلوم ہوتی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ آپ کے رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔

سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ اور سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی پالیسی بھی یہی رہی اس کے ساتھ انہوں نے یہ اصول بھی بنا لیا کہ جن صاحب کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی منصب پر سرفراز فرمایا تھا انہیں ان حضرات نے عطائے منصب میں ترجیح دی، اسی طرح جن صاحب کو کسی خاص صلاحیت کے بارے میں آنحضورؐ نے کچھ ارشاد فرمایا تھا ان کی اس صلاحیت سے کام لینے کی کوشش فرمائی۔ سیدنا حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی یہی چیز پیش نظر رکھی لیکن بعض مواقع کی وجہ سے شیخین کی طرح وہ یہ اصول ملحوظ نہ رکھ سکے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے منتخب کردہ افراد کو ترجیح دیجائے ان میں سے کسی کی بھی پالیسی وہ نہ تھی جو مودودی صاحب نے بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے متعلق ان کا یہ قول بالکل بے معنی ہو جاتا ہے کہ وہ ان حضرات کی جینہ پالیسی سے ہٹتے چلے گئے؛ جب اس پالیسی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا تو اس سے ہٹنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

مودودی صاحب کی اس رائے سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا حضرات ابوبکر و عمر و علی رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اپنے اقربا کو محض اپنے اقربا ہونے کی وجہ سے عہدے نہیں دیئے۔ لیکن تعجب ہے کہ موصوف نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ سوء ظن کس دلیل کی بناء پر قائم کیا ہے کہ انہوں نے جو مناصب اپنے اقربا کو دیئے وہ محض قرابت کی بناء پر دیئے تھے؟ اگر کوئی مصلحت سمجھ میں بھی نہ آتی تو بھی سیدنا ذی النورینؓ کی جلالت شان اور پاکیزگی نفس پر نظر کرتے ہوئے اس کی پوری گنجائش موجود تھی، بلکہ یہ چیز واجب تھی کہ ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جاتا اور یہ سمجھا جاتا کہ انہوں نے کسی نہ کسی دینی مصلحت ہی سے ایسا کیا ہوگا، محض قرابت کی بنا پر مناصب نہ دیئے ہوں گے۔

خدمات جبکہ خود مودودی صاحب کے نزدیک بھی جن حضرات کو مناصب تفویض کئے گئے انہوں نے اپنا کار منصبی قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ مگر افسوس ہے کہ موصوف حسن ظن سے تو کیا کام لیتے انہوں نے تو ان مصالح کی طرف سے بھی منہ پھیر لیا جو بالکل واضح تھے اور جن کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں۔ جب حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کی بے دلیل بلکہ خلاف دلیل بدگمانی پر گرفت کی گئی تو انہوں نے اس کا اظہار کیا کہ انہیں حضرت عثمانؓ کے ساتھ سوءظن نہیں ہے اور وہ ان پر اقربا پروری کا الزام نہیں لگا رہے ہیں لیکن ان کے طرز عمل کی یہ توجیہ کی۔

• دراصل ان کے اس طرز عمل کی بنیاد وہی تھی جو انہوں نے خود بیان فرمائی ہے کہ وہ اسے صلۂ رحمی کا تقاضا سمجھتے تھے۔ (ص ۳۱ بحوالہ الطبقات ابن سعد و کنز العمال)

متحیر ہوں کہ توجیہ کو حضرت ذی النورینؓ کی طرف سے دفاع کہوں یا معاذاللہ ان کی ہجو ملیح؟ صلۂ رحمی کا تقاضہ پورا کرنے اور حق قرابت ادا کرنے میں آخر کیا فرق ہے؟ اور کیا اقربا پروری کسی دوسری چیز کا نام ہے؟ پھر آخر مودودی صاحب نے نفی کس بات کی کی ہے؟ جس الزام کی انہوں نے نفی کی تھی اسی کو الفاظ بدل کر پھر ان کی طرف منسوب کر دیا۔ بلکہ مزید اضافہ یہ فرمایا کہ وہ اسے دین کا کام سمجھتے تھے۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک حضرت عثمانؓ معاذاللہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ صلۂ رحمی کا تقاضا اپنی ذات سے پورا کیا جا سکتا ہے، نہ کہ سلطنت و حکومت سے،

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

حق یہ ہے کہ مودودی صاحب کی یہ توجیہ و تاویل بالکل غلط، خلاف واقعہ اور تاویل القول بما لا یرضی بہ قائلہ کی مصداق ہے۔ اس سے ان کا مقصد محض ان سیدھے سادھے لوگوں کو بہلانا ہے جو ان کے ساتھ حسن ظن رکھنے کے باوجود حضرت ذی النورینؓ کی توہین و تنقیص پر برافروختہ ہیں ورنہ

حضرت عثمانؓ نے ہرگز عطائے مناصب کی یہ توجیہ نہیں بیان فرمائی کہ وہ اس کے ذریعے صلہ رحمی کا تقاضا پورا کرنا چاہتے ہیں، یا بالفاظ دیگر حق قرابت ادا کرنا چاہتے ہیں انہوں نے عطائے مال کا سبب صلہ رحمی اور ادائیگی حق قرابت کو ظاہر فرمایا ہے، نہ کہ عطائے مناصب کا۔ مودودی صاحب نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ درج ذیل ہے اسے ملاحظہ فرمایئے تو ان کا مغالطہ واضح ہو جائے گا۔

اخبرنا محمد بن عمر قال حدثنی محمد بن عبد اللہ عن الزہری قال لما ولی عثمانؓ عاش اثنتی عشرۃ سنۃ امیرا یعمل ست سنین لا ینقم الناس علیہ شیئا وانہ لاحب الی قریش من عمرؓ بن الخطاب لان عمر کان شدیدا علیہم فلما ولیہم عثمانؓ لان لہم ووصلہم ثم توانی فی امرہم واستعمل اقرباءہ واہل بیتہ فی الست الاواخر وکتب لمروان بخمس مصر واعطی اقرباءہ المال وتاول فی ذالک الصلۃ التی امر اللہ عبادہ اتخذ الاموال واستسلف من بیت المال وقال ان ابا بکرؓ وعمرؓ

ہم سے محمد بن عمر واقدی نے بیان کیا کہ مجھے محمد بن عبد اللہ نے زہری کے حوالے سے بیان کیا ہے (زہری کہتے ہیں) کہ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو بارہ سال تک اس منصب پر قائم رہے۔ اس میں سے چھ سال تک ان پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور وہ قریش میں حضرت عمرؓ سے زیادہ محبوب و مقبول تھے۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ ان پر سخت تھے، اور حضرت عثمانؓ نے ان کے ساتھ نرمی برتی اور احسان[251] کیا پھر ان کے معاملہ میں سستی کی اور اپنے اقرباء اور گھر والوں کو مناصب دیئے۔ نیز مال عطا فرمایا جس کے لئے انہوں نے اس صلہ رحمی کی تاویل اختیار کی جس کا حکم اللہ تعالے نے دیا ہے اس کے لئے انہوں نے مال حاصل کیا نیز

۲۵۱ ان امور پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ ۱۲

شرکان ذلک ماهو لهما و انی اخذ ته فقسمته فی اقربائی فانکره الناس علیه

بیت المال سے قرض بھی لیا اور فرمایا کہ حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ اس میں سے اپنا حق چھوڑتے تھے اور میں اسے کر اپنے اعزا کو تقسیم کر دیا ان کے اس طرز عمل پر لوگوں نے ناگواری کا اظہار کیا۔

یہ روایت ہے جو مودودی صاحب کی اس غلط اور گمراہ کن توجیہ و تاویل کی بنیاد ہے سند کے اعتبار سے اس کی حالت یہ ہے کہ یہ واقدی کے ایسے کذاب کی روایت ہے اور اس کی انتہا امام زہریؒ پر ہوتی ہے جو اگرچہ باعتبار علم و تقویٰ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ لیکن وہ خود ان واقعات کے مشاہد نہ تھے۔ ان کے اور حضرت عثمانؓ کے درمیان بہت زیادہ فصل ہے انہوں نے جو کچھ بیان کیا وہ کسی سے سنا ہی ہوگا۔ لیکن کس سے سنا؟ اس کا کوئی تذکرہ روایت میں نہیں ہے۔ بظاہر کسی قابل اعتماد شخص سے نہیں سنا ورنہ تذکرہ فرماتے۔ غالباً سبائیوں کی پھیلائی ہوئی افواہ کا انہوں نے تذکرہ فرمایا ہوگا۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ خود بھی اسے صحیح سمجھتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس سیاق میں تذکرہ فرمایا ہو کہ عام افواہ یہ ہے یا مخالفین حضرت عثمانؓ یہ کہتے ہیں۔ مجلسی گفتگو میں اس قسم کی باتیں آدمی ذکر کرتا ہے۔ مگر نہ اس کی صحت ضروری ہے اور نہ خود بیان کرنے والے کا اس کی صداقت پر اطمینان لازم ہوتا ہے۔ اس مجلسی گفتگو کو واقدی نے روایت کے طرز پر بیان کر دیا۔ یہ سب تو اس صورت میں ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ امام زہریؒ نے یہ بات فرمائی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ واقدی ایسے کذاب اور وضاع کی بات کا کیا اعتبار۔ اپنی طرف سے روایت گڑھ کر امام زہریؒ کی طرف منسوب کر دی ہو تو کیا عجب ہے۔

سند کے اعتبار سے اس روایت کی لغویت تو ظاہر ہو گئی لیکن مودودی صاحب نے اس سے

بالکل قطع نظر فرما کر اسے قبول فرما لیا ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے سند سے قطع نظر کر کے عرض کرتے ہیں کہ موصوف یا تو اس کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے یا قصداً اس کی غلط تشریح فرمائی۔ نادانستگی یا ہوشیاری سے موصوف نے ”تاول فی ذالک الصلۃ“ کے فقرے میں ”ذالک“ کا مشار الیہ ”واستعمل اقرباءہ“ ”واہل بیتہ“ دونوں کو بنایا ہے حالانکہ اس کا مشار الیہ صرف ”واعطی اقرباءہ المال“ ہے۔ نہ کہ ”واستعمل اقرباءہ“۔ دوسرے الفاظ میں راوی یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے اقرباء کو مناصب دیئے اور مال دیا۔ اور اس عطائے مال کی توجیہ یہ پیش فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے میں صلہ رحمی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ توجیہ صرف عطائے مال کی فرمائی نہ کہ عطائے مناصب کی، مودودی صاحب نے بزعم خود حضرت ذی النورینؓ کی غلطی ثابت کرنے کے لئے خواہ مخواہ اسے عطائے منصب کی توجیہ بھی بنا دیا۔ اس شانِ تحقیق کی داد دیجئے جس کا مقصد صرف عیب جوئی ہی نہیں بلکہ عیب آفرینی بھی ہو۔

لطیفہ یہ ہے کہ اسے موصوف نے حضرت عثمانؓ کی ”اجتہادی غلطی“ کے نرم الفاظ استعمال کر کے بے خبروں اور ناواقفوں کو مغالطہ دینا اور اس خلافِ حقیقت بات کو باور کرانا چاہا ہے۔ یہ مغالطہ در مغالطہ ہے جو کسی طرح علمی انداز بیان نہیں کہا جا سکتا۔

عمال عثمانی پر اعتراضات اور ان کے جوابات

سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وارضاہ نے جن اموی حضرات یا اپنے اقربا کو مختلف عہدوں اور مناصب پر مقرر فرمایا تھا یا کسی منصب پر باقی رکھا تھا، ان کی سیرت اور ان کے کردار کو بھی مودودی صاحب نے ہدفِ طعن و تشنیع بنایا ہے۔ اس معاملہ میں شیعوں کی کامل پیروی کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

• دوسرے یہ کہ اسلامی تحریک کی سربراہی کے لئے یہ لوگ موزوں بھی نہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ ایمان تو ضرور لے آئے تھے مگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت سے ان کو اتنا فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ان کے ذہن اور سیرت وکردار کی پوری قلب ماہیت ہو جاتی۔ وہ بہترین منتظم اور اعلیٰ درجہ کے فاتح ہو سکتے تھے اور فی الواقع وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے لیکن اسلام محض ملک گیری و ملک داری کے لئے تو نہیں آیا تھا، وہ اولاً و بالذات ایک دعوت خیر و صلاح تھا جس کی سربراہی کے لئے انتظامی اور جنگی قابلیتوں سے بڑھ کر ذہنی و اخلاقی تربیت کی ضرورت تھی اور اس کے اعتبار سے یہ لوگ صحابہ و تابعین کی اگلی صفوں میں نہیں بلکہ پچھلی صفوں میں آتے تھے۔ (صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰)

کیا رائے ہے موصوف کی سیدنا حضرت وحشیؓ کے متعلق جنہیں ایمان کے بعد آنحضور کی صحبت و تربیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع شاید چند دن بھی نہیں ملا؟ اور کیا رائے ہے ان کی عم رسول سیدنا حضرت عباسؓ کے بارے میں جنہیں آنحضور کے فیض صحبت و تربیت سے استفادے کا اتنا ہی موقع ملا جتنا سیدنا حضرت ابو سفیانؓ یا سیدنا حضرت معاویہؓ کو؟ اور ان کا کیا خیال ہے خویش نبی سیدنا حضرت ابو العاصؓ کے متعلق جنہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تربیت و مصاحبت کا موقع ان دونوں اموی بزرگوں سے بھی کم ملا؟ اسی طرح یہ بھی ارشاد ہو کہ قریش و انصار کے علاوہ عرب کے بعض دور افتادہ قبائل کے جو حضرات آنحضور کی بارگاہ میں سال میں ایک ہی بار چند یوم کے لئے باریاب ہوئے تھے مثلاً قبیلہ ربیعہ کے وفود یا وہ غیر قریشی حضرات صحابہ جو بعد فتح مکہ اسلام لائے تھے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت انہیں بہت قلیل مدت کے لئے میسر ہوئی تھی، ان حضرات کے ذہن اور ان کی سیرت کی پوری طرح قلب ماہیت ہوئی تھی یا نہیں؟ یا معاذ اللہ یہ سب ناقص تھے؟

اگر یہ حضرات کامل تھے اور ان کے ذہن اور ان کی سیرت کی پوری طرح قلب ماہیت ہوگئی تھی تو حضرت معاویہؓ حضرت ولیدؓ بن عقبہ حضرت عبد اللہؓ ابن سعد بن ابی سرح، حضرت عبد اللہ بن عامرؓ حضرت سعیدؓ بن العاص، حضرت مروان بن الحکم رضی اللہ عنہم کے ذہن اور ان کی سیرت کی قلب ماہیت کیوں نہیں ہو سکی تھی؟

اور اگر معاذ اللہ یہ سب حضرات ناقص تھے اور ان کی تربیت نہیں ہو سکی تھی تو یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

اول: اسلامی تحریک کی سربراہی کیا صرف حاکمانہ منصب ہی کا نام ہے یا دین کی دعوت دینا اور اس میں داخل ہونے والوں کی ذہنی اخلاق اور روحانی تربیت کرنا، کتاب و سنت کی تعلیم دینا یہ امور بھی اسلامی تحریک کی سربراہی میں داخل ہیں؟ غالباً مودودی صاحب بھی اس سے انکار کی جرأت نہ کر سکیں کہ یہ سب امور اسلامی تحریک کی سربراہی میں بدرجہ اولیٰ داخل ہیں خصوصاً جبکہ وہ خود فرما رہے ہیں کہ "وہ (اسلام) اولاً و بالذات ایک دعوت خیر و صلاح تھا۔ ظاہر ہے کہ خیر و صلاح کا داعی دعوت کا سربراہ نہ ہوگا تو اور کون ہوگا؟ اب سوال یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے پورے مجمع کو حکم دیا[1] فلیبلغ الشاهد الغائب۔ (جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں تک میری باتیں پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں) صحابہ کرام کے اس کثیر مجمع میں جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی آنحضور نے بلا استثنا تبلیغ و دعوت دین کا فریضہ ہر شخص پر عائد کر دیا۔ گویا ہر صحابی کو اسلامی تحریک کا داعی و سربراہ بنا دیا۔[2] حالانکہ اس مجمع میں مذ کورہ

---

[1] بخاری

[2] اس مضمون کو واضح کرنے کے لئے قرآن مجید کی آیتیں اور متعدد حدیثیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن بخوف طوالت ہم نے ایک حدیث پیش کی ہے جو اثبات مدعا کے لئے کافی ہے

بالا موی صحابی بھی موجود تھے اور بکثرت ایسے صحابی بھی موجود تھے جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بہت کم میسر ہوئی تھی اور خاصی تعداد ایسے حضرات کی بھی جس کی مدت مصاحبت ان اموی حضرات صحابہ میں سے اکثر سے کم تھی کتنی عجیب بات ہے کہ یہ سب حضرات دین کے داعی تو بن سکتے تھے مگر کسی حاکمانہ منصب کے لئے موزوں نہ ہو سکتے تھے حالانکہ یہ بدیہی بات ہے کہ داعی کے لئے حاکم سے زیادہ ذہنی و اخلاقی اعتبار سے تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ حاکم اگر ناقص ہو تو یہ اس کا ذاتی نقص سمجھا جاتا ہے لیکن اگر داعی ناقص ہو تو اجنبی اسے نفس دعوت کا نقص خیال کرتا ہے اور اسی سے متنفر ہو جاتا ہے۔ آج اسلام کی دعوت میں کمزوری کا سبب کیا ہے؟ یہی کہ مسلمان اپنے کردار و اخلاق کے اعتبار سے اس دعوت کا نمونہ نہیں ہیں، اس لئے جو حضرات ذہنی اخلاقی و روحانی اعتبار سے اس مقام رفیع پر فائز تھے، خود داعی اعظم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں اللہ کے دین کا داعی بنایا اور اس کے لئے بلا استثناء ان سب کو موزوں ٹھہرایا وہ یقیناً حکومت و اقتدار کے منصب کے لئے بھی اور دوسرے عنوان سے بالفاظ[1] مودودی صاحب اسلامی تحریک کی سربراہی کے لئے موزوں ترین افراد میں سے تھے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسی قسم کے حضرات صحابہؓ میں جنہیں بقول مودودی صاحب آنحضورؐ کی خدمت میں حاضری کا موقع کم ملا تھا اور جن کی تربیت بقول موصوف معاذ اللہ ناقص ہوئی تھی، بعض ایسے حضرات ملتے ہیں جنہیں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مناصب عطا فرمائے تھے اور بقول موصوف اسلامی تحریک کی سربراہی سپرد فرمائی تھی، مثلاً حضرت ابوسفیانؓ جو فتح مکہ سے ایک دن پہلے اسلام لائے تھے، آنحضور نے انہیں طائف کا محصل زکوٰۃ بنایا، اس کے بعد نجران کا گورنر مقرر فرمایا، حضرت معاویہؓ جنہیں آنحضور از رو اعتماد اپنے کاتب وحی کا انتہائی

---

[1] یہ الفاظ ہم نے اس لئے لکھے ہیں کہ ہمارے نزدیک اسلام کی تعبیر تحریک کے ساتھ اس کی ناقص تعبیر ہے۔ جو مناسب نہیں ہے اس کی وہی تعبیر صحیح ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے یعنی اسلام ایک دین ہے۔

اہم اور ذمہ دارانہ عہدہ عطا فرمایا اور پھر انہوں نے حضرموت میں سفارت نبوی کی خدمت انجام دی
یا حضرت یزید بن ابی سفیانؓ جنہیں دربار نبوی سے تیماء کی گورنری کا عہدہ تفویض ہوا تھا۔ یہ بھی
فتح مکہ کے دن یا اس سے ایک آدھ دن پہلے ایمان لائے تھے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
انہیں مکہ کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت باذان یمنیؓ کا نام بھی اسی سلسلہ میں ذکر کیا جا سکتا ہے، یہ بھی
بعد فتح مکہ ایمان لائے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کا گورنر بنایا۔ اگر یہ حضرات اسلامی
تحریک کی سربراہی کے لئے معاذ اللہ موزوں نہ تھے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں سربراہی
کیوں سپرد فرمائی ؟ اور اگر ان کے ذہن اور ان کی سیرت کی قلب ماہیت نہیں ہوئی تھی تو آنحضورؐ
نے انہیں کیوں ان مناصب پر مقرر فرمایا ؟

تیسری اہم بات یہ ہے کہ جمہور اہلسنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ سید الاولین والآخرین
صلے اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت اور مقاصد بعثت میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب اور تعلیم
حکمت کے علاوہ تزکیۂ نفوس بھی ایک اہم فریضہ اور مقصد تھا اور یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنے جملہ فرائض رسالت کامل طور پر ادا فرمائے اور جملہ مقاصد رسالت میں کامیاب و
بامراد ہوئے۔ اگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت تزکیہ و تربیت بھی عام انسانوں کی طرح
تھی جس کے لئے مزکی و مربی کے پاس مدت دراز تک رہنا خاصا اکثر لازم ہوتا ہے تو ہمارا یہ
دعویٰ ، کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی قلیل مدت میں ایک لاکھ سے زائد افراد کو اخلاقی
و روحانی، ذہنی و قلبی اعتبار سے ثریٰ سے اٹھا کر ثریا پر پہنچا دیا تھا اور اسے آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا ایک معجزہ اور آنحضور کی ایک دلیل و برہان قرار دینا کیا معاذ اللہ محض
شاعری ہے ؟

اگر مودودی صاحب کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ صرف مہاجرین اور

ان کے بعد انصار کی ایک تعداد ایسی نکلتی ہے جنہیں تربیت یافتہ اور مزکی کہا جا سکتا ہے صحابہ کرام کی اکثریت تو معاذ اللہ غیر مزکی اور ناقص ہی کہی جائے گی اس لئے کہ انہیں آنحضور کی خدمت میں حاضری کا کم ہی موقع ملا۔ ظاہر ہے کہ ان مہاجرین و انصار کی تعداد جملہ صحابہ کرام کے مقابلہ میں بہت کم تھی، اور موصوف کے اصول کی بنا پر ان میں سے بھی بہت سے لوگوں کو چھانٹ دینا پڑے گا۔ بعض کو تو خود مودودی صاحب نے نکال دیا ہے مثلاً سیدنا حضرت عثمان ؓ کو۔ وہ ان کے نزدیک معاذ اللہ کامل طور پر مزکی نہ تھے۔ ورنہ اپنے اقرباء کو مناصب و عطایا دیکر معاذ اللہ نا انصافی کے کیوں مرتکب ہوتے؟

طویل صحبت اور مدت دراز تک تربیت و نگرانی کے ذریعہ سے تو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام اس وقت بھی لوگوں کا تزکیہ کر دیتے ہیں اور انہیں بالفاظ مودودی صاحب اسلامی تحریک کی سربراہی کے قابل بنا دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہزاروں صحابہ کرام میں زیادہ سے زیادہ چار ہزار نفوس کو اگر طویل صحبت و تربیت کے بعد کمال حاصل ہوا تو اسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا معجزہ کہنا آخر کہاں تک بجا ہے؟ اور قرآن حکیم میں صحابہ کرام کی روحانی و اخلاقی بلندیوں کو جو رسالت محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک برہان جلی قرار دیا گیا ہے اس کی کیا تاویل و توجیہہ ہوگی؟

یہ کہنا بھی بے سود ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تزکیہ سے جو روحانی مراتب و درجات حاصل ہوتے تھے وہ کسی امتی کی صحبت و تزکیہ سے نہیں حاصل ہو سکتے۔ اس لئے کہ جب آنحضور کو امتیوں کی طرح تزکیۂ نفوس کے لئے طویل صحبت کثیر مدت کی احتیاج تھی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی قوت تزکیہ امتیوں سے (معاذ اللہ) زیادہ اور قوی تر نہ تھی، اور جب قوت تزکیہ میں یکسانیت و مساوات ہے تو کامل امتی بھی (معاذ اللہ) اپنے زیر تربیت افراد کو انہیں مراتب

تک پہنچا سکتے ہیں، جہاں تک آنحضور پہنچا سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ درجات و مراتب عند اللہ کی بلندی و
پستی ایک دوسری چیز ہے۔ اس سے یہاں بحث نہیں ہے، سوال صرف تربیت اخلاق کا ہے تاکہ اسلامی
تحریک کی سربراہی کے لئے موزوں ہو جائے۔ اس کے لئے اگر نبی و امتی دونوں کو یکساں طریقہ سے طویل
مدت درکار ہوتی ہے تو دونوں میں قوت تزکیہ اخلاق کو مساوی تسلیم کرنا پڑے گا اور محذور مذکور
لازم آئے گا۔ مودودی صاحب اگر اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں تو وہ انہیں مبارک ہو۔ ہم سب
اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ تو یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی
خاک پا کی بھی برابری نہیں کر سکتا۔ نبوت کے بعد رتبہ صحابیت سب سے بلند اور اونچا مرتبہ ہے جو
وہبی ہے اور صحابہ کرام کے بعد کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدے کی صحت اسی وقت ممکن ہے،
جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت تربیت و تزکیہ کو معجزانہ اور خارق عادت تسلیم کیا جائے، اور
اس کی تاثیر کو مدت و زمانہ کی شرط سے آزاد سمجھا جائے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ جناب مودودی صاحب نے اسلامی تحریک شروع فرمائی اور ان کی دعوت
پر جن لوگوں نے لبیک کہا ان میں سے متعدد کو اس تحریک کی سربراہی سپرد فرما دی یعنی اس کا داعی و
ناشر اور دوسروں کا مربی بنا دیا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے خود مودودی صاحب نے کسی سے بھی روحانی
و اخلاقی تربیت نہیں حاصل کی ہے، لیکن خیر اسے جانے دیجئے کم از کم بہت سے وہ لوگ جنہیں انہوں
نے تحریک کا سربراہ بنا دیا ان کی تربیت و صحبت سے بہت کم مستفید ہوئے اور آج بھی ان کا
لٹریچر پڑھ کر جو لوگ ان سے متعلق ہو جاتے ہیں اور پورے طور پر تحریک میں حصہ لینے پر آمادہ
ہو جاتے ہیں انہیں یہ سربراہی عطا کر دی جاتی ہے۔ غرض یہ کرنا ہے کہ کیا معاذ اللہ!
مودودی صاحب کی قوت تربیت و تزکیہ سلطان المزکین خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم سے
بھی زیادہ ہے کہ یہاں تو محض لٹریچر پڑھنے یا چند یوم ساتھ رہنے سے آدمی اسلامی تحریک کی

سربراہی کے لئے موزوں ہو جاتا ہے مگر معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے والے ماہ دو ماہ یا سال دو سال کی مصاحبت سے بھی اس قابل نہ ہو سکتے تھے؟ اگر بالفرض مودودی صاحب کی تحریک کامیاب ہو جاتے اور زمام حکومت ان کے ہاتھ میں آجائے تو ظاہر ہے کہ موصوف حکومت کے بڑے بڑے عہدے اور مناصب اپنے انہیں مقلدین کے سپرد کر دیں گے گویا مودودی صاحب کے زیر تربیت رہنے والے تو چند ہی دنوں میں اس لائق ہو جاتے ہیں کہ وہ اسلامی تحریک کی سربراہی داعیانہ حیثیت میں بھی کر سکیں اور حاکمانہ حیثیت میں بھی مگر سید العالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے قلیل المصاحبت اصحاب اس سربراہی کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے اور انہیں اس موزونیت ولیاقت کے لئے طویل صحبت وتربیت درکار تھی اعاذ نااللہ۔

عقل انگشت بدندان کہ اسے کیا سمجھے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"ان باتوں کا ردعمل صرف عوام ہی پر نہیں اکابر صحابہ تک پر کچھ اچھا نہ تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر جب ولید بن عقبہ کوفے کی گورنری کا پروانہ لے کر حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا "معلوم نہیں ہمارے بعد تو زیادہ دانا ہو گیا ہے یا ہم تیرے بعد احمق ہو گئے ہیں"

اس نے جواب دیا "ابو اسحاق برافروختہ نہ ہو، یہ تو بادشاہی ہے۔ صبح کوئی اس کے مزے لوٹتا ہے تو شام کوئی اور"

حضرت سعد نے کہا "میں سمجھتا ہوں واقعی تم لوگ اسے بادشاہی بنا کر چھوڑو گے" قریب قریب ایسے ہی خیالات حضرت عبداللہ بن مسعود نے بھی ظاہر فرمائے۔

(صفحہ ۱۰۵ بحوالہ استیعاب)

یہ کہنا بالکل غلط اور کذب صریح ہے کہ اکابر صحابہ حضرت عثمانؓ کی پالیسی سے ناراض تھے۔ اس غلط دعوے کو وہ کیا پوری سبائی پارٹی مل کر بھی ثابت نہیں کر سکتی۔ اس کے ثبوت میں جو روایت یہاں انہوں نے نقل کی ہے وہ استیعاب میں بغیر سند کے مذکور ہے، جس کی حیثیت بازاری افواہ بلکہ مدک خانے کی گپ سے زیادہ نہیں ہے۔ واضح کیا جا چکا ہے کہ استیعاب کسی طرح قابل اعتماد کتاب نہیں ہے۔ سبائیوں کی وضع کردہ جھوٹی کہانیوں اور طبع زاد افسانوں کا اس میں خاصا ڈھیر لگا یا گیا ہے یہ روایت بھی اسی میں داخل ہے۔

عقلاً و درایتاً بھی یہ روایت غلط معلوم ہوتی ہے۔ حضرت سعدؓ حضرت ولیدؓ کو کیوں اس طرح خطاب فرماتے؟ ان کا تقرر تو حضرت عثمانؓ نے کیا تھا۔ اگر اعتراض ہو سکتا تھا تو حضرت عثمانؓ پر نہ کہ حضرت ولیدؓ پر۔ وہ خود سے تو آئے نہیں تھے۔ پھر جب وہ آگئے تھے تو اعتراض کا کیا موقع تھا؟ اگر یہ تقرر ناپسند تھا تو انہیں ان کے آنے سے پہلے ہی حضرت عثمانؓ کو لکھنا چاہیے تھا۔ اچھا اس وقت نہیں لکھا تو بعد ہی کو لکھتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ حضرت ولیدؓ پر تو غصہ اتار رہے ہیں مگر خود حضرت عثمانؓ کو کچھ نہیں لکھتے، جنہوں نے حضرت ولیدؓ کا تقرر کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بھی یہی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان قرائن سے عیاں ہے کہ یہ روایت کسی سبائی کی وضع کی ہوئی جھوٹی اور جعلی ہے۔

لطیفہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے روایت کے لفظ "مُلک" کا ترجمہ ہر جگہ بادشاہی کے ساتھ کیا ہے حالانکہ ترجمہ "یہ تو اقتدار ہے" ہونا چاہیے۔ یہ کا مشارٌ الیہ اگر کوفہ کی گورنری ہے تو اسے "بادشاہی" کہنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا حضرت ولیدؓ وہاں کے بادشاہ بنا دیئے گئے تھے؟ اور اگر حضرت عثمانؓ کا اقتدار مراد ہے تو کیا حضرت ولیدؓ خلافت عثمانی کو بادشاہی سمجھتے تھے؟

روایت کے جعلی ہونے کا ایک قوی اور فیصلہ کن قرینہ یہ ہے کہ حضرت ولیدؓ کو اس سے پہلے حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اہم عہدوں اور مناصب پر مقرر فرما چکے تھے۔ اس وقت بھی وہ الجزیرہ کے عامل تھے جہاں ان کا تقرر فاروق اعظمؓ نے فرمایا تھا اور حضرت ذی النورینؓ نے اسی جگہ سے ان کا تبادلہ کوفہ کی گورنری پر کر دیا تھا۔ حضرت سعدؓ ان سب امور سے واقف تھے۔ تو کیا وہ ان سب حضرات خلفائے راشدین کو ان کے بارے میں غلط اندیش سمجھتے تھے؟ ان کے تقرر پر اعتراض ان پر نہیں حضرت عثمانؓ پر تھا۔ اور اگر ان پہ تھا تو کیا بات حضرات شیخینؓ تک نہیں پہنچتی ہے بلکہ اس کا اثر خاکم بدہن خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے کیونکہ خود آنحضورؐ نے بھی انہیں عامل صدقات کا منصب عطا فرمایا تھا۔ کیا حضرت سعدؓ یا حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے اس بے ادبی کا اندیشہ ہو سکتا ہے؟ کوئی سنی ان کے ساتھ یہ سوءِ ظن نہیں کر سکتا۔

اعتراض میں لفظ "ان باتوں" بھی قابل تشریح ہے۔ اس بہل سبائی روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے صرف ایک بات یعنی حضرت ولیدؓ کی گورنری پہ اکابر صحابہ کا اعتراض ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ تو ایک "بات" ہوئی۔ بقیہ "باتیں" اور ان کا مزعومہ "ردعمل" کہاں ہے؟ ایک بات کو بہت سی باتیں بنا دینا آخر علمی استدلال کی کون سی صنف ہے؟

یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ کیا صرف چند صحابیوں کا کسی بات پہ معترض ہونا عام طور پہ اکابر صحابہ کی ناگواری کے ہم معنی ہے؟ حضرت علیؓ کے بعض اقدامات پر تو اس سے کہیں بڑی تعداد میں اکابر صحابہ معترض ہوئے ہیں۔

بناء فاسد علی الفاسد

حقیقت حال یہ ہے کہ مودودی صاحب نے جس بنیاد پر اعتراض کی تعمیر کی ہے وہی

ہمرے سے باطل ہے ان کا یہ کہنا کہ ان حضرات کو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت وتربیت سے فیضیاب ہونے کا اتنا موقع نہ ملا تھا کہ ان کے ذہن اور ان کے کردار کی قلب ماہیت ہو جاتی بچند وجوہ بالکل غلط اور باطل ہے۔

اول سید المزکین صلے اللہ علیہ وسلم کی شان تزکیہ وتربیت آپ کا ایک معجزہ تھی جس کی تاثیر کامل کے لیے کسی طویل صحبت وتربیت کی حاجت نہ تھی۔ ایمان کے ساتھ روئے انور پر ایک نظر یا خدمت مبارکہ میں ایک لمحہ کی حاضری انسان کو سب رذائل اخلاق سے پاک اور سب فضائل روحانیہ سے مزین اور مالامال کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ اتنی ہی صحبت وبیعت ایک صحابی کو ولایت کے اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا دیتی تھی جہاں صحابی کے علاوہ کوئی امتی نہیں پہنچ سکتا یہ کہنا کہ صحابہ کرام کو روحانی ترقی تدریجاً حاصل ہوئی صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ غلط اس معنی میں کہ تربیت نفس تصفیہ باطن، تزکیۂ اخلاق کے لئے کسی تدریج کی حاجت نہ تھی۔ اس کے اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچانے کے لئے تو محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک نگاہ غلط انداز بھی کافی ہوتی تھی اور صحیح اس اعتبار سے ہے کہ اس کے بعد قرب الٰہی کے مراتب ودرجات میں ترقی تدریجاً ہوتی تھی۔

بطور مثال اس واقعہ پر نظر کیجئے کہ ایک پوری جماعت پاکستان یا ہندوستان کی ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان پاس کرتی ہے ان سب کا تقرر بحیثیت سند یافتہ ایڈمنسٹریٹر ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر سب مساوی اور یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ سب سند یافتہ اور ذمہ دار سول آفیسر ہونے کے مستحق اور اس کے لئے موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد مدارج ترقی میں فرق ہو جاتا ہے۔ کوئی ڈپٹی کمشنری ہی کے عہدے سے ریٹائر ہو جاتا ہے کوئی کمشنری تک پہنچتا ہے اور کوئی گورنری کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ اس فرق مراتب کے مختلف اسباب ہوتے ہیں لیکن سی پی ایس یا آئی اے ایس

کی ڈگری ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے اور اس اعتبار سے سب مساوی ہوتے ہیں۔ دوسری مثال علمائے دین ہیں۔ ایک عربی درسگاہ سے سو علماء کی دستار بندی ہوتی ہے۔ بحیثیت عالم دین سب مساوی ہیں، ہر ایک کو عالم دین کہا جائے گا لیکن اس کے بعد اپنی محنت، کوشش، ذہانت وغیرہ کے اعتبار سے مدارج ترقی میں فرق ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی عالم دین تھے اور بہت سے عبد اللہ و عبد الرحمٰن ہر سال عالم دین بن کر مدارس عربیہ سے نکلتے ہیں۔ دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے لیکن عالم دین ان میں سے ہر ایک ہوتا ہے۔

اسی طرح ہر صحابی رضی اللہ عنہ خواہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری کا موقع ساری عمر میں ایک لمحہ ہی کے لئے حاصل ہوا ہو، ولایت کے ایک اعلیٰ مرتبہ پر فائز اور نسبت قویہ عالیہ سے سرفراز ہو جاتے تھے، گویا مودودی صاحب کے الفاظ میں ان کے ذہن اور سیرت و کردار کی پوری قلب ماہیت ہو جاتی تھی، اس کے بعد مختلف اسباب کی وجہ سے ان کے مراتب قرب میں فرق ہوتا تھا اور یہ ترقی تدریجی ہوتی تھی۔

ہم اپنے اس دعوے کی دلیل میں قرآن، حدیث، اقوال سلف سب چیزیں پیش کر سکتے ہیں لیکن اس بحث کو طول دینے سے ہم اپنے موضوع سے بہت دور ہو جائیں گے، اس لئے تفصیلی بحث کو چھوڑ کر ہم صرف حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ اہلسنت کا مسلک یہ ہے۔

"چہ ایں بزرگواراں (صحابہ) را در اوّل صحبت خیر البشر علیہ و آلہ الصلوٰۃ و التسلیمات بطریق اندراج نہایت در بدایت آں میسر شود کہ کمّل اولیاء امت را در نہایت کم است کہ دست آید"

(مکتوب پنجاہ و ہشتم دفتر اوّل حصہ دوم)

(ترجمہ) ان بزرگوں (صحابہ) کو خیر البشر صلے اللہ علیہ وسلم کی پہلی ہی صحبت میں ابتدا ہی میں ایسا انتہائی درجہ (ولایت) میسر ہو جاتا ہے، جو کاملین اولیاء امت کو انتہا میں بھی بہت کم میسر ہوتا ہے۔

اسی مکتوب میں مزید تحریر فرماتے ہیں:۔

"لہذا وحشیؓ قاتل حمزہؓ کہ یکبار در صحبت خیر البشر رسیدہ بود از اویس قرنی کہ خیر التابعین است افضل است" (*)

(ترجمہ) لہذا (حضرت) وحشیؓ جو (حضرت) حمزہؓ کے قاتل بھی ہیں مگر ایک بار خیر البشر صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مشرف ہوئے حضرت اویس قرنیؓ سے افضل ہیں جو خیر التابعین تھے۔

دوم۔ صفحات ماسبق میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ حضرات جن کا تقرر حضرت عثمانؓ نے مناصب حکومت پر کیا تھا اور جن کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے ان میں سے اکثر وہ تھے جن کا تقرر خود خیر البشر صلے اللہ علیہ وسلم نے یا سیدنا صدیق اکبرؓ یا سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما میں سے کسی نے کسی منصب پر کیا تھا۔ اگر ان حضرات کی قلب ماہیت نہیں ہوئی تھی اور وہ بالفاظ مودودی صاحب اسلامی تحریک کی سربراہی کے لئے موزوں نہ تھے تو آنحضور یا شیخین نے ان کا تقرر کیوں کیا؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ یقیناً یہ سب حضرات کامل اور اس سربراہی کے لئے موزوں تھے۔

سوم۔ مودودی صاحب کا یہ قول بھی بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ ان اموی حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۔۔۔۔ صحبت و تربیت سے فیضیاب ہونے کا معتدبہ موقع نہ ملا تھا۔ حق یہ ہے کہ ان کو فتح مکہ کے بعد اڑھائی برس آنحضور کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا خاصا موقع ملا تھا۔ ہم عرض کر چکے ہیں

نوٹ: ان سب حضرات کے صحابی ہونے پر اتفاق ہے حضرت مروان کے متعلق اختلاف ہے لیکن راجح قول یہی ہے کہ وہ بھی صحابی تھے

کہ آنحضور کی خدمت اقدس میں ایک لمحہ کے لئے باریاب ہوجانا تزکیہ کاملہ اور تکمیل روحانیت کے لئے کافی ہوتا تھا تو ان حضرات کو تو مہینوں اور برسوں تک حاضری و مصاحبت کا شرف حاصل رہا تھا اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے بعض مثلاً حضرت ولیدؓ بن عقبہ یا حضرت سعیدؓ بن العاص جب دربارِ نبوی میں حاضر ہوتے تو بچے تھے اور عہد نبوی کا زیادہ حصہ ان کے بچپن ہی میں گزر گیا۔ اس لئے انہیں فیوض و برکات نبویہ سے مستفید ہونے کا زمانہ بہت کم ملا۔ کیوں کہ بچپن میں انسان میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ایسے فیوض عالیہ سے پورے طور پر مستفید ہوسکے۔ جواب یہ ہے اولاً یہ اصول ہی غلط ہے۔ تربیت اخلاق کے لئے تو بچپن کا زمانہ موزوں ترین اور مناسب ترین زمانہ ہوتا ہے۔ ثانیاً انوار قلب نبوی براہ راست روح کو منور فرمادیتے تھے جس سے اس ارتقائے روحانی کی صلاحیت خود بخود پیدا ہوتی تھی اور فہم معاد خود ان انوار کے سبب بالغ اور ترقی یافتہ ہوجاتی تھی۔ اس کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی۔

ثالثاً سادات اثنا حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت ابن عباسؓ و امثالہم بھی تو عہد نبوی میں بچے ہی تھے لیکن ان کا کمال روحانی اور علو مرتبت متفق علیہ ہے جیسے ان حضرات کو بچپن میں تربیت حاصل کر کے کمال حاصل ہوگیا ویسے ہی ان حضرات کو حاصل ہوگیا ورنہ وجہ فرق بیان فرمائی جائے۔

چہارم، ان حضرات کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اکابر صحابہ کرام کی صحبت میسر ہوئی تو انہیں کی تربیت تھی اور کیا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سیدنا صدیق اکبر و سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے مبارک دور کو خیر القرون یوں ہی فرمادیا تھا؟

مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ "یہ حضرات صحابہ و تابعین کی پچھلی صفوں میں آتے تھے" محض معاذ اللہ ہے۔ اول تو یہ سب حضرات صحابی تھے، دوسرے ان میں سے سب کا شمار اصاغر صحابہ میں نہیں کیا جاسکتا۔ سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو اکابر صحابہ میں داخل ہیں۔ تیسری بات یہ ہے

کہ صحابہ کرام میں جو فرق مراتب تھا عند اللہ درجات و مراتب قرب کے اعتبار سے تھا نہ کہ کمال اخلاق
صفائے نفس و باطن کے اعتبار سے۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو حضرت عمر یا حضرت علی
رضی اللہ عنہما سے افضل کہا جاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ معاذ اللہ ان دونوں حضرات کی تربیت
اخلاق میں کوئی کسر رہ گئی تھی۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بارگاہ الٰہی میں حضرت صدیق کا مرتبہ و
درجہ ان دونوں حضرات سے زیادہ بلند اور قریب ہے۔ ہم اس مضمون کی تفصیل کر چکے ہیں کہ کمال
اخلاق و تربیت باطن کے اعتبار سے سب حضرات صحابہ یکساں تھے جس طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام
کے درمیان فرق مراتب قرب بارگاہ الٰہی کے اعتبار سے ہے مگر کمال اخلاق اور تقدس نبوت کے
لحاظ سے سب مساوی ہیں، کسی میں بھی کوئی نقص نہیں تھا۔ اس لئے مودودی صاحب کا یہ قول اگر بالکل
صحیح بھی مان لیا جائے تو ان کے مدعا کے لئے بالکل مفید نہیں ہے۔

حضرت مروان رضی اللہ عنہ

سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے سکریٹری حضرت مروان رضی اللہ عنہ پر
طعن کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس معاملہ میں مثال کے طور پر مروان بن حکم کی پوزیشن دیکھئے اس کا باپ حکم ابن
ابی العاص جو حضرت عثمان کا چچا تھا، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا، اور
مدینہ آکر رہ گیا تھا، مگر اس کی بعض حرکات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے اسے مدینہ سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ ابن عبدالبر نے استیعاب
میں اس کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکابر صحابہ کے ساتھ
جو مشورے فرماتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح سن گن لیکر وہ انہیں افشا کر دیتا تھا، اور
دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اتارا کرتا تھا حتیٰ کہ

ایک مرتبہ حضورؐ نے خود اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا: ص ۱۱۰

پہلی قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ اگر بالفرض حضرت حکمؓ کے متعلق یہ ساری داستان تسلیم بھی کرلی جائے تو اس سے حضرت مروانؓ کا نقص اور قصور کیا ثابت ہوتا ہے؟ کیا باپ کے جرم کی وجہ سے بیٹا بھی مستحق سزا یا ملامت ہو جاتا ہے؟ جناب معترض یہ تو فرمائیں کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جو مشہور منافق (عبداللہ ابن اُبَی ابن سلول کے بیٹے تھے) کے متعلق ان کی کیا رائے ہے؟ علیٰ ہٰذا حضرت عکرمہ ابن ابی جہل رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ ان میں سے کسی پر بھی کسی کو بھی بے اعتمادی پیدا ہوئی یا کوئی سوسائٹی میں حقارت اور شبہ کی نظر سے دیکھا گیا؟ پھر حضرت مروانؓ میں کیا خصوصیت ہے کہ ان کے والد کے قصور کی بناء پر وہ ناقابلِ اعتبار اور سوسائٹی میں حقارت اور شک وشبہ کی نظر سے دیکھے گئے اور حضرت عثمانؓ کا انہیں عہدہ دینا قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے؟

اس کے بعد اصل حقیقت عرض ہے کہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ کو طائف بدر کرنے کا پورا قصہ سراپا کذب و دروغ سبائیوں کا وضع کردہ من گھڑت اور بالکل بے اصل ہے۔ صاحب استیعاب نے دوسرے بازاری قصوں کی طرح سبائیوں کے کوڑے سے اس کوڑے کو بھی سمیٹ کر اپنی کتاب کے اوراق میں ڈھیر کر دیا ہے اور اسی کتاب سے دوسرے مصنفین و مولفین نے آنکھیں بند کر کے اس لغو ولاطائل افسانہ کو نقل کر دیا ہے۔ اس کے موضوع ہونے کی علامتیں ملاحظہ ہوں۔

اوّل: یہ کہ صاحب استیعاب نے یہ سارا قصہ بالکل بے سند نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ کسی مورخ نے بھی اس کی کوئی سند نہیں ذکر کی ہے۔ بے سند قصے کو بازاری افواہ کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور اس کے وضع کرنے والے اور پھیلانے والے سبائیوں کے علاوہ اور کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہ یاد رکھئے کہ صاحب استیعاب اور قدیم مورخین اسلام کا عام طریقہ ہے کہ ہر روایت کو سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس روایت کی سند نہ بیان کریں اس کے متعلق یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اطلاع

نہیں ملی ہے اس لئے ایسی روایت ہرگز قابل اعتبار و یقین نہیں ہو سکتی۔ اس افسانہ کے متعلق علامہ ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

واما قولك (وطرد رسول الله صلی الله علیه وسلم الحکمؓ وابنهٗ من المدینة) فنقول. کان المروان سبع سنین او اقل فما کان له ذنب یطرد علیه بشهر لم تعرف ان اباه هاجر الی المدینة حتی یطرد منها فان الطلقاء لیس فیهم من هاجر فان النبی صلی الله علیه وسلم قال "لا هجرة بعد الفتح" ولما قدم صفوان ابن امیة مهاجرا امره النبی صلی الله علیه وسلم بالرجوع الی مکة وقصة طرد الحکم لیس له اسناد تعرف به صحتها۔

(میزان الاعتدال بین الرفض والاعتزال دفع مطاعن از حضرت ذی النورین ص ۱۹۵)

لیکن تمہارا یہ کہنا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حکمؓ اور ان کے بیٹے حضرت مروانؓ کو مدینہ سے شہر بدر کر دیا تھا تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت مروان تو اس وقت سات سال یا اس سے کم عمر کے تھے اس لئے ان سے کوئی ایسی خطا نہیں صادر ہو سکتی تھی جس پر انہیں شہر بدر کیا جاتا (یعنی حضرت مروان پر تو کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔ مترجم) پھر یہ کہ ہمیں کسی ذریعہ سے بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کے والد (حضرت حکم) نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اس لئے کہ طلقاء میں سے کسی نے ہجرت نہیں کی تھی اور بیشک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت واجب نہیں ہے چنانچہ جب حضرت صفوان بن امیہ (بعد فتح مکہ) ہجرت کرکے مدینہ آئے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مکہ واپس جانے کا حکم فرما دیا اور حضرت حکم کے شہر بدر کرنے کے قصے کی کوئی سند نہیں ہے جس کی بنا پر ہم اسے صحیح کہہ سکیں۔

علامہ کے نزدیک دو باتیں ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک اس قصہ کو غیر معتبر اور من گھڑت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے اور یہ کہ اس کی کوئی سند نہیں ہے دوسرے یہ کہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ کا مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آنا ہی ثابت نہیں ہے بلکہ قرینہ یہ کہتا ہے کہ انہوں نے ہجرت نہیں کی تو مدینہ سے طرد اور شہر بدر کرنا کیسے ثابت اور صحیح ہو سکتا ہے؟ ایک سمجھدار اور منصف مزاج آدمی مجبور ہے کہ اس سارے قصے کو موضوع اور دروغ باقی کا ایک نمونہ کہے۔

صاحب استیعاب کی شیعیت از عقل و خرد پہ آفرین ہے کہ انہوں نے ایک صحابی رسول کے متعلق جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم قبیلہ اور رشتہ دار بھی تھے اس لغو اور سراپا کذب و بہتان افسانے کو محض بازاری لوگوں سے سن کر بغیر کسی سند کے اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ حالانکہ وہ سند سے قطع نظر کر کے اگر درایت سے بھی کام لیتے تو اس کی لغویت آشکارا ہو جاتی۔ علامات کذب و وضع ملاحظہ ہوں۔

اول یہ کہ شہر بدر کرنے کے لئے آخر طائف کا انتخاب کس بناء پر فرمایا گیا؟ بظاہر آسان اور مفید صورت یہ تھی کہ انہیں ان کے وطن مکہ معظمہ ہی بھیج دیا جاتا اتنی بات بھی اشتباہ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے ساتھ ان کی طرف سے جن جرائم کو منسوب کیا گیا ہے وہ بھی اس کی دلیل ہیں کہ یہ قصہ سبائی کمیٹی نے کوفہ کے کسی نہاں خانہ میں بیٹھ کر وضع کیا ہے اول تو سبب بیان کرنے میں یہ اضطراب کہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ خود موجب اشتباہ ہے۔ دوسرے یہ کہ دونوں بیان کردہ سببوں میں سے ایک بھی عقل و قیاس کو اپیل نہیں کرتا۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ راز کیا تھے جنہیں حضرت حکم رض افشا کر دیتے تھے؟ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سارے عالم کے لئے معلم بنا کر بھیجے گئے تھے آپ کی تعلیم و تذکیر ہر خاص و عام پر ظاہر ہوتی تھی اس لئے جہاں تک تعلیم دین کا تعلق ہے اس میں رازداری کا احتمال ہی مفقود ہے۔ صرف ایک بات ایسی ہے جس میں کبھی کبھی آپ قدرے رازداری سے کام لیتے تھے، وہ

معاملہ تھا غزوات کا اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ جب آنحضور کا ارادہ کسی مقام پر غزوہ کا ہوتا تھا تو آپ بطور توریہ کسی دوسری طرف کے حالات وغیرہ کے متعلق گفتگو فرماتے تھے اور یہ صرف اس خیال سے ممکن ہے کہ منافقین اصل حال معلوم کر کے کسی ذریعے سے دشمن کو باخبر کر دیں۔

اس رازداری کا بھی ہمیشہ معمول نہ تھا۔ حدیث کی کتابیں دیکھ جائیے اور سیر کے دفتر کھنگال ڈالئے آپ کو ایک معتبر روایت بھی ایسی نہ ملے گی جو یہ بتا رہی ہو کہ فلاں غزوے کے متعلق آنحضور نے رازداری سے کام لیا اور صرف اکابر صحابہ سے گفتگو فرمائی لیکن اس راز کی سن گن پا کر حضرت حکم ؓ نے اسے افشاء کر دیا۔ اگر موصوف کی یہ عادت ہوتی تو کوئی واقعہ تو اس قسم کا منقول ہوتا۔ غزوات کو بھی جانے دیجئے کوئی اور ہی واقعہ اس قسم کا جو احادیث یا سیر میں قابل اعتبار طریقے سے منقول ہو دکھائیے جس میں حضرت حکم ؓ نے افشاء راز کیا ہو۔ معتبر تو ایک طرف اس قسم کی غیر معتبر روایت بھی کہیں نظر نہیں آتی اس کے صریح معنی یہ ہیں کہ حضرت موصوف پر یہ الزام محض من گھڑت اور بہتان واقعہ ہے۔

اس روایت کے موضوع اور بے اصل ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ محدثین نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا اور اپنی کتابوں کو اس بہتان سے پاک رکھا حالانکہ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو فقہی اعتبار سے بہت قابل اعتنا تھا۔ اگر یہ واقعہ ثابت ہو جائے تو اس سے ایک اہم دستوری مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ امیر کو اس کا حق ہے کہ کسی کے متعلق اگر یہ بات اسے معلوم ہو جائے کہ وہ حکومت کے راز افشاء کرتا ہے یا امیر کی توہین و تذلیل کر کے اس کے وقار کو کم کرتا ہے تو اسے شہر بدر کر دے، غالباً مودودی صاحب بحالات موجودہ جبکہ وہ حکومت پاکستان کی رعیت ہیں اس حکم کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، لیکن اگر اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس حکم کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

شہر بدر کرنے کا دوسرا مبینہ سبب بجائے خود روایت کے موضوع ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

مدینہ طیبہ میں فتح مکہ کے بعد جبکہ اسلام کی قوت و شوکت کا لوہا پورا عرب مان رہا تھا اور قبائل عرب جوق جوق داخل اسلام ہو رہے تھے کسی شخص کا ایسی جرأت کرنا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی (معاذ اللہ) نقلیں کرے گویا آنحضور کے ساتھ معاذ اللہ تمسخر و استہزاء کرے بالکل بعید از قیاس اور خلاف عقل ہے۔ مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صحابہ کرام نے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی تھے ان کی اس مبینہ حرکت کو دیکھ کر محض شکایت پر اکتفا کی اور قتل کرنا تو کجا انہیں مارا پیٹا بھی نہیں؟ حدیث نبوی کا مطالعہ کرنے والوں کو یاد ہو گا کہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل کہہ دیا تھا وہ بھی صراحت کے ساتھ نہیں اسے سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ برداشت نہ کر سکے اور ایک طمانچہ اس کے منہ پر مارا جس کی شکایت اس نے آنحضور کی خدمت قدس میں کی۔ جو حضرات آنحضرت کے متعلق اتنی بات برداشت نہ کر سکتے تھے انہوں نے مذکورہ صریح توہین کو کس طرح برداشت کر لیا؟ اگر یہ قصہ صحیح ہوتا تو ضرور وہ قتل کر دیئے جاتے۔ اس لئے کہ شرعاً بھی ایسے شخص کا قتل جائز ہے مسئلہ مشہور ہے کہ توہین رسول کفر ہے اور اس کے مرتکب کا قتل جائز بلکہ بشرط قدرت واجب ہے اگر کسی وجہ سے قتل نہ کئے جا سکتے تھے تو ارادۂ قتل، طلب اجازت قتل یا مار پیٹ کا کوئی واقعہ منقول ہوتا۔ حالانکہ اس قسم کا کوئی واقعہ کتب حدیث و سیر میں منقول نہیں ہے۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ روایت و الزام محض افترا اور دشمنان صحابہ کا گھڑا ہوا افسانہ ہے اس کی کوئی بھی اصل و بنیاد نہیں ہے۔

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بلوائیوں کے سامنے جو خطبہ دیا ہے اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

والحکم مکی سیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ الی الطائف ثم

اور (حضرت) حکم مکی ہیں آنحضور نے انہیں مکہ سے طائف بھیج دیا تھا پھر واپس بلا لیا تو آنحضو

ردہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیّرہٗ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ردہٗ اکذالک قالوا اللّٰھم نعم

ہی نے انہیں بھیجا اور آنحضور ہی نے واپس بلالیا (اس کے بعد حضرت عثمان نے حاضرین سے فرمایا) کہ یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ ان سب نے کہا کہ خدا یا بالکل ٹھیک ہے۔

(تاریخ طبری جلد پنجم واقعات ۳۵ھ)

یہ روایت استیعاب کی دونوں توجیہات مذکورہ کی کامل تکذیب کر رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آنحضور نے حضرت حکم کو طائف بھیجا ہے تو مکہ معظمہ سے بھیجا ہے نہ کہ مدینہ سے اور یہ واقعہ فتح مکہ کے بعد کا ہو سکتا ہے اس لئے کہ قبل فتح مکہ حضرت حکم مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے مکہ معظمہ میں قبل ہجرت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بھی ایسے نہ تھے کہ کسی کو جلا وطن کر سکتے۔ استیعاب میں جو الزام لگائے گئے ہیں یعنی نقلیں کرنا یا افشائے راز کرنا۔ یہ دونوں واقعات اگر ہو سکتے ہیں تو مدینہ کے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہیں پہنچکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ایسے تھے کہ آپ کسی کو جلاوطن کر سکتے۔ استیعاب کے بیان اور اس روایت میں کھلا ہوا تعارض ہے۔ ایسی صورت میں تاریخ کے طالب علم کے سامنے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں:

۱۔ طبری کی اس روایت کو تسلیم کرے اور استیعاب کے بے سند الزاموں کو سبائیوں کا افترا سمجھ کر مردود اور سراپا کذب قرار دے یا

۲۔ از تعارضا تساقطا کے قانون اور روایات کے اضطراب نیز اس روایت کی سند کے ضعف اور استیعاب کی روایت کے عدم استناد کو سامنے رکھ کر دونوں روایتوں کو مردود سمجھے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ سرے سے اس قسم کا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا اور جلاوطنی کا پورا قصہ حضرت حکم پر دشمنان صحابہ اور سبائیوں کا افترا و بہتان ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

عقل سلیم تو اسی دوسرے فیصلہ کو ترجیح دیتی ہے تاہم ایک احتمال یہ بھی نکلتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حکمؓ کو مکہ معظمہ سے طائف کسی دینی خدمت پر مامور کر کے بھیجا ہو اور پھر کسی مصلحت سے واپس بلا لیا ہو۔ اس واقعہ کو سبائیوں اور مفتریوں نے اس رنگ میں پیش کیا حالانکہ اگر ایسا ہوا تھا تو ظاہر ہے کہ یہ ان کی ایک بڑی فضیلت اور ان کے لئے باعث فخر ہے۔

روایت کے بے اصل موضوع ہونے کا مزید قرینہ یہ ہے کہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے متعلق عقلاً دو احتمال نکل سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ مومن مخلص ہوں دوسرے یہ کہ معاذ اللہ وہ منافق ہوں۔ اگر وہ مومن مخلص تھے اور یقیناً تھے تو ان سے اس قسم کے کسی جرم کا سرزد ہونا بالکل ناممکن اور محال ہے۔ اس کا امکان تو ہو سکتا تھا کہ کوئی مومن مخلص بھی شراب نوشی کا ارتکاب کر لیتا لیکن کم از کم آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے اپنی چشم دل کو منور کرنے والے کسی مومن مخلص سے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بے وفائی یا بارگاہ نبوی میں بے ادبی و گستاخی کا صادر ہونا ایسی بات ہے جسے کوئی صاحب فہم ممکن نہیں سمجھ سکتا۔

اور اگر کسی کی بے بصیرتی اسے دوسرے احتمال کی ظلمت میں مبتلا کر دے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابن ابی سلول وغیرہ منافقین کی طرح ان کے نفاق کا بھی کوئی تذکرہ کہیں ملتا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ یہ مسئلہ تسلیم شدہ ہے کہ منافقین اس وقت تک خوب پہچان لئے گئے تھے۔ قرآن مجید بھی بتاتا ہے کہ حق تعالے نے مخلصین و منافقین دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل ممتاز کر دیا تھا اور جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو آپ کی خدمت میں آنے والوں میں مومن و منافق نور و ظلمت کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے لیکن باوجود اس کے کوئی صاحب بھی ان کے متعلق منافق کا لفظ نہیں استعمال کرتے کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مومن مخلص تھے اور انہیں

منافق کہنے والے کو خود اپنے نفاق کا علاج کرنا چاہیے؟

یہ واقعہ بھی بہت قابل لحاظ ہے کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے مفسدوں نے وضاعین کی تراشیدہ داستان کے مطابق بھی حضرت حکم کو منافق نہیں کہا ہے۔ انہوں نے انہیں واپس بلانے پر تو اعتراض کیا ہے مگر یہ نہیں کہا ہے کہ معاذ اللہ وہ منافق ہیں۔ انہیں آپ نے یہاں کیوں رکھا ہے۔ اتنے سخت دشمن جو دروغ بافی افترا پردازی اور بہتان طرازی میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور ان سے واقف بھی تھے ان پر نفاق کا الزام لگانے کی جرأت نہ کرسکے تو بعد کو جو شخص انہیں منافق کہے اس کے لیے اول درجہ کے بہتان طراز اور بے حیا مفتری کے علاوہ اور کیا لقب تجویز کیا جاسکتا ہے؟

اگر بالفرض کفرض المحال ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ وہ منافق تھے تو سوال یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ منافقین کے ساتھ کیا تھا؟ عبد اللہ ابن ابی ابن سلول جو اس لمنافقین اور مفسدوں کا لیڈر تھا جس نے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح ایذائیں پہنچانے کی کوشش کی یہاں تک کہ ام المومنین سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی کی۔ اسے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلا وطن نہ فرمایا نہ خدمت اقدس میں حاضری سے منع فرمایا۔ ذوالخویصرۃ منافق جس نے صریح طور پر سید العادلین صلے اللہ علیہ وسلم پر تقسیم غنائم کے بارے میں عدل نہ کرنے کا بہتان لگا کر بے ادبی اور اپنی خباثت نفس کا اظہار کیا اسے بھی رحمۃ اللعالمین نے اپنی بارگاہ میں حاضری سے بھی منع نہیں فرمایا یہاں تک کہ جب بعض صحابہ نے جوش ایمانی کی وجہ سے اسے قتل کرنا چاہا تو آنحضور نے اس کی اجازت بھی نہیں دی حالانکہ اسے سبائیوں (خوارج و روافض) کا مورث ظاہر فرماکر اس کے نفاق پر مہر تصدیق ثبت فرمادی یہ دو مثالیں ہیں ان کے علاوہ خاصی تعداد منافقوں کی مدینہ طیبہ میں موجود تھی جن سے آنحضور اور صحابہ خوب واقف تھے لیکن کہیں بھی یہ واقعہ نہیں ملتا کہ آپ نے کسی منافق کو اس کی منافقانہ حرکتوں کی وجہ سے شہر بدر یا ملک بدر کردیا ہو۔ پھر آخر یہ حضرت حکم ہی کی

کیا خصوصیت تھی کہ انہیں یہ سزا دی گئی ؟

یہ دلائل وحقائق ابن سبائی تلبیس و تزویر کو پارہ پارہ کر کے اس حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیتے ہیں کہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے شہر بدر کرنے اور طائف بھیجنے کی کہانی بالکل من گھڑت، موضوع اور سراپا کذب و بہتان ہے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق جو روایت طبری اور البدایہ والنہایہ وغیرہ تاریخی کتابوں میں آتی ہے کہ جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ آپ نے حکمؓ کو کیوں مدینہ طیبہ آنے کی اجازت دی حالانکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہاں سے نکال دیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ آنحضور نے انہیں واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ روایت بھی بناء الفاسد علی الفاسد کی مصداق اور بالکل موضوع ہے۔ واقدی سیف بن عمر کے ایسے جھوٹے اور وضاع راویوں نے گذشتہ روایت کی بناء پر اس کا پیوند دوسری روایت میں لگا دیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جب اس قسم کا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا تھا تو حضرت عثمانؓ کو اعتذار کی ضرورت ہی کیا تھی ؟

اللہ تعالیٰ صاحب استیعاب اور ان جیسے مؤلفین کو معاف فرمائیں، انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اس بازاری قصے کو نقل کر کے صرف ایک صحابی ہی کے متعلق ایک بات نہیں بیان کر رہے ہیں بلکہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب بھی ایک کام کو منسوب کر رہے ہیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کسی قول یا فعل کو منسوب کرنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ کاش اس موقع پر انہیں حدیث نبوی[1] "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار" یاد آجاتی تو یقیناً وہ اس سراپا کذب روایت کو اپنی کتابوں میں درج کر کے انہیں ناقابل اعتماد اور

---

[1] جو شخص عمداً میرے متعلق کوئی غلط بیانی کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے (مشکوٰۃ)

بے وزن بنانے سے احتراز کرتے۔ رہے مودودی صاحب تو ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ عداوت بنی امیہ سے مغلوب ہونے کے باوجود صحیح وغلط اور افسانہ و تاریخ میں امتیاز کرینگے۔

حضرت مروانؓ کا درجہ

مودودی صاحب نے خود بھی تحریر فرمایا ہے کہ جب بعض روایت کے بموجب حضرت حکمؓ کو خارج البلد کیا گیا ہے تو مروان اس وقت ۷-۸ برس کا تھا۔ ص[11]

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی صحابیت سے انکار کی گنجائش مودودی صاحب کے لئے بھی باقی نہیں رہی۔ اس لئے کہ اس عمر بلکہ اس سے کم عمر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت رتبہ صحابیت تک پہنچا دینے کے لئے کافی ہے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی کم عمری ہی میں آنحضور کی زیارت کی تھی۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد ایسے حضرات ہیں جنہوں نے اس سے بھی کم عمر میں شرف زیارت حاصل کیا تھا ان کا شمار بھی جمہور علمائے اہلسنت نے صحابہ میں کیا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت مروان رضی اللہ عنہ کو صحابی نہ سمجھا جائے؟

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ اس فضا سے خاصے متاثر ہیں جسے شیعی پروپیگنڈے نے مسموم بنا دیا تھا اس لئے حضرت مروانؓ سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوتے:

ابن عم عثمانؓ بن عفان یقال له رؤیة	(حضرت مروان) حضرت عثمانؓ کے چچا زاد بھائی ہیں
فان ثبتت فلا یعرج علی من تکلم فیہ	کہا جاتا ہے کہ انہیں آنحضور کی زیارت کا شرف
وقد قال عروۃ بن الزبیرؓ کان مروان	حاصل ہے اگر یہ ثابت ہو جائے تو اس کے بارے
لا یتهم فی الحدیث وقد روی عنہ	میں کلام (اعتراض) کی گنجائش نہیں ہے اور حضرت
سہل بن سعد الساعدی الصحابی	عروہ ابن الزبیرؓ نے فرمایا کہ حضرت مروانؓ

اعتماداً علی صدقہ

(مقدمہ فتح الباری)

حدیث کے بارے میں متہم نہیں تھے ان سے حضرت سہلؓ ابن السعد الساعدی صحابی نے ان کی سچائی پر اعتماد کر کے روایت کی ہے۔

اسی مقدمے میں آگے مذکور ہے کہ حضرات زین العابدینؒ ابوبکر بن عبدالرحمٰن ابن الحارث رحمہما اللہ نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی حدیثوں اور ان کے فتوے پر اعتماد کیا ہے اور امام بخاری نیز دوسرے محدثین نے سوا امام مسلم کے ان کی روایت و رائے دونوں پر اعتماد کیا ہے۔

اگر جستجو کی جائے تو حضرت مروانؓ کے تقدس اور ان کی فضیلت کے بارے میں خاصی تعداد شواہد و واقعات کی ملے گی۔ لیکن بخوف طوالت ہم یہاں صرف ایک واقعہ بخاری شریف سے نقل کرتے ہیں ——— حضرت مروانؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما میں بہت مخلصانہ تعلقات تھے اتفاق سے ایک دن دونوں حضرات ایک جنازے کے ہمراہ تدفین میں شرکت کرنے گئے اور دونوں صاحبان جنازہ زمین پر رکھے جانے سے پہلے ہی بیٹھ گئے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو حضرت مروانؓ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا اور فرمایا کہ یہ (حضرت ابو ہریرہؓ) جانتے ہیں جنازہ زمین پر رکھنے سے پہلے ساتھ والوں کا بیٹھنا ممنوع ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ہاں یہ سچ کہتے ہیں[۱]۔

ملاحظہ ہو حضرت مروانؓ اس وقت مدینہ طیبہ کے گورنر ہیں، اور جنازہ زمین پر رکھے جانے سے پہلے بیٹھنا کوئی حرام یا معصیت نہیں ہے بلکہ صرف خلاف اولیٰ یا زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی کہا جا سکتا ہے مگر حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ سخت گیری جو بظاہر حضرت مروانؓ کی توہین

---

[۱] بخاری جلد اول کتاب الجنائز باب من تبع الجنازہ الخ

تھی ذرہ برابر انہیں ناگوار نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ ان کی اعلیٰ درجہ کی بے نفسی اور حق پسندی کو ظاہر کر رہا ہے ان پر اعتراض کرنے والے ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر انصاف کے ساتھ کہدیں کہ کیا وہ ان کے اس مثالی کردار کی اتباع کر سکتے ہیں؟ اور آج کل کے کتنے خانقاہ نشین مشائخ ان کی نظیر پیش کر سکتے ہیں

ان کی سیاست و تدبیر، مہارت انتظامی قابلیت، فہم و زیرکی ایسی چیزیں ہیں جن کا انکار ان کے مخالفین بھی نہیں کر سکتے اور خود مودودی صاحب کو بھی اس کا اعتراف اجمالی طور پر کرنا ہی پڑا۔ عمال عثمانی میں وہ بھی داخل ہیں اور ان کی ان اعلیٰ قابلیتوں کا اعتراف مودودی صاحب کر چکے ہیں جسے ہم پچھلے صفحات میں نقل کر چکے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس کے اہل تھے کہ انہیں خلافت اسلامیہ کا سکریٹری بنایا جاتا۔ ولو کرہ الحاسدون۔

مودودی صاحب کے ایک معتقد و مقلد نے حضرت مروان اور ان کے والد ماجد حضرت حکم رضی اللہ عنہما کے متعلق بعد جستجوئے بسیار ایک روایت دریافت فرمائی جس سے ان دونوں حضرات صحابہ کی مذمت نکلتی ہے۔ ذم صحابہ کے لئے اتنی کدو کاوش اور اس مقصد کے لئے آنکھیں بند کر کے ہر ایسی روایت کا سہارا لینا جس سے یہ مذموم خواہش پوری ہوتی ہو، خواہ وہ روایت بے اصل اور موضوع ہی کیوں نہ ہو، خالص شیعی ذہنیت ہے۔ مودودی صاحب اسلامی حکومت کا نعرہ لگا کر اٹھے تھے وہ کام تو ان سے کیا ہو سکتا تھا البتہ وہ اپنے اصل مقصد میں جسے مخفی رکھتے ہیں کامیاب ہوئے۔ یعنی انہوں نے اپنے مقلدین میں شیعی ذہنیت پیدا کر دی۔ شیعیت پر ان کا یہ اتنا بڑا احسان ہے جس کا شکریہ شیعی دنیا ہمیشہ ادا کرتی رہے گی۔

روایت مذکورہ مستدرک حاکم سے نقل کی گئی ہے اور ترجمان القرآن میں شائع ہوئی ہے۔ مجھے اس کا علم البلاغ کراچی بابتہ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ سے ہوا۔ روایت درج ذیل ہے:

لعن اللہ الحکم وما ولد — اللہ تعالیٰ نے حکم اور ان کی اولاد پر لعنت کی ہے (معاذ اللہ)

یہ روایت شیعوں کی وضع کی ہوئی اور کذب خالص ہے۔ جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

محب محترم مولانا ولی حسن صاحب ٹونکی مفتی جامعہ اسلامیہ عربیہ نیوٹاؤن نے "بینات" بابتہ ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ میں اس پر فیصلہ کن تنقید کی ہے، میں یہاں اسی کا خلاصہ ان کے شکریہ کے ساتھ درج کرتا ہوں۔

مستدرک میں اس قسم کی تین روایتیں مذکور ہیں۔ ایک ام المومنین حضرت عائشہ سے منقول ہے اس پر حافظ ذہبی نے اعتراض فرمایا ہے کہ یہ منقطع ہے۔ کیوں کہ ان کا آخری راوی محمد بن زیاد حضرت عائشہ سے روایت کرتا ہے ان کا سماع ام المومنینؓ سے ثابت نہیں ہے[1]۔

دوسری روایت حضرت عمرو بن مرہ جہنی رضی اللہ عنہ سے ہے اس میں ایک راوی ابوالحسن ہے جسے حافظ ذہبی نے مجہول لکھا ہے[2]۔ دوسرا راوی معز بن سلیمان ہے جو شیعہ ہے۔

منقطع اور مجہول کی روایت محدثین اور علمائے دین کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ حاکم نے دوسری روایت کو صحیح کہا ہے لیکن علمائے حدیث کے نزدیک یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ ان کی تصحیح کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ انہیں اس بارے میں بہت تساہل ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے دونوں روایتوں پر اعتراض کرکے انہیں مردود قرار دیا ہے۔

تیسری روایت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ہے، اسے بھی حاکم نے حسب عادت صحیح کہدیا ہے۔ حافظ ذہبی حاکم کا لفظ صحیح نقل کرکے اس کی غلطی واضح کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس روایت کا مدار احمد بن محمد الدشرینی پر ہے، جو ضعیف ہی نہیں بلکہ کذاب بھی ہے۔ ابن عدی اسے کذاب کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم بھی اسے ضعیف قرار دیتے ہیں اور اس سے روایت لینا ترک کردیتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس کا پورا گھرانا (احمد سے لیکر اشرین تک) روایت میں ضعیف ہے[3]۔

---

[1] المستدرک ج ۴ ص ۴۸۱، [2] تہذیب التہذیب ج ۲، [3] لسان المیزان ج ۱

اس روایت میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن محمد ہے یہ مدلس ہے اور منکر روایتیں مجہول راویوں سے روایت کرتا ہے [1]۔

مزید یہ کہ حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں بسلسلہ ترجمہ حضرت حکمؓ اسی قسم کی چند اور روایتیں بھی نقل کی ہیں، اور سب پر نقد فرمایا ہے۔ گویا سب کو بے اصل اور موضوع ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

قال ابن السکن یقال ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حکمؓ کو بد دعا دی تھی لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے۔ گویا اس قسم کی سب روایتیں باطل اور موضوع ہیں کوئی قابل قبول نہیں۔ [2]

اسی سلسلہ کی ایک روایت میں حافظ صاحب نے ایک راوی فرات بن صرد کے رفض کو بھی ظاہر فرمایا ہے۔ جناب مفتی ولی حسن صاحب کی تنقید ختم ہوگئی جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سند کے اعتبار سے ان روایتوں میں کوئی جان نہیں ہے اور یقیناً سبائیوں کی وضع کی ہوئی جعلی کہانیاں ہیں۔ اس کے بعد مجھے دو لفظ اور عرض کرنا ہیں۔ اگر بالفرض ہم ان سب جعلی روایتوں کو صحیح بھی تسلیم کرلیں تو بھی معترض کا مقصد نہیں حاصل ہوسکتا۔ اولاً اس لئے کہ انہیں روایتوں میں سے ایک روایت میں الا المومنین منہم (سوا ان کے مومن افراد کے) کے الفاظ بھی ہیں۔ اس زیادتی کو حسب قاعدہ محدثین سب روایتوں میں تسلیم کرنا پڑے گا اور اس کے بعد بات ختم ہوجاتی ہے۔ کفر کی حالت میں لعنت کا مستحق ہر کافر ہوتا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ مومن ہونے کے بعد جب وہ زائل ہوگئی تو اس پر طعن کرنے کے کیا معنی ہیں۔ حضرت حکم و حضرت مروان رضی اللہ عنہما مومن تھے تو لعنت سابقہ کا

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ [2] الاصابہ ج ۲

ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے ؟ اور مومن ہونے کے بعد انہیں ملعون کہنا کس طرح جائز ہو گا۔

ثانیاً۔ بخاری شریف جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی

میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قبیلۂ قریش کے لئے بد دعا فرمائی جس کے الفاظ یہ ہیں

اللھم علیك بقریش یعنی یا اللہ قریش کو ہلاک کیجئے۔ کفر کی حالت میں ہلاکت کے معنی غضب الٰہی

اور عذاب و الم میں مبتلا ہونے کے ہیں۔ لعنت کے معنی بھی رحمت سے دور کرنے کے ہیں۔ دونوں بد دعاؤں

کا ماحصل ایک ہی ہے۔ معترض صاحب فرمائیں کہ کیا وہ معاذ اللہ سب قریشیوں کو مغضوب علیہم سمجھتے ہیں؟

واضح رہے کہ اس وقت تک قریش کی اکثریت مسلمان نہیں ہوئی تھی۔ بنو ہاشم میں بھی بہت کم لوگ مسلمان

ہوئے تھے۔ اس کا جو جواب ان کی سمجھ میں آئے وہی ان کے اعتراض کا بھی قلع قمع کردے گا۔

ثالثاً۔ زیر بحث روایت میں لعن اللہ خبر ہے یا بد دعا۔ اگر بد دعا ہے تو لازم آتا ہے کہ وہ

قبول نہیں ہوئی۔ کیونکہ حضرت حکمؓ اور ان کی اولاد کو ایمان نصیب ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت

فرمائی ہوتی تو ایمان کیسے نصیب ہو جاتا ؟ اور اگر خبر ہے تو اشکال یہ ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کی خبر

خلاف واقع کیسے ہو سکتی ہے ؟ حالانکہ یہ حضرات خود بھی ایمان لائے اور ان کی نسل میں لاکھوں مومن پیدا ہوئے

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے مومن کامل اور مجدد وقت بھی ان کی نسل میں پیدا ہوئے

ان امور سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سند سے قطع نظر درایت بھی یہی بتا رہی ہے کہ معترض کی

نقل کردہ روایتیں موضوع جعلی اور رسوائی کا رخانے کی تیار کی ہوئی ہیں۔ معترض علم اور فہم دین سے

محروم ہونے کی وجہ سے اس قدر جری ہیں کہ انہوں نے ترجمان القرآن مئی ۱۹۷۱ء میں حضرت مروانؓ

کے لئے لعنت زدہ کا لفظ استعمال کیا۔ کاش انہیں اس حدیث نبوی کا علم ہوتا جس میں فرمایا گیا ہے

کہ کسی غیر مستحق لعنت پر لعنت کرنے سے وہ لعنت خود لاعن کی طرف واپس آجاتی ہے اور وہ لاعن

کے ساتھ ملعون بھی ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] مشکوٰۃ شریف باب حفظ اللسان ص ۴۱۳

زیر بحث عمالِ عثمانی پر جرح کی تمہید کے طور پر مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔

"تیسرے یہ کہ ان میں سے بعض کا کردار ایسا تھا کہ اس دور کے پاکیزہ ترین اسلامی معاشرے میں ان جیسے لوگوں کو بلند مناصب پر مقرر کرنا کوئی اچھا اثر پیدا نہ کر سکتا تھا۔" ص۱۱۱

گذارش یہ ہے کہ اگر آپ دل سے بھی اس کے قائل ہیں کہ اس دور کا معاشرہ پاکیزہ ترین تھا تو آپ کو ان بعض افراد کے کردار پر جرح و اعتراض سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت عثمانؓ کی اس مبینہ غلطی کی وجہ سے اس "پاکیزہ ترین معاشرے" میں کوئی ہیجان و اضطراب کیوں نہ پیدا ہوا؟ خود مدینہ میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عمارؓ وغیرہم پاکیزہ ترین معاشرے کے نمائندے اور ارکان موجود تھے۔ خلیفہ کو معزول کر دینا بھی ان کے اختیار میں تھا لیکن ان حضرات نے کچھ نہ کہا۔ برا اثر جو پیدا ہوا تو کوفہ، بصرہ اور مصر کے سبائیوں پر، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہی لوگ اس "پاکیزہ ترین معاشرے" کے نمائندے اور محافظ تھے کیا ان کی دینی غیرت ان سب حضرات سے بڑھی ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ سب حضرات یعنی حضرت علیؓ وغیرہ بھی حضرت عثمانؓ کے اس طرز عمل پر معترض تھے تو جواب یہ ہے کہ حرف اعتراض تو کوئی چیز نہیں ہے۔ پہلا حکم شرعی تو یہ ہے کہ منکر کو ہاتھ سے مٹایا جائے بشرطیکہ استطاعت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ باغیوں میں خلیفہ کو شہید کر دینے کی استطاعت تھی تو کیا ان حضرات میں خلیفہ کو معزول کر دینے یا اقل درجہ انہیں اپنی پالیسی اور اپنے عمال میں تبدیلی پر مجبور کر دینے کی استطاعت نہ تھی؟ اور جب تغیر بالید کی استطاعت تھی تو محض اعتراض کر کے یہ حضرات اپنے فرض سے کیسے سبکدوش ہو گئے؟ یہ جواب تو اعتراض کی حکایت تسلیم کرنے کے بعد ہے لیکن خود یہ نقص ہی غلط ہے جس پر ان شاء اللہ ہم آئندہ صفحات میں مناسب موقع پر بحث کریں گے۔

جن حضرات کو موصوف نے ہدف طعن و ملامت بنایا ہے ان میں حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو سر فہرست رکھتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

حضرت ولیدؓ بن عقبہ

۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنی المصطلق کے صدقات وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا مگر یہ اس قبیلے کے علاقہ میں پہنچ کر کسی وجہ سے ڈر گئے اور ان لوگوں سے ملے بغیر مدینے واپس جا کر انہوں نے یہ رپورٹ دے دی کہ بنی المصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور مجھے مار ڈالنے پر تل گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غضبناک ہوئے اور آپ نے ان کے خلاف ایک فوجی مہم روانہ کرنے ہی والے تھے کہ ایک سخت حادثہ پیش آجاتا لیکن بنی المصطلق کے سرداروں کو بروقت علم ہو گیا اور انہوں نے مدینہ حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ صاحب تو ہمارے پاس آئے ہی نہیں ہم تو منتظر ہی رہے کہ کوئی آکر ہم سے زکوٰۃ وصول کرلے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

یاایھاالذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا۔ ؎۱۱

اس روایت کے لئے موصوف نے تفسیر ابن کثیر کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے سورہ حجرات کی آیۂ موصوفہ کی تفسیر کرتے ہوئے اس کی شان نزول میں یہی روایت درج کی ہے اور بتایا ہے کہ اکثر مفسرین نے اسی شان نزول کو اختیار کیا ہے۔ حوالہ بالکل صحیح ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے اس موقع پر لکھا ہے کہ یہ روایت متعدد طرق سے مروی ہے، لیکن ان میں سب سے بہتر طریقہ مسند امام احمد بن حنبلؒ کا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہیں سے انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس کے بعد

طبری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے مگر ہم واضح کر چکے ہیں کہ طبری اس معاملہ میں قابل التفات بھی نہیں ہیں چہ جائیکہ قابل اعتماد ۔ مسند امام احمدؒ کے طریقے کو بہترین کہنے کے معنی یہ ہیں کہ خود ابن کثیر دوسرے طریقوں کو ضعیف اور ناقابل اعتماد و قبول سمجھتے ہیں ۔ آیئے ذرا اس احسن الطرق اور احسن الاسانید کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ یہ روایت اصول نقد پر پوری اترتی ہے یا نہیں ؟ اور قابل قبول کہی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

مسند امام احمد میں اس کی سند اس طرح بیان کی گئی ۔

قال احمد حدثنا محمد بن سابق ثنا عیسیٰ بن دینار حدثنی امنہ سمع الحارثؓ بن ضرار الحدیث ۔	امام احمد فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن سابق نے بیان کیا کہ عیسیٰ بن دینار کہتے تھے کہ مجھ سے بیان کیا کہ بیشک انہوں نے حضرت حارث بن ضرار سے سنا ۔

اب ملاحظہ ہو کہ اس میں عیسیٰ بن دینار طبقہ سابعہ میں ہیں[1] ۔ یہ طبقہ صرف تبع تابعی افراد پر مشتمل ہے[2] اس میں تابعین داخل نہیں ہیں یعنی اس طبقہ والوں نے کسی صحابی کی زیارت نہیں کی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ عیسیٰ بن دینار نے حضرت حارثؓ موصوف کو جو صحابی ہیں نہیں دیکھا تھا اور یہ روایت منقطع ہے ۔ عیسیٰ اور حضرت حارثؓ کے درمیان کوئی اور راوی بھی ہے جو مجہول ہے ۔ سند روایت نقل کر کے اس کا ترجمہ بھی اصل کے اسلوب پر کیا گیا ہے ۔ اس لئے اس کا طرز بھی اس انقطاع کو بتا رہا ہے ۔ حدثنا عیسیٰ بن دینار کے بعد " حدثنی " کا لفظ صاف طور پر کسی غیر مذکور راوی کی نشان دہی کر رہا ہے ۔ اگر انہوں نے خود صحابی موصوف سے سنا ہوتا تو عبارت اس طرح ہوتی " حدثنا عیسیٰ بن دینار انہ سمع " دونوں کے بیچ میں حدثنی کا لفظ نہ

---

[1] و [2] تقریب التہذیب

ہوتا۔ عیسیٰ کا طبقہ صالحہ سے ہونا ہی ثبوت انقطاع کے لئے کافی تھا۔ اس پر خود عبارت سند کی نشان دہی ثبوت مزید ہے۔ اب روایت کے منقطع ہونے میں کیا کلام رہا؟ اور اصول حدیث کا مسلہ مسئلہ ہے کہ منقطع روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔

روایت کے ضعیف اور غیر مقبول ہونے سے قطع نظر مودودی صاحب نے اس کے محل نقل اور مفہوم کے سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ اس روایت سے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا معاذ اللہ جھوٹا اور دھوکے باز ہونا ثابت ہوتا ہے اور مفسرین نے بھی یہی سمجھ کر اسے نقل کیا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں اور معترض صاحب کے قصور فہم کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ درحقیقت اس روایت سے حضرت ولید پر کوئی بھی جرح نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ہذا مفسرین کا بھی وہ مقصد نہیں ہے جو مودودی صاحب نے سمجھا ہے۔ حقیقت حال ملاحظہ ہو۔

روایت سے معلوم ہوتا ہے اور خود مودودی صاحب نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت ولید کے زیر بحث طرز عمل کا سبب خوف تھا لیکن خوف کا سبب کیا ہوا؟ یہ روایت اس سے بالکل ساکت ہے۔ اسی روایت سے ثابت ہے اور خود موصوف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ولید بنی المصطلق تک پہنچے ہی نہیں اس لئے ان کا کوئی قول یا فعل موجب تہمت نہیں ہو سکتا۔ سوا اس کے چارہ کار نہیں ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ حضرت ولید کو کسی شخص نے راستہ میں مل کر یہ خبر سنائی ہے کہ بنی المصطلق باغی ہوگئے ہیں اور تمہارے قتل کے درپے ہیں۔ اس سے انہیں خوف پیدا ہوا۔ اور وہ واپس ہو گئے۔ اس جھوٹے مخبر کو جس نے حضرت ولید کو یہ غلط خبر دی ہے۔ قرآن مجید میں "فاسق" فرمایا گیا ہے نہ کہ سیدنا حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو۔ مودودی صاحب خواہ مخواہ اس فسق کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ ان مقدس تابع صحابی رسول کو اس آیت کا مصداق بنا کر ان پر کذب و فسق کی تہمت لگا رہے ہیں۔ ورنہ اس معاملہ میں ان کا قصور ہی

کیا تھا؟ انہوں نے جو خبر سنی وہ بارگاہ رسالت میں پہنچائی۔ ان کا زیادہ سے زیادہ قصور یہ تھا کہ انہوں نے ایک فاسق کی خبر کا اعتبار کر لیا۔ یہ نہ کوئی فسق ہے نہ معصیت۔ خدارا کوئی بتائے یہ غلطی کس دلیل سے۔ تقویٰ، دینداری اور دیانت داری کے خلاف ہے اور دنیا میں کون منصف مزاج اس کی بناء پر کسی کو مجروح قرار دے گا؟

خود قرآن مجید کی آیت مذکورہ کو پڑھئے تو اس کا صاف اشارہ اسی حقیقت حال کی طرف معلوم ہوگا اسی روایت میں ہے کہ جب حضرت ولیدؓ نے آنحضورؐ کو یہ خبر دی تو۔

فغضب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا اور آپ نے
وبعث البعث الی الحارث رضی اللہ عنہ	حضرت حارثؓ کی طرف ایک لشکر بھیجا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خبر سے متاثر خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے تھے اور آپ ہی نے بنی المصطلق کے خلاف اقدام کا ارادہ بھی فرمایا تھا۔ اب اگر مودودی صاحب کے زعم باطل کے مطابق آیت میں "نبا" (خبر) سے مراد وہ خبر ہوتی جو حضرت ولیدؓ نے دی تھی اور فاسق سے مراد معاذ اللہ وہی ہوتے تو صحابہ کے بجائے آیت میں خطاب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا اور یا ایہا الذین آمنوا الخ کے بجائے یا ایہا النبی ان جاءک فاسق بنباء" قسم کے الفاظ ہوتے لیکن خطاب ہے صحابہ کرام کو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی صحابی نے کسی فاسق کی خبر پر اعتبار کر لیا ہے اس پر تنبیہ فرمایا جا رہا ہے۔ روایت پر نظر کرتے ہوئے یہ معنی اسی وقت مستقیم ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ حضرت ولیدؓ نے کسی فاسق کی خبر پر اعتماد کر لیا تھا خود حضرت ولیدؓ کو اس کا مصداق سمجھنا یہ بتاتا ہے کہ مودودی صاحب نہ قرآن مجید کی آیت کو سمجھے نہ اس روایت کو۔

موصوف کی غلط فہمی کا ثبوت مزید یہ ہے کہ اسی ابن کثیر میں اسی مقام پر یہ بھی روایت

طبری سے بھی منقول ہوئی ہے، اس میں مذکور ہے۔

وانہ لما حدث الولید انہم خرجوا یتلقونہ رجع الولید۔	اور جب حضرت ولیدؓ سے بیان کیا گیا کہ وہ (بنی المصطلق) ان سے ملنے کے لیے نکلے ہیں تو وہ واپس ہو گئے۔

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے نکلنے کی خبر کسی نے انہیں دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ اطلاع صحیح صورت میں ان تک پہنچتی اور مخبر یہ بیان کرتا کہ وہ لوگ ان کے اکرام اور استقبال کے لئے نکلے ہیں تو وہ خائف کیوں ہوتے؟ اور واپس کیوں ہو جاتے؟ اس سے صاف ثابت ہے کہ کسی منافق نے دراندازی کی اور حضرت ولیدؓ کو غلط خبر دیکر واپس کر دیا۔ اہل اسلام کے آپس میں فساد ڈلوانا چاہا۔ حضرت ولید کو دھوکہ ہوا اور ایسے موقع پر دھوکہ کھا جانا بڑے بڑے عقلاء سے بھی بعید از قیاس نہیں ہے لیکن اسے دینداری و تقویٰ اور دیانت داری کے خلاف تو کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔

مفسر شہیر علامہ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین نے جو یہ فرمایا ہے:۔

نزلت فی ولیدؓ بن عقبہ بن ابی معیط۔	یہ آیت حضرت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ حضرت ولید پر ایک واقعہ گذرا جس میں انہوں نے ایک "فاسق" کی خبر پر اعتماد کر لیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں انہیں ان کی غلطی پر متنبہ فرمایا گیا ہے اور آئندہ کے لئے انہیں اور دیگر مسلمانوں کو قبول خبر کے بارے میں ایک اصول کی تعلیم دی گئی ہے۔ ان مفسرین کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس آیت میں "فاسق" کے مصداق خود آں رضی اللہ عنہ ہیں یا معاذ اللہ خبر سے مراد خود ان کی دی ہوئی خبر ہے۔

مودودی صاحب سے سوا اس کے کیا عرض کریں کہ۔

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

روایت سے حضرت ولید مجروح نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کی شرح سے خود جناب کی سخن فہمی مجروح ہو جاتی ہے۔

بحث تو ختم ہو گئی لیکن اس سلسلہ میں اتنی بات اور سنتے چلئے کہ اگر واقعی حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ معاذ اللہ ایسے ہی ناقابل اعتبار تھے جیسا کہ مودودی صاحب انہیں ظاہر کر رہے ہیں تو آخر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک صوبہ کا گورنر کیوں بنایا جیسا کہ طبری و تہذیب التہذیب میں مذکور ہے؟ نیز یہ کہ انہیں منصب عطا کرنے میں غلطی کا الزام صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لگانا کہاں تک درست ہے؟ صحیح یہ ہے ان سب حضرات کا انہیں مناصب عطا کرنا اس بات کی دلیل شافی ہے کہ حضرت ولید پر مودودی صاحب کا الزام بالکل غلط ہے اور روایت اگر ثابت ہو تو اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

مولانا مودودی صاحب نے خود بھی صفحہ ۱۱۱ اور ۱۱۲ پر تذکرہ کیا ہے کہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو منصب پر مقرر فرمایا چنانچہ وہ خلافت عثمانی کے آغاز میں الجزیرہ کے عرب علاقے کے عامل تھے، اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

> ۲۵ھ میں اس چھوٹے سے منصب سے اٹھا کر حضرت عثمان ؓ نے ان کو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی جگہ کوفے جیسے بڑے اور اہم صوبے کا گورنر بنا دیا وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا "اور پڑھاؤں؟" .... چنانچہ صحابہ کے مجمع عام میں ولید پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے

اپنے آزاد کردہ غلام حمران نے گواہی دی کہ ولید نے شراب پی تھی ایک دوسرے گواہ صعب بن جثامہ (یا جثامہ ابن صعب) نے شہادت دی کہ ولید نے ان کے سامنے شراب کی قے کی تھی (ان کے علاوہ چار اور گواہ ابو زینب ابو مورع جندب بن زبیر الازدی اور سعد بن مالک الاشعری بھی ابن حجر کے بیان کے مطابق پیش ہوئے تھے، اور انہوں نے بھی جرم کی تصدیق کی تھی) تب حضرت عثمانؓ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ ولید پر حد قائم کریں۔

(بحوالہ استیعاب) صفحہ ۱۱۲ و ۱۱۳

عربی کی مشہور مثل ہے بغضك الشيئ يعمى ويصم (کسی چیز کی عداوت آدمی کو بعض اوقات اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے) مودودی صاحب کو صحابہ کرام خصوصاً بنو امیہ سے جو عداوت ہے اس کی وجہ سے انہوں نے یہاں بہ جگہ اپنے محبوب مورخ طبری کی طرف سے بھی آنکھیں پھیر لی ہیں جالانکہ اس نے سنہ ۳۰ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ کوفہ سے جرائم پیشہ آدمیوں جن کے بیٹوں کو حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے کسی جرم پر سزا دی تھی ان کا انتقام لینے کے لئے یہ سازش کی کہ آں ممدوح پر شراب نوشی کا الزام لگایا جائے چنانچہ ایک نے ان کی مہر چرالی اور حضرت عثمان سے شکایت کی کہ یہ شراب پینے میں ہم نے نشہ کی حالت میں ان کی مہر حاصل کرلی اور انہیں شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔

طبری کی جو روایت صحابہ کرام کے خلاف ہوتی ہے وہ تو مودودی صاحب کو بہت مرغوب ہوتی ہے لیکن اس روایت سے ایک صحابی پر ایک بہتان و افترا کی قلعی کھل رہی ہے اور شراب کے قصے کا من گھڑت ہونا ثابت ہو رہا ہے، اس لئے موصوف نے اسے بالکل نظر انداز فرما دیا۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت ولید پر شراب نوشی اور نشہ کی حالت میں نماز پڑھا دینے کا الزام بالکل جھوٹا تھا جو سبائیان کوفہ نے گھڑا تھا اور اس کے ثبوت کے لئے جھوٹے گواہ تیار

کرتے تھے۔

کوفہ کی سبائی پارٹی کی یہ حرکت کوئی نئی نہیں تھی اس قسم کی فتنہ پردازیاں کرنا اس کا شیوہ اور اس کے قیام کا اصل مقصد تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد معدلت مہد میں بھی انہوں نے حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اوپر چار الزام لگا کر بارگاہ خلافت میں ان کی شکایت کی اور انہیں معزول کرانے کی درخواست کی تھی وہ الزام یہ تھے (۱) یہ جہاد میں خود نہیں نکلتے (۲) تقسیم میں انصاف نہیں کرتے (۳) مقدمات کا فیصلہ کرنے سے معذور ہیں (۴) نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے ہیں۔

بخاری شریف میں یہ واقعہ مذکور ہے اور اسی میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سب باتوں کی تحقیق کے لئے کمیشن مقرر کیا، جس سے معلوم ہوا کہ سب شکایتیں غلط ہیں لیکن باوجود اس کے انہوں نے حضرت سعدؓ کو معزول فرما دیا اور انہیں بھی اطمینان دلا دیا کہ میرے نزدیک آپ کے متعلق یہ سب شکایتیں غلط ہیں لیکن محض انتظامی مصلحت سے آپ کو معزول کر رہا ہوں۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لئے بھی کوفہ کی یہ انقلابی پارٹی ہمیشہ دردسر بنی رہی۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو اسی نے بلایا اور بلا کر انہیں مع ان کے گھر والوں کے شہید کر دیا اور الزام قتل سلطان یزید کے سر مڑھ دیا، اور ایسا پروپیگنڈا کیا کہ آج تک امیر یزیدؒ کا قاتل حسینؓ ہونا مشہور ہے۔ حالانکہ وہ اس الزام سے بالکل بری ہیں۔ ایسے مکار و فتنہ پرداز لوگوں سے خصوصاً جبکہ وہ ایک سیاسی انقلاب کے لئے سازباز میں مصروف ہوں حضرت ولیدؓ پر شراب نوشی کا الزام لگا دینا کیا بعید از قیاس ہے؟ اور سیاسی انقلاب کو سامنے رکھنے والی جماعت کی اس قسم کی باتوں کا اعتبار وہی شخص کر سکتا ہے جو حق و انصاف کی طرف سے بالکل منہ پھیر لے۔ البدایہ والنہایہ میں بھی حضرت ولیدؓ کی معزولی کا سبب بیان کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے مگر انہیں اس قصے کی صحت پر اعتبار نہیں ہے

چنانچہ لکھتے ہیں۔

ثم انہ تصدی لہ جماعۃ یقال کان منہم و بینہ شنان فشکوہ الی عثمان و شہد بعضہم علیہ انہ شرب الخمر و شہد الآخر انہ رآہ یتقیاھا

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۵۵ واقعات ۳۰ھ)

پھر ایک جماعت اس معاملے میں ان کے پیچھے پڑ گئی بیان کیا گیا ہے کہ اس جماعت اور حضرت ولیدؓ کے درمیان عداوت تھی۔ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ سے ان کی شکایت کی۔ ان میں سے بعض نے یہ گواہی دی کہ انہوں نے شراب پی تھی اور دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے انہیں شراب کی قے کرتے دیکھا۔

گواہوں کی عداوت و مخالفت کا احتمال قوی بھی ثبوت الزام سے مانع ہوتا ہے، اور ایسے گواہوں کی شہادت مردود قرار دی جاتی ہے چہ جائیکہ طبری کا ایسا مورخ جس میں خاصا تشیع ہے اور جو حتی الامکان صحابہ کی تنقیص کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ــــ ان گواہوں کی حضرت ولیدؓ کے ساتھ عداوت و دشمنی کو بیان کر کے الزام کی صحت کو ناقابل یقین قرار دے اور البدایہ کے مصنف باوجودیکہ صحابہ کے متعلق کما حقہٗ احتیاط نہیں کرتے ہیں اس دشمنی کا تذکرہ کریں یہ چیزیں ہر منصف مزاج کے نزدیک الزام کو محروم ثبوت اور غلط قرار دیتی ہیں۔

قصہ کا تعلق تاریخ سے ہے اس لئے روایت کی کسوٹی پر بھی اسے پرکھنا لازم ہے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے اس قصہ پر نظر کرتے ہیں تو یہ بالکل من گھڑت اور سراپا بہتان واختراع نظر آتا ہے۔

پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ولیدؓ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں مدت دراز تک مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ لیکن کبھی ان پر یہ الزام نہیں لگایا گیا۔ آخر کوفہ ہی پہنچ کر کیوں انہوں نے اس حرکت کا ارتکاب کیا؟ اس سے قطع نظر کہ وہ صحابی رسول تھے ایک عام مسلمان ہونے کے اعتبار سے بھی یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے

کہ اتنی عمر پاکبازی و تقویٰ کے ساتھ بسر کرنے کے بعد یکایک وہ شراب پینے لگیں۔ جو چیز
ظاہر کے خلاف ہو اسے اتنی آسانی کے ساتھ قبول کر لینا مودودی صاحب ہی کے ایسے حضرات
کا کام ہے جو صحابہ کرام کی عداوت کی وجہ سے ان کے خلاف ہر الزام کو قبول کر لیتے ہیں حالانکہ
اگر آج وہ شخص اسی فعل کی شہادت خود ان کے خلاف دیدیں تو ان کی جماعت کا کوئی فرد بھی اسے
قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا اور اسے مخالفین کی سازش قرار دیگا۔

دوسرے یہ کہ موجودہ زمانے میں دیگر صنعتوں کی طرح شراب کی صنعت نے بھی ترقی کی
ہے اور اس کی بدبو کو بڑی حد تک کم کر دیا گیا ہے، باوجود اس کے اگر کوئی شخص شراب پی کر کہیں
بیٹھ جائے تو کم از کم دو تین گز تک فضا کا تعفن دوسروں کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا
ہے۔ اُس زمانے میں تو اس کی بدبو اور بھی زائد ہوتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ نماز سے پہلے یا دوران
نماز کسی کو اس کا احساس کیوں نہ ہوا کہ یہ شراب پئے ہوئے ہیں؟ اور اگر احساس ہو گیا تھا
تو ان کے پیچھے نماز کیوں پڑھی؟ اور پہلے ہی کیوں نہ کہا؟ اگر کہا ہوتا تو یقیناً روایت میں منقول
ہوتا۔ نیز چار رکعت تک نوبت ہی کیوں پہنچی؟

تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مبینہ عیب کو پوشیدہ رکھنے کا انہوں نے اس قدر اہتمام
فرمایا کہ یہ سہا برس تک ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن یکایک وہ اس قدر بے احتیاط کیسے ہو گئے
کہ مبینہ گواہوں کے سامنے شراب پی لی اور ان کے سامنے قے بھی کر دی؟ حالانکہ اتنے بڑے
عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے وہ اخفاء کا پورا اہتمام کر سکتے تھے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ شراب کے عادی تھے یا اتفاقی طور پر ایک دن پی لی تھی؟ اگر عادی
تھے تو عادتاً پینے والوں کو عام طور پر اتنا نشہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ دو رکعت کی چار رکعت پڑھا دیں
اور پوچھیں کہ اور پڑھا دوں، جو لوگ عادی نہیں ہوتے ہیں ان پر اتنا غلبہ ہو سکتا ہے مگر بسقدر ہوش

ہو کر ان کا گھر سے مسجد تک پہنچنا بعید از قیاس ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ عام طور پر جب آدمی شراب پیکر کھلی ہوئی فضا میں پہنچتا ہے اور اس کے ٹھنڈی ہوا لگتی ہے تو اس پر ایک قسم کی نیند اور غفلت طاری ہونے لگتی ہے۔

پانچواں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ دو رکعت کے بعد کھڑے ہو گئے تھے تو کسی نے لقمہ کیوں نہ دیا؟ کیا سب کے سب نماز کے مسائل سے اس درجہ ناواقف تھے کہ فجر کی رکعتوں کی تعداد بھی نہیں جانتے تھے؟ یا یہ بھی نہ جانتے تھے کہ امام کو سہو ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے؟ یہ امور بھی اس الزام کی صحت کو چیلنج کر رہے ہیں۔

استیعاب کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ بالکل غیر معتبر کتاب ہے جس میں بعض جواہر پاروں کے ساتھ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بھی ہیں۔ اس لئے صاحب استیعاب کی رائے اس بارے میں بالکل بے وزن ہے اور یاوہ گوئی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے ان کی کجروی تو ملاحظہ ہو کہ اسے وہ ثقات کی روایت قرار دے رہے ہیں مگر ان ثقات کا نام و نشان نہیں ذکر کرتے۔ روایت کی انتہا کوفہ کے ان لوگوں پر ہوتی ہے جنہوں نے حضرت عثمانؓ سے شکایت کی تھی وہ حافظ ابن عبدالبر کے نزدیک ثقہ اور اہل حدیث و اخبار ہیں! یا للعجب ان کے اس غلط قول سے ان کوفیوں کی ثقاہت تو ثابت نہیں ہوئی البتہ خود ان کی عدالت مجروح ہو گئی۔

مودودی صاحب نے بخاری کا حوالہ ناحق دیا۔ اس میں تو صرف اس کا تذکرہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ولیدؓ پر حد جاری کی۔ معاملہ کی صدق و کذب پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

موصوف نے بخاری، مسلم، فتح الباری، عمدۃ القاری وغیرہ کے حوالے دیکر ان کی بعض عبارتوں کے ترجمے نقل کر کے غلط بحث کیا ہے اور قاری کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

یہاں درحقیقت دو مسئلے ہیں۔

ایک یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو دو گواہوں کی شہادت کی بنا پر سزا دی یا نہیں؟ یا دوسرے الفاظ میں عدالت میں ان کا جرم ثابت ہو گیا یا نہیں؟ اس مسئلہ میں ہمیں مودودی صاحب سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بیشک حضرت عثمانؓ نے حضرت ولیدؓ پر شرب خمر کی حد جاری کی اور قانونی طور پر عدالتی طریق کار کے مطابق ان پر جرم ثابت ہو گیا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے ان کا جرم ثابت تھا یا نہیں؟ گواہ واقع کے لحاظ سے سچے تھے یا سازش کر کے انہوں نے جھوٹی گواہی دی تھی؟ اس میں ہمیں مودودی صاحب سے اختلاف ہے اور جس نے بھی حضرت ولیدؓ کی براءت ظاہر کی ہے اس کی مراد یہی ہے کہ نفس الامر میں وہ اس جرم کے مرتکب نہیں ہوئے۔ کوفہ کے بدمعاشوں اور مفسدوں نے ان کے خلاف سازش کی، جھوٹے گواہ تیار کئے اور ان سے حضرت عثمانؓ کی عدالت میں جھوٹی گواہی دلوائی۔ یہ ہے ہمارا موقف۔

علامہ بدرالدین عینی، علامہ ابن حجر عسقلانی، امام نووی وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق پہلے مسئلہ سے ہے۔ دوسرے مسئلہ کو انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ اس لئے ان کے اقوال ذرہ برابر بھی ہمارے موقف پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں نہ ہمارے قول کے مخالف ہیں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی معاملہ کے عدالتی ثبوت سے اس کا نفس الامر اور واقعے کے لحاظ سے ثبوت لازم نہیں آتا۔

مودودی صاحب نے مغالطہ یہ دیا ہے کہ دونوں مسئلوں کو مخلوط کر دیا اور مندرجہ بالا بزرگوں کے اقوال نقل کر کے قاری کو یہ دھوکہ دینا چاہا ہے کہ گویا یہ حضرات اس واقعہ کو نفس الامر کے اعتبار سے

تسلیم کرتے تھے حالانکہ یہ ان بزرگوں پر افترا خالص ہے۔ انہوں نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ اس جرم کو نفس الامر میں بھی ثابت تسلیم کرتے تھے۔ جو مسائل انہوں نے مستنبط کئے ہیں وہ حضرت عثمانؓ کے فیصلہ سے مستنبط کئے ہیں نہ کہ واقعے کے لحاظ سے، الزام کو صحیح تسلیم کرکے جناب مصنف نے ان کے اقوال نقل کرکے بے فائدہ کتاب کے صفحات میں اضافہ کر دیا۔ ان کے اقوال ان کے لئے ذرہ برابر بھی مفید نہیں ہیں البتہ اس طرح ناواقفوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرکے انہوں نے اپنے وقار کو ضرور مجروح کر لیا۔ اسی طرح کا مغالطہ دینے کی ایک کوشش اور ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں۔

"اب اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ سب گواہ غیر معتبر تھے جنہوں نے ولید کے خلاف گواہی دی تھی تو گویا وہ حضرت عثمانؓ ہی پر نہیں بلکہ صحابہ کے مجمع عام پر یہ الزام عائد کرتا ہے کہ انہوں نے ناقابل اعتبار شہادتوں کی بناء پر ایک مسلمان کو سزا دے ڈالی۔" ص ۱۱۴

تعجب ہے کہ مودودی صاحب کو قانون اسلامی کے اس مشہور عام اصول کی بھی خبر نہیں کہ قاضی مقدمہ کی ظاہری روئداد کی بناء پر ہی فیصلہ کرتا ہے اپنے علم کی بناء پر نہیں کرتا۔ حضرت عثمانؓ نے ظاہری شہادتوں کی بناء پر فیصلہ فرمایا اور دیگر صحابہؓ نے اس کی توثیق کی۔ حقیقت کے لحاظ سے گواہ جھوٹے تھے لیکن کسی قانونی طرز وطریقے سے ان کا جھوٹ ظاہر نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے حضرت ولید کو سزا دی تو ان پر کیا الزام عائد ہوتا ہے؟ انہیں یہی کرنا چاہئے تھا اور یہی علماء ملت کا طریقہ ہے رکتب حدیث مسلم و بخاری وغیرہ میں خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ میں ظاہری شہادتوں کی بناء پر فیصلہ کرتا ہوں۔ اگر واقعے کے لحاظ سے وہ فیصلہ صحیح نہیں ہے تو اس کا بار عند اللہ اسی شخص پر ہوگا جس نے اپنی قوت جدال اور فریب کاری سے ناحق کو حق ظاہر کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ کو ص۹۶ پر خود مودودی صاحب ذکر فرماتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ موصوف نے کوفہ میں اپنی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھی۔ قاضی کے یہاں دعویٰ کیا لیکن قاضی صاحب نے حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ کیا اس لئے کہ وہ شہادت نہیں پیش کر سکے تھے۔ ملاحظہ ہو کہ کیا قاضی کو وہ حضرت علیؓ کی صداقت اور یہودی کے کذاب ہونے سے واقف نہ تھے؟ مگر فیصلہ مقدمہ کی ظاہری روئداد کے اعتبار سے کرنے پر مجبور ہوئے۔ کتب فقہیہ میں اس قاعدے کی پوری تشریح ملتی ہے اور اس قسم کے واقعات بھی بکثرت ملتے ہیں۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے مودودی صاحب کا مندرجہ بالا استدلال کس قدر لچر اور غیر علمی معلوم ہوتا ہے۔ اس فیصلہ سے تو یہ بھی لازم نہیں آتا کہ حضرت عثمانؓ یا دوسرے صحابہ حضرت ولیدؓ کو واقعی مجرم سمجھتے ہوں چہ جائیکہ نفس الامر کے لحاظ سے معاذ اللہ ان کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ گواہوں کے غیر معتبر اور کاذب ہونے کا انہیں اس وقت تک علم ہی نہ ہوا ہو۔ بعد کو یہ راز کھلا ہو کہ یہ سازش تھی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حضرات بھی گواہوں کو غیر معتبر سمجھتے ہوں لیکن قانونی اعتبار سے کوئی ایسا سقم ظاہر ہوا ہو جس سے ان کی شہادت رد کر دی جاتی۔ ایسی صورت میں وہ انہیں غیر معتبر سمجھتے ہوئے بھی ان کی شہادت قبول کرتے اور اس کی بناء پر فیصلہ کرنے کے لئے مجبور تھے۔ لیکن ان میں سے کسی صورت میں بھی نفس الامر اور حقیقت واقعہ کے لحاظ سے گواہوں کا سچا ہونا لازم نہیں آتا۔ اور نہ اس فیصلہ کی وجہ سے حضرت عثمانؓ یا دوسرے صحابہ پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ اور واقعات سے واقف اکابر صحابہ حضرت ولیدؓ کو اس الزام سے بالکل بری سمجھتے تھے لیکن قانون اسلامی سے مجبور تھے اسی لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت ولید کو تلقین صبر فرمائی تھی جیسا کہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے [۱]

---

[۱] طبری ج ۴ صفحہ ۲۷۶ حوادث ۳۰ھ

رہا یہ سوال کہ حضرت ولید کو چھوٹے عہدے سے بڑے عہدے پر کیوں ترقی دے دی گئی؟ عجیب سوال ہے، دنیا جانتی ہے کہ ہر نظام میں حسن کارکردگی اور قابلیت کی بنا پر عہدیداروں کو ترقی دی جاتی ہے، اسی بنا پر انہوں نے بھی ترقی دی۔ اس میں کون سی عجیب یا قابل اعتراض بات ہے؟ حضرت ولید اپنی اعلیٰ قابلیت و صلاحیت کی وجہ سے بلاشبہ اس کے مستحق تھے کہ کوئی اعلیٰ ذمہ داری ان کے سپرد کی جاتی، شرق اردن کی مہم میں ان کی حربی قابلیت ظاہر ہو چکی تھی، مالیات کے انتظام کے بارے میں ان کا تجربہ بہت سے اکابر صحابہ سے زائد تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ نے ان اعلیٰ صلاحیتوں سے ملت کو فائدہ پہنچانا چاہا اور انہیں ترقی دے کر ایک صوبہ کا گورنر بنا دیا تو اس میں قابل اعتراض بات کیا ہے؟ گزشتہ صفحات میں ہم اس مسئلہ پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اصولی طور پر اس معاملہ میں حضرت ذی النورینؓ پر کوئی بھی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں اتنی بات اور عرض کردوں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی معزولی کا سبب طبری نے یہ لکھا ہے کہ انہوں نے بیت المال سے کچھ رقم قرض لی تھی۔ افسر بیت المال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے کچھ مدت کے بعد انہوں نے حضرت سعد سے اس کی ادائیگی کا تقاضہ کیا، ان کے پاس اس وقت روپیہ نہ تھا اس لئے وہ کچھ مزید مہلت چاہتے تھے جس کے لئے وہ تیار نہیں ہوئے۔ یہ بات حضرت سعد کو ناگوار ہوئی، اس پر دونوں کے درمیان اختلاف ہوا یہ اختلاف بالکل معمولی تھا جس کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن

فاستعان عبد اللہ باناس من الناس
علی استخراج المال واستعان سعد
باناس من الناس علی استنظاره
فافترقوا وبعضهم یلوم بعضاً یلوم

حضرت عبداللہ بن مسعود نے کچھ لوگوں سے یہ
اعانت چاہی کہ وہ حضرت سعد سے قرض کی
ادائیگی کرا دیں اور حضرت سعد نے کچھ لوگوں
سے مہلت کی درخواست کی کہ وہ حضرت عبداللہ

هٰؤلاء سعد او یلوم هٰؤلاء عبد اللہ

سے انہیں ادائیگی کے لئے مزید مہلت دلادیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں دو پارٹیاں ہوگئیں ایک حضرت عبد اللہؓ کی مذمت کرتی تھی اور دوسری حضرت سعدؓ کی۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ایک بہت معمولی اختلاف تھا جو بھائیوں بھائیوں میں بھی کثیر الوقوع ہے اور دونوں میں سے کسی کے لئے بھی کوئی عیب نہیں۔ حضرت عبد اللہ بیت المال کے امین ہونے کی وجہ سے تعجیل کر رہے تھے۔ حضرت سعد ناداری کی مجبوری کی وجہ سے مہلت مانگ رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی کو معاذ اللہ دوسرے کی نیت پر شبہ نہ تھا۔ دوسروں سے استعانت کا مقصد بھی کوئی پارٹی بندی کرنا یا جھگڑا فساد کرنا تو تھا نہیں۔ محض سفارش کرانا اور ترد رفع کرانا مقصود ہوگا جو کسی طرح قابل گرفت نہیں۔ مگر کوفہ کی زمین کچھ فتنہ و فساد کے لئے اس قدر زرخیز تھی اس معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر پارٹی بندی ہوگئی اور تبرا شروع ہوگیا جس میں ہر سلیم الحس کو سبائیت کی بدبو محسوس ہوگی یعنی صورت حال یہ ہوگئی کہ اس اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے لئے کوفہ کی مفسدہ پرداز اور دشمن صحابہ جماعت کے دو حصے ہوگئے جو غالباً کسی متفقہ اسکیم اور پلان کے ماتحت دو مقابل گروہوں میں منقسم ہوگئے ہوں گے اور جن کا پہلا قدم تو ان دونوں صحابیوں کو بدنام اور مطعون کرنا اور ان کے درمیان خلیج افتراق کو وسیع کرنے کی کوشش کرنا تھا۔ دوسرے قدم کے لئے بھی ممکن ہے کوئی پلان سوچا ہو لیکن سیدنا حضرت عثمانؓ کی برمحل اور قابل تعریف تدبیر کی وجہ سے ان کا خاکہ خاک میں مل گیا یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ مفسد سبائی گروہ حضرت سعدؓ کے سخت خلاف تھا اور دربار فاروقی میں ان کی شکایت کر چکا تھا جسے ہم بخاری شریف سے صفحات سابقہ میں نقل کر چکے ہیں۔

ایسے موقع پر حضرت ولیدؓ کو وہاں کا گورنر مقرر کرنا بہترین تدبیر تھی جو سیدنا عثمان ذی النورینؓ

کے اعلیٰ تدبر اور ان کی دانشمندی کو ظاہر کر رہی ہے۔

حضرت سعدؓ کو معزول کرنے میں وہی مصلحت تھی جو سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے پیش نظر تھی یعنی مفسدوں کو نرم کر دینا تاکہ ان کا شر نہ بڑھ سکے[۱]۔

حضرت ولیدؓ حضرت عثمانؓ کے قریبی رشتہ دار تھے اس لئے اسی بات کی توقع تھی یہ مفسدان کے خلاف شورش کرنے کی جرات آسانی کے ساتھ نہ کریں گے اور ان کے ذاتی رعب و دبدبہ کے علاوہ خلیفہ امت سے ان کی قرابت کا رعب بھی مفسدوں کے لئے بہت شکن ثابت ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اس عاقلانہ تدبیر کی وجہ سے کوفہ کے ان بدمعاشوں کا فساد انگیزی کا خاکہ اس وقت تو خاک میں مل گیا اور مذکورہ بالا دونوں پارٹیاں ایسی دب گئیں کہ پھر حضرت ولیدؓ کے زمانۂ حکومت میں نہ ابھر سکیں۔

حضرت عبداللہؓ اور حضرت سعدؓ برابر کا درجہ رکھتے تھے، اس لئے ان کے درمیان اختلاف کا احتمال زیادہ ہو سکتا تھا۔ بخلاف اس کے حضرت ولیدؓ حضرت عبداللہؓ سے عمر و مرتبہ میں چھوٹے تھے اس لئے ان کی طرف سے نرم و گرم زیادہ برداشت کر سکتے تھے۔ نیز حضرت عبداللہؓ سے یہی توقع تھی کہ وہ انہیں اپنا چھوٹا سمجھ کر ان پر شفقت کی نظر فرمائیں گے، دوسری طرف خلیفۂ وقت ہی نہیں بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قریبی رشتہ داری کی وجہ سے باوجود چھوٹا ہونے کے ان کے وقار کا بھی لحاظ کریں گے اس طرح باہمی تعاون زیادہ حاصل ہوگا چنانچہ ویسا ہی ہوا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے ادائے قرض کا اتنا شدید تقاضا کیوں فرمایا؟

---

[۱] سبائی مفسدوں کی فساد انگیز تحریک خفیہ طور پر دور فاروقی ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن حضرت عمرؓ کی پالیسی یہ تھی کہ ان کے ساتھ نرمی برت کر ان کی اصلاح کی جائے حضرت عثمانؓ نے بھی یہی پالیسی اختیار فرمائی۔ حضرت ولیدؓ اس پالیسی کو عملی شکل دینے کے لئے بہت موزوں ثابت ہوئے۔

حالانکہ معسر کو مہلت دینا از روئے قرآن مجید مستحب ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً بیت المال کو آمدنی کی کمی کی وجہ سے روپے کی شدید حاجت درپیش ہوگی اور نظام محاصل میں کوئی ایسی کمزوری آگئی ہوگی جس سے بیت المال کی آمدنی کم ہوگئی ہوگی۔ حضرت ولیدؓ برسوں سے مالیات کا کام کر رہے تھے اور اس کام میں بہت تجربہ کار اور ماہر اور بہت سے اکابر صحابہ پر فائق تھے۔ اس اعتبار سے بھی ان کا اس عہدے پر تقرر عین قرین مصلحت و حکمت اور حضرت عثمانؓ کی مردم شناسی، موقع شناسی اور حسن تدبیر کا ایک قابل تعریف نمونہ تھا۔

اس منصب پر مقرر ہونے کے بعد کوفہ کے حالات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حسن انتخاب کی خود شہادت دے رہے ہیں، چنانچہ طبری لکھتے ہیں:

فقدم الکوفة وکان احب الناس فی الناس وارفقهم بهم فکان بذلک خمس سنین ولیس علی داره باب۔

(طبری جلد ۵، احوال سنہ ۲۵ھ)

"وہ (حضرت ولیدؓ) کوفہ (گورنر ہو کر) تشریف لائے اور وہاں کے عوام میں سب سے زیادہ محبوب و مقبول ہو گئے اور ہر ایک کے لئے وہ سب سے زیادہ نرم تھے۔ وہ پانچ سال تک وہاں اسی طرح بحیثیت گورنر رہے کہ ان کے مکان میں دروازہ بھی نہ تھا"

مفسدوں کی جو پارٹیاں کوفہ کے دونوں حاکموں کے معمولی اختلاف کو بہانہ بنا کر مزید فساد انگیزیوں کے نقشے بنا رہی تھیں حضرت ولیدؓ کے پہنچتے ہی غائب ہو گئیں اور موصوف مقبول و محبوب انام ہو گئے۔ حکومت کے مالی حالات بھی درست ہو گئے یہ واقعات اعلان کر رہے ہیں کہ وہ اس عہدے کے مستحق تھے اور اس موقع پر انہیں کا تقرر ہونا چاہئے تھا لیکن

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است

سبائیوں کی تقلید میں آج تیرہ سو برس کے بعد مودودی صاحب ان کے تقرر کی وجہ سے خلیفہ رسول اللہ سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وارضاہ پر معترض ہیں فیا للعجب۔

حضرت ولیدؓ کا مختصر تعارف

حضرت ولید بن عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہ پر مودودی صاحب کے اعتراضات توہماً دمنثوراً کیے جا چکے اب ہم موصوف کا مختصر تعارف کرنا چاہتے ہیں تاکہ قارئین کو ان کی عظمت کا کچھ اندازہ ہوسکے۔

ان کا شمار صغار صحابہ میں ہے۔ لڑکپن میں فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت وتربیت سے مشرف ہوئے اور آنحضور کی دعاؤں کی دولت بے بہا حاصل کی آنحضور کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تربیت میں رہے جس کی وجہ سے نسبت صدیقی کا رنگ ان میں جھلکتا تھا۔ سادہ مزاجی، تبلیغ دین سے شغف، رحمدلی، تقویٰ، دینی غیرت وحمیت وغیرہ اوصاف حمیدہ اور صفات عالیہ میں حضرت صدیق اکبرؓ کا نمونہ معلوم ہوتے تھے، جن کی نگاہ جوہر شناس نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اندازہ ان کی نوعمری ہی میں کر لیا تھا اور مجلس میں انہیں اکابر صحابہ کے ساتھ بٹھاتے تھے۔ ممدوح نے پہلے انہیں فوج کے خفیہ احکام کی مکاتبت کا اہم عہدہ تفویض فرمایا پھر حضرت ابن غنمؓ سالار لشکر کا مددگار بنا کر میدان جنگ میں بھیجا ۱۳ھ میں محصل صدقات کا عہدہ دیا اور اس کے بعد مشرق اردن کی طرف سپہ سالار بن کر گئے۔ ۱۵ھ میں سیدنا فاروق اعظمؓ نے انہیں الجزیرہ کا عامل بنا دیا وہاں سے حضرت عثمانؓ نے انہیں کوفہ کی گورنری پر منتقل کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ

مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

" اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو چکے تھے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر جن لوگوں کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ وہ اگر غلافِ
کعبہ کے پردوں سے بھی لپٹے ہوئے ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے یہ ان میں سے ایک
تھے۔ حضرت عثمان انہیں لیکر اچانک حضور کے سامنے پہنچ گئے اور آپ نے محض ان
کے پاس خاطر سے انہیں معاف فرما دیا تھا۔ ملّٰا

گویا آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تو انہیں معاف فرما دیا تھا۔ مگر مودودی صاحب انہیں معاف کرنے
کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مزید گذارش یہ ہے کہ زمانہ کفر و جاہلیت کے افعال کا طعنہ دینا شریعت و اخلاق
کے کس اصول کے اعتبار سے جائز ہے؟ علمائے محققین نے حدیث سے مستنبط کر کے تحریر فرمایا ہے کہ ارتداد
حقیقی محال ہے۔ یعنی کوئی شخص صدق دل سے مسلمان ہو جائے تو وہ مرتد نہیں ہو سکتا۔ کسی کے مرتد ہو جانے
کے معنی یہ ہیں کہ پہلے ہی اس کے دل میں ایمان جاگزیں نہیں ہوا تھا اور سچے دل سے وہ مسلمان ہوا ہی نہ
تھا۔ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح پہلی مرتبہ محض ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مرتد
ہو کر چلے گئے۔ لیکن کچھ مدت تک غور و فکر کے بعد جب اسلام کی صداقت پورے طور پر واضح ہو گئی تو صدق
دل سے ایمان لائے اور آنحضور کی زیارت و صحبت سے مشرف ہو کر ولایت کے اعلیٰ ترین درجہ یعنی درجہ
صحابیت پر فائز ہوئے۔ ان کی بعد کی زندگی ان کے اخلاص اور کمال ایمان کی شاہد عادل ہے۔ اسلام
کے بعد گذشتہ کفر یا ارتداد کا طعن کرنا خود طعن کرنے والے کو آخرت میں مطعون کر دیتا ہے۔ نبی کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کا جو غصہ ان پر تھا وہ ان کی ذات اور شخصیت پر نہ تھا بلکہ ان کے وصف کفر و ارتداد
پر تھا۔ جب اس ذریعہ سے وہ پاک ہو گئے تو وہ غصہ بھی محبت و رحمت میں تبدیل ہو گیا۔ آنحضور عالم
الغیب تو نہ تھے جو یہ جان لیتے کہ تقدیر الٰہی میں ان کی سعادت مقدر ہو چکی ہے ان کے ارتداد پر آپ نے
ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس لئے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے لیکن جب یہ مسلمان ہو گئے تو معلوم ہو گیا کہ
اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سعادت مقرر فرمائی تھی اور آنحضور کی شفقت و رحمت ان پر ایسی ہی مبذول

رہی جیسی دوسرے صحابہ پر میلہ دل رہی تھی۔ کیا مودودی صاحب بتا سکتے ہیں کہ دوبارہ اسلام لانے کے بعد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا آنحضور کے صحابہ کرام میں سے کسی نے ان کے متعلق نفاق کا شبہ کیا ہو؟ یا آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے ناراضگی کا اظہار فرمایا ہو؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آپ کا اعتراض بالکل باطل اور غضب الہیٰ کا موجب ہے۔ یہ جملہ کہ:

"آپ نے محض ان کے پاس خاطر سے انہیں معاف فرما دیا تھا"

بہت بے ادبانہ اور گستاخانہ ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اگر حضرت عثمانؓ کا پاس خاطر نہ ہوتا تو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم انہیں قتل کروا دیتے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وہ اس وقت ارتداد سے تائب اور صدق دل سے مسلمان ہو گئے تھے یا نہیں؟ اگر ہو گئے تھے تو کیا آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک مومن کو قتل کر دیتے؟ اور تائب ہونے والے کو توبہ سے روک دیتے (معاذ اللہ) کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بصورت دیگر اگر وہ صدق دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے اور آنحضور کو اس کا علم تھا تو کیا آپ نے حضرت عثمانؓ کی خاطر سے ایک شخص کے ارتداد کو گوارا فرما لیا؟ اور اس جرم عظیم کی سزا دینے سے پہلو تہی فرمائی؟ (العیاذ باللہ) کوئی مومن آنحضور کے متعلق اس قسم کا خیال بھی دل میں لانا گوارا نہیں کر سکتا اس قسم کے فاسد و کاسد افکار مودودی صاحب اور ان کے متبعین ہی کو مبارک ہوں۔ مقام عبرت ہے کہ عداوت صحابہ نے مودودی صاحب کو اس جگہ پہنچا دیا کہ وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر افترا کرنے لگے (العیاذ باللہ)[1]۔

---

[1] ان کی جماعت کے بعض لوگ سنن ابو داؤد کی ایک روایت بھی پیش کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ موصوف نے جب دوبارہ بیعت کی ہے کہ آنحضور نے صحابہ سے فرمایا کہ تم نے انہیں میرے پاس آنے سے پہلے ہی کیوں نہ قتل کر دیا۔ اس روایت کو بنائے اعتراض بنانا کم از کم درجہ کی کج فہمی ہے۔ بلا شبہ ارتداد کے جرم عظیم کی وجہ سے آنحضور ان سے بہت ناراض تھے۔ اور ناراض ہونا چاہیئے تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کا مختصر تعارف

حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ صاحب فہم و ذکا، مدبر اور منتظم شخص تھے صحابی ہیں اور ان صحابہ میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے بحری جہاد میں حصہ لیا۔ اس میں یہ ایک دستہ کے سردار تھے اور اس میں شریک ہونے والوں کو بطور پیشین گوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی۔ یہ حدیث ہم بخاری شریف سے پچھلے صفحات میں نقل کر آئے ہیں۔ سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ ان پر بہت اعتماد فرماتے تھے۔ اسی لئے سیدنا حضرت عثمانؓ ذی النورین نے انہیں بیت المال کا افسر مقرر فرمایا تھا۔ اس کے بعد مصر کا گورنر بنایا۔

اس تقرر کی مصلحت

سیدنا حضرت ذی النورینؓ نے پہلے تو یہ انتظام فرمایا کہ مصر میں انہیں افسر خراج اور سیدنا حضرت عمروؓ بن العاص کو گورنر اور کمانڈر انچیف مقرر فرمایا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد حضرت عمرو بن العاص کو واپس بلالیا اور انہیں کو ان کے شعبے بھی تفویض فرما دیئے۔ اس رد و بدل کا سبب اور اس کی مصلحت پر طبری کی مندرجہ ذیل روایت روشنی ڈال رہی ہے:

فکتب عبد اللّٰہ بن سعد الی عثمان یقول — حضرت عبداللہ بن سعد نے حضرت عثمانؓ کو لکھا:

(پچھلے صفحہ سے آگے) لیکن سوال تو یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی کیا۔ آپ ان سے ناراض رہے؟

آنحضور کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ انہیں توبہ کا موقع نہ دیا جائے اور پہلے ہی قتل کر دیا جائے ورنہ آپ کا ادنیٰ اشارہ کافی تھا کہ اس کلام سے ایک مقصد تو جرم ارتداد کی انتہائی شناعت اور اس پر اپنے شدید غیظ و غضب کا اظہار تھا، دوسرا مقصد صحابہ کرام کا امتحان تھا کہ انہوں نے ان کے قتل کا اقدام نہیں کیا اس کی وجہ نفس فی الذکر کی یا ذاتی تعلقات کی رعایت تھی۔ ان کے جواب سے ظاہر ہو گیا کہ یہ بات نہ تھی بلکہ اس کی وجہ ادب کی رعایت تھی وہ آنحضور کی موجودگی میں بغیر حکم آنحضور اس اقدام کو خلاف ادب سمجھے

ان عمرو آکسر الخراج وکتب
عمرو ان عبد اللہ کسر علی حیلۃ الحرب
(ج ۵ ۔ احوال ۲۶ھ)

کہ عمروؓ بن العاص نے خراج کو کم کر دیا ہے اور
حضرت عمروؓ نے انہیں لکھا ہے۔ حضرت عبد اللہؓ
نے ان کی جنگی تدبیروں کو کمزور کر دیا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی دینی و دنیاوی ترقی کے بارے میں دونوں حضرات کی پالیسی میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عمروؓ بن العاص عسکری مزاج رکھتے تھے اس لئے وہ اعلائے کلمۃ اللہ اور ترقی دینی و دنیاوی کے لئے عسکریت سے مناسبت رکھنے والا نظام قائم کرنا چاہتے تھے، اور مالیات (FINANCE) کو اس کے تابع رکھنا پسند کرتے تھے۔ بخلاف اس کے حضرت عبد اللہؓ بن سعد کی پالیسی یہ تھی ملک و مملکت کو مالی استحکام حاصل ہو۔ بیت المال کی آمدنی میں اضافہ ہو تاکہ دینی ادارے زیادہ اطمینان کے ساتھ اشاعت اسلام اور تعلیم و تربیت اہل اسلام کا کام انجام دے سکیں۔ ان دونوں پالیسیوں کا فرق ظاہر ہے عسکری نظام میں انسانی قوت کا رخ حربی ضروریات کی طرف ہونے کی وجہ سے پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے، جس کی وجہ سے محاصل و خراج میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر پیداوار میں اضافہ کی پالیسی اختیار کی جائے تو خراج اور حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ پالیسی کا یہ اختلاف کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس وقت کے حالات کے لحاظ سے حضرت عبد اللہ کی پالیسی کو زیادہ مناسب سمجھا اس لئے حضرت عمروؓ بن العاص کو واپس بلا لیا تاکہ حضرت عبد اللہؓ آزادی کے ساتھ ملک میں اپنی پالیسی کو نافذ کر سکیں، مصر کے مالیات کا تجربہ رکھنے کی وجہ سے ان کا تقرر عین تدبر تھا کسی نئے شخص کو مقرر کرنے سے ان کے ایسے تجربہ کار کو مقرر کرنا ہر سمجھدار آدمی کے نزدیک بہتر تدبیر و دانش اور تدبیر مملکت کا تقاضا تھا۔ اس تقرر سے وہی خوشگوار نتائج نکلے جن کی توقع حضرت عثمانؓ نے قائم کی تھی۔ چنانچہ حضرت عبد اللہؓ نے جب وہاں سے محاصل دربار خلافت میں بھیجے ایں

(حضرت عثمانؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص سے فرمایا۔

فقال عثمانؓ یا عمروؓ ھل تعلم ان تلک اللقاح درّت بعدک ۔	حضرت عثمانؓ نے فرمایا اے عمروؓ کیا تم جانتے ہو کہ ان اونٹنیوں نے تمہارے بعد (تمہاری سبکدوشی کے بعد) دودھ دیا ہے ۔
(طبری ج ۵ ۔ احوال ۲۷ھ)	

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن سعد بن سرح رضی اللہ عنہ کے حسن انتظام اور مہارت وقابلیت کی وجہ سے مصر کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

حضرت سعیدؓ بن العاصؓ

حضرت سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ صحابی ہیں ۔ وفات نبوی کے وقت ان کی عمر شریف نو سال تھی ، عالی دماغی ذہانت وفراست اور خواہش خدمت دین نو عمری ہی میں نمایاں تھی ۔ عہد عثمانی میں کتابت مصحف میں شریک رہے جہاد طبرستان میں افواج مجاہدین کے سپہ سالار تھے حضرت ولیدؓ بن عقبہ کے بعد کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے ۔

گذشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے معمولی اور رفع ہم سے اختلاف کو محض فتنہ پردازی کی غرض سے سبائیوں نے غیر معمولی اہمیت دیکر مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کا بیج بو یا تھا اور دو پارٹیاں بنا کر ہنگامہ آرائی کی تیاریاں کر رہے تھے مگر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ جب پہنچے تو انہوں نے حسن تدبیر سے فتنہ کو فرو کر دیا اور سبائیوں کے لئے فتنہ انگیزی کی راہیں مسدود کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مدت کے لئے یہ جماعت دب گئی اور اسے پروپیگنڈے کے لئے کوئی مواد فراہم نہ ہو سکا ۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کا مقصد ہی فتنہ پردازی تھا اس لئے یہ حضرت ولیدؓ کے سخت دشمن ہو گئے اور اس فکر میں لگے رہے کہ کسی طرح اس سد سکندری کو توڑ کر اپنی یا خوجیت کا اظہار کریں با آخر انہوں نے سازش کر کے

حضرت ولیدؓ پر شراب خوری کی تہمت لگائی اور جھوٹے گواہ تیار کر کے انہیں معزول کرا دیا۔ طبری نے جو تفصیلی روایتیں اس سلسلہ میں نقل کی ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مالک اشتر نخعی وغیرہ سبائی پارٹی کے سرغنہ اس سازش میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے اور جب حضرت ولید کو سزا دینے میں حضرت عثمانؓ نے کچھ تاخیر فرمائی تو ان لوگوں نے اسے بھی فتنہ کے لئے بہانہ بنانا چاہا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر خوب پروپیگنڈا کیا اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر کوفہ میں اپنی پارٹی میں نئی جان ڈال دی۔ ایسے موقع پر ضرورت تھی۔ اس فتنہ کو فرو کرنا سب کاموں پر مقدم رکھا جائے اور اس کام کے لئے کسی موزوں شخصیت کا انتخاب کیا جائے۔

حضرت عثمانؓ دیکھ چکے تھے کہ حضرت ولیدؓ بن عقبہ نے جو کامیابی اس سبائی فتنہ کو دبانے میں حاصل کی تھی اس میں جہاں ان کے حسن تدبیر کو دخل تھا وہاں اس چیز کو بھی دخل تھا کہ وہ خلیفۃ المسلمین کے قرابت دار ہیں۔ اس تجربے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ان کی جگہ اپنے قرابت دار سعیدؓ بن العاص کو بھیجا تاکہ انہیں اس فتنہ کو دبانے میں آسانی ہو۔ بلاشبہ اسی کی ضرورت تھی اور یہ عین حکمت و دانائی کی بات تھی۔ حضرت سعیدؓ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے علاوہ یہ مصلحت بھی انہیں اس عہدے کا مستحق قرار دے رہی تھی۔

حضرت عبداللہؓ بن عامرؓ بن کریز اموی

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ خود بھی صحابی ہیں اور حضرت عامرؓ صحابی کے بیٹے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ان کی دادی سیدہ ام حکیم بیضاءؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی تھیں جو آنحضور کے والد ماجد خواجہ عبداللہ کے ساتھ توام پیدا ہوئی تھیں۔ عہد فاروقی میں فوج کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے خراسان سجستان اور کرمان کو فتح کیا۔ ایران کی فتح میں حصہ لینے کی وجہ سے ایرانی ان کے سخت دشمن ہو گئے تھے اور انہیں بدنام کرنے

کی بر ملکن کوشش کرتے رہے۔

بصرہ کی گورنری

کردستان کی جنگ درپیش تھی۔ اس وقت بصرے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ گورنر تھے۔ اہل بصرہ نے ان کے بڑھاپے کی شکایت کی اور درخواست کی کہ کسی جوان آدمی کو گورنر مقرر کیجئے تاکہ انتظامی کام بھی چستی کے ساتھ ہو اور کردستان کی مہم بھی آسانی کے ساتھ سر کی جا سکے۔ حضرت عبداللہؓ بن عامر اس موقع کے لئے بہت موزوں شخص تھے۔ عہد فاروقی میں خراسان کرمان وغیرہ فتح کرنے کی وجہ سے وہ کردستان کے جغرافیہ اور وہاں کے لوگوں کے طرز جنگ (WARTECHNIC) سے خوب واقف ہو چکے تھے اس لئے اس مہم کے لئے قابل ترجیح تھے۔ بصرے کا سول انتظام ان کے ہاتھ میں دے دینے سے اس مہم میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ان کا ذہن رسا بہت عمدہ تجویزوں تک پہنچتا تھا اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی قابلیت بھی ان میں بہت اعلیٰ تھی۔ چنانچہ کابل۔ فارس۔ خراسان وغیرہ میں انہوں نے نہریں نکلوائیں۔ کنوئیں کھدوائے کاروان سرائیں تعمیر کیں اور عرفات و مکہ میں حوض بنوائے۔ بصرے میں بھی دو نہریں نکلوائیں اس طرح زراعت و تجارت اور مرفہ الحالی کو ترقی دی عوام الناس کو راحت و آسائش پہنچائی۔[1]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اپنی ضعیفی کی وجہ سے اس قدر تندہی سے کام نہ کر سکتے تھے اور بصرے کے معاشی حالات خراب ہو گئے تھے، چنانچہ جہاد کردستان کے لئے سواریوں کا انتظام بھی مشکل ہو گیا تھا، جیسا کہ طبری میں مفصل مذکور ہے۔ ان حالات میں ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو رزم و بزم دونوں میدانوں کا شہسوار ہو۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی نگاہ جوہر شناس نے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہما کا

---

[1] معارف ابن قتیبہ

انتخاب فرما کر اپنے تدبر اور اپنی جوہر شناسی کا بہت اچھا نمونہ پیش فرمایا جس کا اعتراف مصالح پر نظر کرنے کے بعد ہر منصف مزاج کرے گا۔ ان کے اس قابل تعریف اقدام پر اعتراض کرنا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جسے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے خواہ مخواہ پرخاش ہو۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہما حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بھی قریبی رشتہ دار تھے۔ ماموں زاد بھائی ہونے کے اعتبار سے وہ حضرت عثمانؓ سے قریب تر تھے لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی کے پوتے ہونے کی حیثیت سے ان کی قرابت حضرت علیؓ سے قریب تر تھی۔

مزید یہ کہ بصرے کے حالات کے اعتبار سے وہاں کے گورنر کا خلیفہ کا عزیز قریب ہونا بھی عین قرین مصلحت تھا۔ اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ شہادت عثمانؓ کے بعد بالکل واضح ہو گیا کہ کوفہ کی طرح بصرہ بھی سبائی پارٹی کا ایک مرکز تھا۔ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دور اندیش اور دقیقہ رس نگاہ نے پہلے ہی اندازہ فرما لیا تھا کہ مفسدین بصرے میں بھی پہنچ چکے ہیں اور اپنے قدم جمانے کی فکر کر رہے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی شکایت جس انداز سے کی گئی تھی اس میں بھی سبائی زہر کی بو آ رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت عثمانؓ کے ایسے فہیم و ذکی شخص اسے محسوس نہ فرماتے ایسے موقع پر اپنے کسی قرابت دار کو بھیجنا کئی اعتبار سے زیادہ نہایت قرین مصلحت تھا۔ اول اس لئے کہ خلیفہ وقت سے قرابت رکھنے کا رعب بہت سی سازشوں کے لئے سد سکندری ثابت ہو گا جیسا کہ ہم مفصل ذکر کر چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ مفسدین خلیفہ کے خلاف گورنر کی قبائلی یا خاندانی عصبیت کو ابھارنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ان کا اور خلیفہ کا خاندان ایک ہی ہے اگر کسی دوسرے خاندان کا کوئی شخص مقرر کیا جاتا تو یہ لوگ دوست بن کر اس میں خاندانی عصبیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ اس لئے کہ ان کا طریقہ یہی تھا

جیسا کہ مابعد کے واقعات نے بالکل واضح کر دیا ممکن تھا کہ گورنر اس سے متاثر نہ ہوتا لیکن ان دوست نما دشمنوں کے رویہ سے وہ کشمکش میں ضرور پڑ جاتا جس سے انتظام میں خلل واقع ہوتا۔ مناسب ترین صورت یہی تھی کہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار کو اس منصب پر فائز کیا جائے۔

اقربا کو عطائے مال کا طعن

اصولاً یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اعزا و اقارب کو روپیہ پیسہ یا اور کوئی مال ومنال دینا فی نفسہ کوئی مذموم یا قابل اعتراض چیز نہیں ہے بلکہ فی نفسہ مستحسن اور قابل تعریف کام ہے البتہ اگر اس مال کے حاصل کرنے یا اسے صرف کرنے میں احکام و قوانین شرعیہ کی رعایت نہ کی جائے تو یقیناً یہ چیز مذموم بھی ہوگی اور قابل اعتراض بھی۔ مثلاً اگر اس مصرف کے لئے کسی دوسرے کا حق مار کر مال حاصل کیا جائے اور اپنے اقربا کو دیا جائے یا بیت المال کی آمدنی سے اقربا پروری کی جائے تو یقیناً یہ معصیت اور بہت مذموم و قابل اعتراض فعل ہوگا۔

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی شخص بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ انہوں نے جو مال اپنے اقربا کو عطا فرمایا تھا وہ معاذ اللہ کسی خلاف شریعت ذریعہ سے کمایا ہوا تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی کسی دلیل سے قیامت تک نہیں ثابت کی جا سکتی کہ ان کی یہ عطا خلاف شریعت تھی۔ جب یہ دونوں باتیں ثابت نہیں ہیں تو حضرت ممدوح پر عطایا کے سلسلہ میں اعتراض و طعن کرنا چاند پر خاک ڈالنے کے مرادف اور خود قلب معترض کی بیماری کی علامت ہے۔

مودودی صاحب نے اس موقع پر بھی عجیب ہوشیاری سے کام لے کر سبائیوں کے اس پرانے اعتراض پر قلعی کر کے ناظرین کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔ پہلے آپ سبائیہ کا اعتراض ملاحظہ فرمائیں:

وانہ اعطیٰ بنی امیۃ اکثر من الناس ۔۔۔۔۔۔ اور انہوں نے (حضرت عثمان نے) بنو امیہ کو

(البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص۱۵۲)   دوسرے لوگوں سے زیادہ مال عطا فرمایا ہے۔

اس کے بعد مودودی صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں۔" ص۱۰۶

دونوں باتوں کا فرق ظاہر ہے۔ سبائیوں کے قول کا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے اعزا و اقارب کو دوسروں سے زیادہ مال عطا فرماتے تھے لیکن مودودی صاحب نے حضرت عثمانؓ اور بنو امیہ کی عداوت کی وجہ سے اس طعن کو زیادہ وزنی بنانے اور ناظرین کو ان حضرات سے بدگمان بنانے کے لئے "دوسری ایسی رعایات" کے گول مول اور مجمل الفاظ استعمال کئے تاکہ قاری کے ذہن کی رسائی صرف عطائے مال میں ناانصافی تک محدود نہ رہے بلکہ "بہت سی اور رعایتیں بھی" اس کے سامنے آجائیں۔ مثلاً وہ خیال کرے کہ شاید خلیفۃ المسلمین نے اپنے رشتہ داروں کو بیت المال پر ہر قسم کے تصرف کا اختیار دے دیا ہو۔ اسی طرح ان کے عمال ظالم ہوں گے لیکن ان کے ظلم پر امیر المومنین کوئی گرفت نہ کرتے ہوں وغیرہ وغیرہ (معاذ اللہ من ہذا الافکار الفاسدہ) اس طرح قاری کے دل میں جو بدگمانیاں حضرت عثمانؓ کی طرف سے پیدا ہو سکتی ہیں وہ سبائیہ کے قدیم اعتراض کو انہیں کے الفاظ میں دہرا دینے سے نہ پیدا ہو سکتیں، اور نہ دیانت کے علاوہ "علمی تحقیق" کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مودودی صاحب یہ لکھتے کہ "انہوں نے اپنے اعزا و اقارب کو دوسروں سے زیادہ مال عطا فرمایا"۔ "دوسری ایسی رعایتیں" کے مبہم الفاظ لانے کی نہ تو کوئی ضرورت تھی اور نہ اس کے لئے کوئی وجہ جواز پیش کی جا سکتی ہے، موصوف سے اگرچہ زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں تاہم وہ دلی کے رہنے والے ہیں ان کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اردو زبان سے اتنے نابلد ہیں کہ مندرجہ بالا دونوں کلاموں کا فرق نہیں سمجھ سکے۔

اگر موصوف کو سبائیوں کے قدیم طعن میں اضافہ ہی منظور تھا تو ثبوت میں "رعایات" کی کچھ مثالیں پیش کرتے، اور جب وہ اس سے عاجز تھے تو ایسا عام اور موہم لفظ استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہئے تھا۔ اس بے دلیل دعوے اور عام الفاظ کی توجیہ سوا اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ناظرین کو دھوکہ دے کر ان کے جذبات حضرت عثمانؓ کے خلاف ابھارنا چاہتے ہیں۔ اس دعویٰ عام کی دلیل بیان کرتے ہوئے حاشیہ پر لکھتے ہیں:۔

"مثال کے طور پر انہوں نے افریقہ کے مال غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) مروان کو بخش دیا" ص ۱۰۶

اس میں بھی نکتہ یہ ہے کہ اگر راقم السطور کی طرح کوئی شخص گرفت کرے کہ جناب والا آپ کا دعوےٰ تو "رعایات" کا ہے جو عام ہے اور اس کی دلیل خاص ہے، یعنی صرف عطائے مال میں مبینہ "رعایت" کا اظہار کر رہی ہے یہ تو ثبوت مدعا کے لئے کافی نہیں ہے۔ رعایت کی مزید قسمیں کہاں ہیں؟ ان کی بھی تو کوئی مثال پیش فرمایئے۔ تو فوراً جواب دیا جائے گا کہ ان "رعایات" سے مراد بھی عطائے مال ہیں "رعایت" ہے لفظ عام ہے مگر معنی خاص مراد لئے گئے ہیں۔ اس طرح ناواقف تو حضرت عثمانؓ کے متعلق بدگمان ہو جائے اور واقف کی زبان بھی بند کی جا سکے۔ ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اس چیز کا نام فریب دہی ہے یا علمی تحقیق؟ اور اس کا محرک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جذبہ بغض و عداوت ہے یا جذبۂ تحقیق؟

یہ تو مولانا کی شان تحقیق کا اظہار تھا، اب افریقہ کے خمس کی حقیقت بھی سن لیجئے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس روایت کا مدار طبری اور طبقات ابن سعد دونوں میں واقدی پر ہے، جس کا کذاب اور وضاع ہونا ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ بعد کی کتابوں میں مثلاً کامل ابن اثیر وغیرہ میں یہ تذکرہ انہیں دو کتابوں سے ماخوذ ہے جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، اس لئے مولانا کا

کامل ابن اثیر اور ابن خلدون کا حوالہ دینا بے سود ہے۔ رہا ابن اثیر کی تحقیق کا معاملہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کی رائے ہے یہاں بحث نفس روایت سے ہے جس پر رائے کی بنیاد قائم ہے جب یہی ثابت نہیں ہے تو ان کی یا کسی دوسرے کی رائے رائی کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔ واقعات محض رائے سے نہیں ثابت ہوتے ہیں بلکہ روایت سے ثابت ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ واقدی کے کذاب اور وضاع ہونے سے قطع نظر اس کی روایت میں سخت اضطراب بھی پایا جاتا ہے۔ خود مودودی صاحب نے کامل ابن اثیر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے افریقہ کے مال غنیمت کا خمس حضرت مروانؓ کو دے دیا تھا مگر طبری کی روایت ملاحظہ ہو فتح افریقہ کے سلسلہ میں اسی واقدی سے وہ نقل کرتے ہیں۔

وکان الذی صالحھم علیہ عبد اللہؓ بن سعد ثلثمائة قنطار ذھب فامر بھا عثمانؓ فی یوم لآل الحکمؓ قلت او مروان قال لا ادری۔ (طبری جلد ۵ واقعات ۲۷ھ)	ان لوگوں سے حضرت عبد اللہؓ بن سعد نے تین سو قنطار سونے پر صلح کی تھی تو حضرت عثمانؓ نے یہ سب کا سب آل الحکمؓ کو ایک ہی دن میں دیدیا میں نے پوچھا کہ کیا مروانؓ کو دے دیا تھا اس نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔

اس روایت میں واقدی کہتا ہے کہ (خمس نہیں) بلکہ پورا وصول شدہ مال (جس کی مالیت اسی روایت میں پچیس لاکھ بیس ہزار دینار ظاہر کی گئی ہے) عطا فرما دیا تھا۔ مقدار مال کے بارے میں اس اضطراب کے علاوہ اسی روایت میں دوسرا اضطراب یہ ہے کہ راوی یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ یہ مال کسے دیا گیا؟ آل حکمؓ کو جس میں بہت سے افراد تھے یا صرف حضرت مروانؓ کو؟

طبقات ابن سعد سے اسی واقدی کی جو روایت مودودی صاحب نے نقل کی ہے اس میں وہ کہتا ہے۔

و کتب لمروان بخمس مصر (حضرت عثمانؓ نے حضرت مروانؓ کے لئے
(ج ۳۵) مصر کا خمس لکھ دیا تھا۔

یہ تیسرا اضطراب و اختلاف روایت ہے، ایک جگہ واقدی افریقہ کے مال غنیمت کے متعلق تذکرہ کرتا ہے، دوسری جگہ مصر کا خمس دینے کو کہتا ہے، آخر اس کی کس بات کا اعتبار کیا جائے؟

طبقات ابن سعد کی مندرجہ بالا روایت دیکھئے تو واقدی کا بیان بالکل اس طرح کا ہے جیسے کوئی پولیس افسر کسی کے خلاف چارج شیٹ مرتب کر رہا ہو اور کسی نہ کسی طرح ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے درپے ہو۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت مروانؓ کی عداوت کے جوش میں وہ بھول گیا کہ وہ پہلے افریقہ کے مال غنیمت دینے کا تذکرہ کر چکا ہے اس لئے اس نے خمس مصر کا نام لے دیا۔ واقدی کے کذب و دروغ سے قطع نظر یہ اضطراب بھی بتا رہا ہے کہ یہ روایت بالکل جعلی اور جھوٹی ہے۔

مودودی صاحب نے بھی یہ سمجھ کر کہ چلو حضرت عثمانؓ کے اوپر ایک اور الزام لگانے کا موقع ملا، اس روایت کو بھی نقل فرما دیا گویا ان کے نزدیک دونوں واقعات الگ الگ ہیں۔ ممدوح نے حضرت مروانؓ کو افریقہ کے غنائم سے خمس عطا فرمایا اور مصر کا خمس بھی دے دیا۔

لیکن حضرت عثمانؓ کی مخالفت کے جوش میں موصوف نے یہ نہ سوچا کہ خمس مصر کے معنی کیا ہیں؟ اگر اس سے مال غنیمت کا خمس مراد ہے تو یہ بالکل باطل ہے اس لئے کہ مصر عہد فاروقی میں فتح ہو چکا تھا۔ عہد عثمانی میں وہاں سے مال غنیمت آنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ اور اگر خراج مصر کا خمس مراد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خراج میں سے بھی خمس نکالا جاتا تھا حالانکہ دستور اسلامی میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ کسی ملک کے خراج کا پانچواں حصہ مرکز بھیجا جاتا ہو۔ بلکہ عام قانون یہ تھا کہ خراج سے صوبے کے سرکاری اخراجات نکال کر جو کچھ بچتا تھا وہ خلیفہ کے پاس بیت المال میں داخل کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ خراج کی تخمیس کا نہ کوئی قانون ہے اور نہ کسی روایت سے اس کا پتہ چلتا

ہے۔ عہد نبوی سے لے کر عہد علوی تک کہیں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خراج کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہو۔

اس کے علاوہ لفظ خمس سے خراج کا خمس مراد لینا متبادر کے بھی خلاف ہے۔ حدیث و فقہ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ خمس کا لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہے اور جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے خمس غنیمت مراد ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس لفظ کے معنی متبادر یہی ہیں، اور خراج کا خمس مراد لینا بالکل خلاف اصول ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بمصداق "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" واقدی کو یاد نہیں رہا کہ مصر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہو چکا تھا۔ نہ یہ یاد رہا کہ وہ خود اس سے پہلے کیا کہہ چکا ہے۔

علامہ ابن اثیر کی جو رائے مودودی صاحب نے نقل کی ہے اس میں ایک کھلی ہوئی غلطی ہے معلوم نہیں کاتب کی غلطی ہے یا خود علامہ کی لغزش کہ حضرت عبد اللہؓ بن ابی سرح کو غنائم افریقہ کا خمس عطا کرنا لکھ دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے انہیں خمس الخمس یعنی پانچویں حصہ کا پانچواں حصہ عطا فرمایا تھا اور وہ بھی بعد کو واپس لے لیا۔ یہ طبری کی روایت ہے جو اس بارے میں اصل ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ نے حضرت عبد اللہؓ بن سعدؓ بن ابی سرح کو افریقہ پر حملہ کا حکم دیا۔ ہمت افزائی کے لئے فرمایا کہ اگر اللہ تعالٰی نے تمہارے ہاتھ پر فتح دی تو مال غنیمت کے خمس کا خمس بطور انعام تمہیں ملے گا۔ فتح کے بعد انہوں نے حسب ارشاد خلیفہ خمس کا خمس لے لیا۔ باقی مال غنیمت حسب قاعدہ تقسیم کر دیا اور خمس کا بچا خلیفہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ بات بعض لوگوں کو ناگوار ہوئی اور ان کا ایک وفد شکایت لیکر دربار خلافت میں پہنچا حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ شرعاً مجھے اس انعام کے دینے کا حق حاصل ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے بھی ایسا کیا ہے لیکن اگر تم لوگ ناراض ہو تو میں ان سے واپس لے لوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم راضی نہیں ہیں

اس لئے آپ نے حضرت عبد اللہ کو لکھ دیا کہ وہ خمس الخمس واپس کر دیں (طبری جلد ۵ - احوال ۲۷ھ)
ابن اثیر کا ماخذ طبری ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ ابن اثیر کا خمس لکھنا غلط ہے۔

واقدی کا کذاب اور وضاع ہونا، اس کے ساتھ روایت میں اضطراب و اختلاف اس حقیقت کو اور تشریح کر رہا ہے کہ حضرت مروان رحم کو عطائے خمس کا یہ پورا قصہ من گھڑت افسانہ اور جھوٹی کہانی ہے جسے خواہ واقدی نے وضع کیا ہو یا کسی اور نے۔

اس کے موضوع ہونے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ بلوائیوں نے جو اعتراضات سیدنا حضرت عثمانؓ پر کئے تھے اس میں اجمالاً اتنا تو کہا گیا ہے کہ وہ بنو امیہ کو دوسروں سے زیادہ مال عطا فرماتے ہیں لیکن پانچ لاکھ دینار عطا کرنے کا تذکرہ نہیں ہے حالانکہ ایسے موقع پر ایسی اہم مثال کا تذکرہ عادتاً لازم ہے جس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے ایسے لوگوں نے اسے مستقل اعتراض کی حیثیت دیدی ہے۔ اگر یہ واقعہ ہوتا تو یقیناً مفسدین اس کا تذکرہ کرتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سرے سے اس چیز کا وجود ہی نہیں ہوا اور یہ قصہ بعد کو گڑھا گیا ہے

طبری میں اس سلسلہ کی ایک دوسری روایت بھی ہے جو زیر بحث روایت سے بالکل مختلف ہے۔ یہ واقدی سے نہیں ہے بلکہ عبد اللہ بن احمد بن شبویہ سے مروی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مکان پر حضرات علی، طلحہ، سعد و زبیر رضی اللہ عنہم مشورے کے لئے جمع ہوئے، تو انہوں نے تقریر فرمائی اور فرمایا بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ میں نے اپنے اعزاء و اقارب کو مال عطا کیا ہے۔ یہ صحیح ہے مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے یہ اقارب فقراء و مساکین ہیں مال غنیمت کے خمس میں سے میں نے انہیں دیا اور اس کا مجھے حق ہے۔ لیکن اگر آپ لوگوں کی رائے ہو تو میں وہ بھی ان لوگوں سے واپس لے لوں۔ سب نے کہا کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک بھی ہے اور مستحسن بھی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ آپ نے مروانؓ اور خالد بن اسید کو بھی تو مال عطا فرمایا؟

اس کے بعد راوی کہتا ہے :۔

وکانوا یزعمون انہ اعطی مروان	ان کا خیال تھا کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت مروانؓ
خمسۃ عشر الفاً و ابن اسید خمسین	کو پندرہ ہزار دیئے تھے اور حضرت ابن اسید
الفاً۔ (طبری جلد پنجم احوال ۳۵ھ)	کو پچاس ہزار۔

آخر میں یہ ہے کہ آپ نے ان دونوں سے یہ مال واپس لیکر بیت المال میں داخل فرما دیا۔

ملاحظہ ہو اس روایت میں حضرت مروان کے لئے پندرہ ہزار کا عطیہ ظاہر کیا جا رہا ہے پھر یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ پندرہ ہزار درہم یا دینار ؟ کہاں پندرہ ہزار (درہم یا دینار) اور کہاں پانچ لاکھ دینار ؟ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔ یہاں اس روایت کی صحت و عدم صحت سے بحث[1] نہیں ہے۔ بلکہ دکھانا یہ ہے کہ اس معاملہ میں کتنا اختلاف بیان ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دوسرا واقعہ ہے تو سوال یہ ہے کہ اس موقع پر ان حضرات نے ۵ لاکھ دینار کا تذکرہ کیوں نہ کیا ؟ اور اگر یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہے تو یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ حضرت عثمانؓ پر پندرہ ہزار کے بارے میں اعتراض ہو چکا ہو اور وہ مال واپس کروا چکے ہوں۔ اس کے

---

[1] یہ روایت غلط اور مردود ہے۔ اس کا ایک راوی اسحاق بن یحییٰ مجروح ہے۔ متعدد ائمہ جرح و تعدیل نے اسے غالی ضعیف الحافظہ اور ناقابل اعتماد کہا ہے (میزان الاعتدال ترجمہ اسحاق بن یحییٰ) خصوصاً ایک صحابیؓ کے خلاف ایسے مجروح راوی کی روایت قبول کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ خود روایت کا تناقض بیان اس کی صداقت کو چیلنج کر رہا ہے۔ ملاحظہ ہو کہ پہلے تو حضرات حضرت عثمانؓ کے طرز عمل کی تصویب و تحسین کرتے ہیں اس کے بعد اعتراض بھی کرتے ہیں کہ فلاں کو آپ نے اتنا روپیہ دیا۔ اگر یہ الزام ذہن میں تھا تو تصویب و تحسین کے کیا معنی تھے ؟ یہ تناقض خود اس کی دلیل ہے کہ روایت کسی سبائی کارخانے میں گھڑی گئی ہے۔

بعد وہ انہیں کو ۵ لاکھ دینار دے دیں۔ اس کے علاوہ روایت کا سیاق بتا رہا ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ کے آخری دور کا واقعہ ہے جب ان کے خلاف شورش شروع ہو چکی تھی، ۵ لاکھ دینا کی روایت فتح افریقہ کے ذیل میں مذکور ہے، جو اس سے بہت پہلے ہوئی تھی۔

مودودی صاحب تحقیق کے مدعی ہیں لیکن نہ انہوں نے ضعف راوی پر نظر کی نہ اختلاف و اضطراب روایات پر، اور بغیر سوچے سمجھے سبائیوں کی تقلید میں حضرت مروانؓ کو ۵ لاکھ دینار عطا کرنے کا غلط الزام حضرت عثمان ذی النورینؓ پر لگا دیا۔

عداوت صحابہ نے موصوف کے دیدہ تحقیق پر ایسا پردہ ڈالا کہ تاریخ الخمیس کی مندرجہ ذیل روایت بھی ان کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ کے فرمان کے بموجب حضرت عبد اللہؓ بن سعد ابن ابی سرح عامل مصر نے شمالی افریقہ (تیونس و الجزائر) پر فوج کشی کی اس میں خاصی تعداد مدینہ طیبہ کے نوجوانوں کی بھی شریک ہوئی اور حضرت مروانؓ بھی اس میں شریک تھے۔ اس جنگ میں بہت مشکلیں درپیش ہوئیں اور فتح بہت مدت کے بعد حاصل ہوئی جس کی وجہ سے اہل مدینہ بہت فکر مند تھے۔ جو مال غنیمت حاصل ہوا اس کا خمس حضرت عبداللہؓ نے خلیفۃ المسلمین کے پاس بھیجنے کے لئے نکالا، اس میں پانچ لاکھ دینار کا سونا چاندی تھا۔ اس کے علاوہ سامان اور مویشی تھے۔ سامان اور مویشی کا مدینہ منورہ بھیجنا جو کئی ہزار میل کی مسافت پر تھا بہت مشکل نظر آیا۔ اس لئے اسے نیلام کر دیا گیا۔ نیلام میں اسے حضرت مروانؓ نے ایک لاکھ درہم (تقریباً ۲۵ ہزار روپے) میں خرید لیا۔ اس رقم کا بیشتر حصہ انہوں نے نقد ادا کر دیا۔ کچھ رقم باقی رہ گئی جس کے متعلق انہوں نے مدینہ منورہ پہنچکر ادائیگی کا وعدہ کیا۔ حضرت عبد اللہؓ امیر لشکر نے خمس غنیمت انہیں کے سپرد کیا، اور ہدایت کی کہ وہ اسے مدینہ طیبہ لے جائیں اور وہاں بقیہ رقم (جو ان پر باقی تھی) ۵ لاکھ خمس کی رقم

پوری کر کے بیت المال میں داخل کر دیں۔

اہل مدینہ اپنے لڑکوں اور اعزا کی وجہ سے بہت فکر مند اور پریشان تھے۔ حضرت مروان نے پہنچکر مژدہ فتح سنایا اور ان کی خیر و عافیت سے مطلع کیا تو سب کو بہت خوشی ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے خوش ہو کر وہ چھوٹی سی رقم جو ان پر باقی تھی معاف کر دی (تاریخ الخمیس جلد ثانی ص۲۹۵ ذکر ما نقم علی عثمان رضی اللہ عنہ) ظاہر ہے کہ وہ رقم ۵ لاکھ دینار نہیں ہو سکتی ہے نہ ایک لاکھ درہم ہو سکتی ہے، اس لئے کہ اس کا بڑا حصہ وہ ادا کر چکے تھے۔ اندازاً وہ رقم اس زمانے کے حساب سے چار پانچ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہوگی۔

مولانا کو اگر یہی ضد تھی کہ خمس افریقہ عطا کرنے کی روایت تسلیم ہی کر لی جائے۔ تو تاریخ الخمیس کی اس روایت ہی کو قبول فرمالیا ہوتا اس کے مصنف کی حیثیت تو وکیل صفائی کی نہیں ہے۔

حقیقت واقعہ

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ حضرت مروانؓ اور خمس افریقہ کا عطا کر دینا (خواہ وہ پانچ لاکھ دینار ہوں یا چند ہزار درہم) بالکل بے اصل اور غلط ہے، کوئی روایت بھی اس سلسلہ میں قابل اعتماد و قبول نہیں ہے۔ سب روایتیں بالکل جعلی اور موضوع ہیں جو سبائیوں نے محض حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنے کے لئے وضع کی ہیں، بعد کے مورخین نے انہیں جعلی روایتوں پر اپنی آرا کی بنیاد رکھی ہے، اس لئے روایات کی لغویت ثابت ہو جانے کے بعد کسی مورخ کی رائے کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا خواہ وہ ابن اثیر ہوں یا ابن خلدون یا ابو ذکیؒ۔ اس مسئلہ پر جو بحث اوپر گذر چکی ہے اسے سامنے رکھ کر تاریخ کا ہر طالب علم اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔

چنانچہ تاریخ الخمیس کے مصنف بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں،۔

حضرت عثمانؓ پر ان کا یہ اعتراض کہ انہوں نے غنائم | واما طعنہم علی عثمان انہ وھب خمس

افریقیۃ لمروان ابن الحکم فھو غلط منھم (۷۰)

افریقہ کا خمس حضرت مروانؓ کو دے دیا تھا ان کی غلط بیانی ہے۔

یہی نامور مورخ حضرت عثمانؓ کے متعلق اس قسم کے جملہ اعتراضات کے متعلق اپنی کلی رائے کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

وبما ما ادعوہ من اسرافہ فی بیت المال فاکثرہ ما نقلوہ عنہ مفترٰی علیہ مختلق وما صح منہ فعذرہ منہ فیہ واضح (۷۱)

معترضین جو حضرت عثمانؓ پر بیت المال میں اسراف (صرف بےجا) کا اعتراض کیا ہے (اس کا یہ حال ہے) کہ اس قسم کی اکثر روایتیں جو انہوں نے نقل کی ہیں ان پر محض افترا و بہتان ہیں اور وہ روایتیں من گھڑت ہیں اور جو واقعات ثابت ہیں ان میں ان کا عذر بالکل واضح ہے۔

یعنی انہوں نے بیت المال کے مال سے جو صرف کیا ہے وہ اصول دین کے ماتحت اور دینی مصالح کے پیش نظر کیا ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا نہ اسے اسراف میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

مودودی صاحب کو اگر بقول خود تاریخ کے اصل مآخذ کو اپنا سرمایہ تحقیق بنانا تھا تو انہیں روایات پر سند و درایت دونوں پہلوؤں سے نقد کرنا چاہئے تھا اور قبول کرنے سے پہلے ان کا جانچنا پرکھنا لازم تھا، اور اگر مورخین مابعد کی تقلید ہی کرنا تھی تو انہیں یہ سوچنا چاہئے تھا کہ ایک صحابی اور ایسے جلیل القدر صحابی کے متعلق جب مورخین کی دو رائیں ہیں تو وہی رائے قابل قبول ہے جو ان کی پوری زندگی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو، لیکن ان کا رویہ عجیب ہے، وہ ابن اثیر کی رائے کے اسیر بن جاتے ہیں لیکن تاریخ الخمیس کی مندرجہ بالا تصریح کی جانب التفات بھی نہیں کرتے۔

اگر ان کے دل میں عظمت صحابہ جگہ نہیں پا سکی تو دعویٰ تحقیق کی لاج رکھنے ہی کے لئے سہی انہیں کم ازکم اس رائے کو نقل کرنا چاہئے تھا خواہ اس کی تردید ہی کر دیتے۔

وفا کو بھول جاؤ، خاک ڈالو عہد و پیماں پر
ترس ہی کھا کے آؤ، آؤ تو گور غریباں پر

انصاف شرط ہے، آپ ہی بتائیے کہ اس بلیک آؤٹ کے بعد مولانا کی حیثیت محقق کی نظر آتی ہے یا وکیل مدعی کی؟

سیدنا حضرت عثمانؓ کا بیان

مودودی صاحب طبری کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اس پر بہت اعتماد فرماتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ انہیں اسی کتاب میں سیدنا حضرت عثمان ذی النورین کا وہ خطبہ نظر نہیں آیا جس میں انہوں نے سبائیوں کے اس قسم کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ یہ خطبہ بہت طویل ہے۔ ہم یہاں اس کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا تعلق عطائے مال کے مسئلہ سے ہے وھی ھذہ۔

وقالوا انی احب اھل بیتی واعطیھم	یہ (معترضین) کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان والوں سے
فاما حبی فانہ لم یمل معھم علیٰ	محبت کرتا ہوں اور انہیں مال عطا کرتا ہوں (یہ
جور بل احمل الحقوق علیھم واما	صحیح ہے) مگر (واضح ہو کہ ان کے ساتھ) میری
اعطاءھم فانی ما اعطیھم من مالی	محبت نے مجھے کسی ظلم اور حق تلفی پر مائل نہیں کیا ہے
ولا استحل اموال المسلمین لنفسی	بلکہ ان کے حقوق ادا کرتا ہوں اور رہا کچھ میں انہیں
ولا لاحد من الناس ولقد کنت اعطی	دیتا ہوں، وہ صرف اپنے ذاتی مال میں سے دیتا ہوں

العطية الكبيرة والرغيبة من صلب مالی
أزمان رسول الله صلی الله علیه وسلم
وابی بکرؓ وعمرؓ وانا یومئذ شحیح حریص
فحین اتیت علی اسنان اهل بیتی
وفنی عمری وودعت الذی لی
فی اهلی قال الملحدون ما قالوا وانی
والله ما حملت علی مصر من الامصار
فضلا فیجوز ذلك لمن قاله ولقد
رددته علیهم وما قدم علیّ الا
الاخماس ولا یحل لی منها شیئ
فولی المسلمون وضعها فی اهلها
دونی ولا یتلفت من مال الله بفلس
فما فوقه وما اتبلغ ما آکل الا من
مالی ۔ (تاریخ طبری جلد پنجم احوال ۳۵ھ)

وہ صرف اپنے ذاتی مال میں سے دیتا ہوں مسلمانوں
کا مال نہ میں اپنے لئے حلال سمجھتا ہوں اور نہ کسی
دوسرے کے لئے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے زمانے میں
بھی اپنے ذاتی مال میں سے گراں قدر عطیے
دیا کرتا تھا، حالانکہ اس زمانے میں مجھے مال کی
خواہش بھی تھی اب جبکہ میں اپنی فانی عمر کو
پہنچ چکا ہوں زندگی ختم ہو چکی ہے اور میں نے
اپنا تمام سرمایہ اپنے خاندان والوں کے سپرد
کر دیا ہے ۔ تو یہ بے دین ملحد یہ باتیں کر رہے ہیں
خدا کی قسم میں نے کسی شہر پر خراج کا کوئی ایسا
بار نہیں ڈالا جس کی وجہ سے میرے اوپر اس طرح
کا الزام لگانا جائز ہو ۔ جو کچھ بھی حاصل ہوا وہ
انہیں لوگوں کی رفاہ و بہبود پر میں نے صرف کیا ۔
میرے پاس صرف خمس آتا ہے اس میں سے بھی
میں اپنے لئے کچھ لینا جائز نہیں سمجھتا ۔ میں
نہیں بلکہ تمام مسلمان اسے اس کے مستحقین پر
صرف کرتے ہیں ۔ خدا کے مال میں ایک پیسہ
کا تصرف بھی نہیں کیا جاتا اور میں اس میں سے

کو بھی نہیں لیتا ہوں۔ یہاں تک کہ کھانا بھی اپنے ہی
مال میں سے کھاتا ہوں۔

طبری کی اسی روایت میں ہے کہ مجلس میں جو صحابہ کرام موجود تھے انہوں نے اس بیان کو سن کر فرمایا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست اور واقعہ ہے لیکن جو سبائی مجلس میں موجود تھے انہوں نے اپنے گروہ میں جاکر کہا کہ عثمانؓ اپنی اصلاح پر آمادہ نہیں ہیں۔

سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وارضاہ کے اس بیان سے عیاں ہے کہ عطائے مال کے بارے میں جتنے الزامات سبائیوں نے ان پر لگائے ہیں اور جن کا اعادہ مودودی صاحب نے کیا ہے، مثلاً خمس ازلیقہ مروان کو بخش دینا یا بنوامیہ کو بیت المال میں سے زیادہ مال دینا یہ سب بالکل غلط اور سبائیوں کے بہتان ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔

فقہاء کی روایت

اس روایت کی تائید فقہائے کرام کی مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے:

ملک العلماء امام علاء الدین ابی بکر بن مسعود کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور ومقبول کتاب بدائع الصنائع میں سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں اس مسئلہ پر استدلال کرتے ہوئے کہ خمس مال غنیمت میں ذوی القربیٰ کا استحقاق فقر کے ساتھ مشروط ہے لکھتے ہیں:-

ولنا ما رواہ محمد بن الحسن فی کتاب السیر ان سیدنا ابا بکر وسیدنا عمر وسیدنا عثمان وسیدنا	ہماری دلیل وہ روایت ہے جو امام محمد بن الحسن نے کتاب السیر میں ذکر فرمائی ہے کہ سادات نا حضرت ابوبکر وحضرت عمر وحضرت

علیا رضی اللہ عنہم قسموا الغنائم علی ثلثۃ اسہم بینہم للیتامی وسہم للمساکین منہم لابناء السبیل بحضرمن الصحابۃ الکرام ولم ینکر علیہم احد فیکون اجماعًا منہم علی ذٰلک

(بدائع الصنائع جلد ہفتم الباب الجہاد وبیان تقسیم خمس غنیمت مطبوعہ مصر ص۱۲۵)

عثمان وحضرت علی رضی اللہ عنہم مال غنیمت کو (مراد خمس ہے جیسا کہ سیاق وسباق سے ظاہر ہے اور اسی پر بحث ہو رہی ہے) تین حصوں میں تقسیم کرتے تھے ایک حصہ یتامی کا، دوسرا مساکین کا اور تیسرا مسافروں کا، اور یہ طریقہ انہوں نے صحابہ کرام کے سامنے اختیار فرمایا جس پر کسی نے انکار نہیں فرمایا اس لئے اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔

واضح رہے کہ فقہاء کی روایت خصوصًا ایسے فقہاء کی جو حدیث کے پرکھنے والے تھے (جیسے امام محمد رضی اللہ عنہ) کا جو درجہ ہے وہ تاریخی روایتوں کا نہیں ہو سکتا۔ ان روایتوں کے مقابلہ میں تاریخی روایات کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر بالفرض تاریخی روایتوں سے یہ ثابت بھی ہوتا کہ سیدنا حضرت عثمان عطائے مال کے بارے میں بنو امیہ کو ترجیح دیتے تھے تو بھی یہ روایت تنہا ان سب روایات کی تکذیب و تردید کے لئے کافی تھی، چہ جائیکہ تاریخ سے بھی یہ الزام ثابت نہ ہو اور خود حضرت عثمان کا تاریخی بیان ان سب الزاموں کی تکذیب و تردید کر رہا ہو۔ اور جو روایتیں ثبوت الزام میں نقل کی جاتی ہیں ان سب کا موضوع جعلی اور مکذوب ہونا ثابت ہو رہا ہو۔

اس روایت سے عیاں ہے کہ اپنے پیشرو خلفائے راشدین کی طرح حضرت عثمان کی عادت بھی وہی تھی کہ خمس غنائم فقراء و مساکین اور ابناء سبیل کو تقسیم فرماتے تھے اور اگر بالغرض سیدنا حضرت ابوبکر وسیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی طرح آپ نے بھی کبھی کبھار کسی کو کچھ عطا فرمایا ہوگا تو یقینًا کسی مصلحت شرعی اور مصلحت دینی کی بنا پر عطا فرمایا ہوگا۔ اور کسی حال میں بھی مذکورہ بالا اصناف ثلثہ (یتامی، مساکین اور ابناء السبیل) کے

استحقاق کو آپ نے نظر انداز نہ فرمایا ہوگا۔

ایک سمجھدار آدمی اس سے سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مروان کو خمس افریقہ دینے یا اپنے خویش واقربا حضرت حارث بن حکم حضرت سعیدؓ بن العاص ۔ حضرت عبداللہ بن خالد کو گرانقدر رقوم بیت المال سے دینے کی حکایتیں محض باطل ، جعلی اور جھوٹی ہیں جو دشمنان عثمانؓ نے محض انہیں بدنام کرنے کے لئے وضع کی ہیں[۱] یہی نہیں بلکہ اس قسم کی جملہ روایات موضوع ، جعلی اور لغو ہیں ۔ ظاہر ہے کہ فقہاء و محدثین کی روایت کے مقابلہ میں طبری ابن سعد ، ابن خلدون ، ابن اثیر وغیرہ کی روایات کی حقیقت ہی کیا ہے ؟

مسئلہ کی فقہی حیثیت

مودودی صاحب خود اعتراف کرتے ہیں :

"ان روایات سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقرباء کو روپیہ دینے میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ ہرگز شرعی جواز کی حد سے متجاوز نہ تھا " ص ۳۲۸

اس اعتراف کے بعد معاملے کے فقہی پہلو اور اس کے جواز سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں

---

[۱] تاریخ الخمیس ج ۲ میں مذکور ہے کہ ان مؤخر الذکر تینوں حضرات کو جو کچھ آپ نے عطا فرمایا وہ اپنے ذاتی مال میں سے عطا فرمایا تھا بیت المال سے اسے کوئی تعلق نہ تھا ۔ اپنے خویش صاحبان کو جو آپ نے عطا فرمایا وہ درحقیقت اپنی صاحبزادیوں کو بطور جہیز دیا تھا اور سب اپنی جیب خاص سے دیا تھا ۔ اس سلسلے میں طبری کی روایت پر ہم نقد کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ وہ مردود ہے ۔ ان روایتوں کو مودودی صاحب نے ضمیمہ کتاب میں نقل کیا ہے مگر چونکہ ہم اس کا جواب دے چکے ہیں اس لئے زیر بحث کرنا بیکار ہے ۔

رہی ، لیکن موصوف کا طرز یہ ہے کہ دلائل کے سامنے مجبوراً سپر ڈالتے ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف محض وقتی مصلحت سے کرتے ہیں ، پھر نہایت ہوشیاری کے ساتھ عنوان بدل کر اسی بات کو اس طرح کہتے ہیں کہ مخاطب تو متاثر ہو جائے مگر سطح بین نظریں گرفت بھی نہ کر سکیں اس مسئلہ میں بھی انہوں نے یہی طرز اختیار کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ میں عطائے مال کے طعن کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

" یہ نیت کی غلطی نہیں بلکہ رائے کی غلطی یا بالفاظ دیگر اجتہادی غلطی تھی ۔ نیت کی غلطی وہ اس وقت ہوتی جبکہ وہ اس کام کو ناجائز جانتے پھر محض اپنے مفاد یا اپنے اقرباء کے مفاد کے لئے اس کا ارتکاب کرتے لیکن اسے اجتہادی غلطی کہنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے کیوں کہ صلہ رحمی کے حکم کا تعلق ان کی ذات سے تھا نہ کہ ان کے منصب خلافت سے ۔ " ص ۳۲۱

مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کا یہ فعل حقیقت کے اعتبار سے تو شرعاً ناجائز ہی تھا لیکن غلطی سے وہ اسے جائز سمجھتے تھے ۔ حیران ہوں کہ مودودی صاحب کی اس رائے کے بعد ان کے مذکورہ بالا قول کے کیا معنی لئے جائیں جو انہوں نے صفحہ ۱۰۸ پر تحریر کیا ہے کہ حضرت عثمان کا طرز عمل شرعی جواز کی حد سے متجاوز نہ تھا " دونوں باتوں کے کھلے ہوئے تناقض کی توجیہ صرف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ مولانا اجتہادی غلطی کی شکر لپیٹ کر اپنے باطل و گمراہ کن الزام کا زہر مخاطب کے حلق سے اتارنا چاہتے ہیں لیکن جب ناقدوں کے روشن دلائل کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو مجبوراً " ان کہی " کہہ کر ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش فرمائی ۔ اس کے سابق عبارت (ص ۳۲۱) بھی باقی رکھی تا کہ کم از کم نادان اور سطح بین ناظرین یا ان کے معتقدین کے دل میں تو سیدنا ذی النورینؓ کے خلاف جذبہ پیدا ہی کر دیا جائے ۔

حق یہ ہے کہ مودودی صاحب کا یہ بیان بالکل غلط اور بے دلیل ہے۔ اول تو یہی بات غلط ہے کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے اعزہ و اقارب کے ساتھ صلہ رحمی بیت المال سے کرتے تھے اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے اصل کتاب یا ضمیمہ میں جو روایتیں طبری، طبقات ابن سعد، استیعاب وغیرہ سے نقل کی ہیں۔ ان کا موضوع جعلی اور مہمل ہونا ہم واضح کر چکے ہیں اور روشن دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ اقارب کے ساتھ سخاوت و فیاضی کا بار تنہا ان کی جیب خاص اور ان کی ذاتی دولت پر تھا۔ بیت المال سے ایک حبہ نہ وہ خود لیتے تھے نہ کسی اپنے عزیز قریب کو دیتے تھے یہ الزام کہ وہ بیت المال سے اقربا پروری کر کے صلہ رحمی کا تقاضا پورا کرتے تھے اور اس خیر کو انہوں نے غلط فہمی سے منصب خلافت کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا ان پر افترا اور بہتان ہے اس سراپا کذب و دروغ دعوے کا کوئی ثبوت مودودی صاحب اور ان کے اعوان و انصار قیامت تک نہیں پیش کر سکتے اسی طرح گذشتہ بحث کی روشنی میں دیکھئے تو مودودی صاحب کا یہ لکھنا کہ :

> "انہوں نے جو کچھ لیا وہ یا تو صدر مملکت کی حیثیت سے اپنے حق الخدمت کے طور پر لے کر خود استعمال کرنے کے بجائے اپنے عزیزوں کو دیا، بیت المال سے قرض لے کر دیا جسے وہ ادا کرنے کے ذمہ دار تھے، یا اپنی صوابدید کے مطابق انہوں نے خمس کے مال کو تقسیم کیا جس کے لئے کوئی مفصل شرعی ضابطہ موجود نہ تھا"۔ ص ۳۲۸

بہت ہی افسوسناک اور شرمناک جرأت ہے۔

طبری کی روایت ہم ذکر کر چکے ہیں، جس میں سیدنا حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں، کہ میں بیت المال سے ایک حبہ بھی نہیں لیتا نہ کسی اپنے عزیز کو دیتا ہوں۔ کھانا بھی اپنے پاس سے کھاتا ہوں اپنے اقارب کو جو دیتا ہوں وہ اپنے ذاتی مال ہیں سے دیتا ہوں اور مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ حق الخدمت لیتے تھے فیا للعجب! رہا قرض کا معاملہ تو طبقات

ابن سعد کی اس روایت کا جعلی اور مردود ہونا ہم صفحات سابقہ میں ثابت کر چکے ہیں۔

یہ کہنا غلط بھی ہے اور مضحکہ خیز بھی کہ خمس کی تقسیم کا کوئی مفصل ضابطہ موجود نہ تھا۔ اس کا ضابطہ قرآن مجید، احادیث، کتب فقہ سب میں دیکھا جا سکتا ہے اور بدائع کی مذکورہ روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ کس ضابطہ کے ماتحت اسے تقسیم فرمایا کرتے تھے، اور کن لوگوں کو تقسیم فرماتے تھے انہوں نے اس بارے میں نہ کوئی ارادی غلطی کی اور نہ اجتہادی۔ اسے اجتہادی غلطی کہنا بھی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر سخت ظلم و افترا ہے۔

جہاں تک مسئلہ کی فقہی حیثیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں گزارش ہے کہ خمس غنیمت میں سے کسی کو اس کے حصے سے زائد دینا یا مال غنیمت میں سے تنفیل (زائد انعام) دینا خلیفہ کے لئے بالکل جائز ہے۔ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا ثابت ہے، اسی طرح حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ثابت ہے۔ بعد کے ائمہ فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے، باوجودیکہ وہ اس مسئلہ کے بعض جزئیات میں باہم اختلاف بھی رکھتے ہیں مگر اس بات پر بالکل متفق ہیں[1]۔ اگر بالفرض اس خلاف واقعہ بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے کچھ رقم خمس میں سے یا بطور نفل مال غنیمت میں سے اپنے بعض اعزا کو عطا فرمائیں تو بھی انہوں نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا اور ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا[2]۔ اسے خطائے اجتہادی کہنا بھی ویسا ہی غلط ہے جیسا اسے ناجائز کہنا

---

[1] دیکھئے بخاری و مسلم نیز کتاب الاموال الامام ابی عبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ و بدائع الصنائع۔ کتاب الاموال میں یہ بحث اور متعلقہ روایتیں یکجا مل جائیں گی۔

[2] اسی سلسلہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ سیدنا ذی النورینؓ نے اپنے بعض اعزہ کو جاگیریں دیں یہ اعتراض بھی بے بنیاد اور مکرر ہے کتب تاریخ طبری و تاریخ الخمیس وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ذی النورینؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں جن جلیل القدر حضرات کو جاگیریں یعنی زمینیں عطا فرمائیں حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت خباب بن ارتؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ ان سب حضرات میں معروف (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

سیدنا حضرت عثمان کے خلاف شورش کے اسباب

سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت جو ان کی شہادت اور مسلمانوں کی اجتماعیت کی شکست و ریخت پر منتج ہوئی تاریخ اسلام کا بہت اہم اور بہت افسوسناک واقعہ ہے، یہ ایسا فتنۂ عظیمہ تھا جس کے تلخ نتائج سے آج تک امت مسلمہ کو نجات نہیں ملی ہے۔ سیدنا عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت ایک طرف ایسا دردناک واقعہ ہے جس پر امت قیامت تک افسوس کرتی رہے تو حق بجانب ہے۔ دوسری طرف ان کا عزم صمیم، ان کی استقامت علی الحق اور ان کا مثالی کردار اور تاریخ کا وہ بے بہا سرمایہ ہے جس پر امت مسلمہ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔

مودودی صاحب نے حقائق کو مسخ کرکے اس فتنۂ عظیمہ کی ایسی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے جس میں حضرت عثمانؓ خود ہی (معاذ اللہ) اس فتنہ اور شورش کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں، ان کی مظلومیت کا تصور دھندلا پڑ جائے اور ان کے مثالی کردار کی تابناکی بھی کم ہو جائے اس طرح سبائیوں اور مفسدوں کا جرم ہلکا ہو جائے۔ سطور ذیل میں ہم شورش کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں، جس سے مودودی صاحب کی غلطی واضح ہو جائے گی اور حقیقت سامنے آ جائے گی۔

ابتدائی صفحات میں عرض کر چکا ہوں کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں جب

(پچھلے صفحہ سے آگے) حضرت زبیرؓ حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار تھے، اتنے آدمیوں میں اگر ایک عزیز کو بھی جاگیر دے دی گئی وہ بھی معمولی تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علیؓ و حضرت عمرؓ کو جائداد و جاگیر دینا ثابت ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات شیخین سے بھی یہ چیز ثابت ہے، دیکھئے بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ کتب حدیث نیز تاریخ طبری و تاریخ الخمیس وغیرہ۔ ۱۲

یہود کو یقین ہو گیا کہ دلائل و براہین کے محاذ پر انہیں کبھی فتح نصیب نہیں ہو سکتی اور سیف و سنان کے میدان میں بھی انہیں کامیابی سے مایوسی ہو گئی ——————

—————— تو انہوں نے نفاق اور فریب کے آزمودہ ہتھیار سے اسلام کو نقصان پہنچانے کا عزم کر لیا۔ دین مبین کے خلاف یہود کی یہ خفیہ تحریک خود سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے زمانہ ہی سے شروع ہو گئی تھی اور مشہور منافق عبداللہ ابن ابی ابن سلول اس کا بانی تھا۔ لیکن اس دور مسعود میں ان کی دال نہ گلی اور وحی ربانی و فراست نبوی نے منافقین کو مخلصین سے اس طرح ممتاز کر دیا، کہ ان کی ریشہ دوانیاں بالکل بیکار ہو جاتی تھیں۔ کچھ مدت کے بعد خود زمانہ رسالت ہی میں یہودیوں میں سے بعض مر گئے اور بعض جلاوطن کر دیئے گئے۔ کچھ اخلاص کے ساتھ ایمان لے آئے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف اس مفسد گروہ سے پاک ہو گئے۔ لیکن یہ کینہ پرور قوم جہاں گئی اپنی ناپاک تحریک کو اپنے ہمراہ لے گئی اور مدینہ طیبہ سے دور دراز مقامات پر پہنچ کر بھی ان کی اسلام دشمنی کا سیلاب نہیں ڈھلا۔

مملکت اسلامیہ میں جہاں یہ لوگ آباد تھے مثلاً خیبر وہاں بھی یہ لوگ مفتوح ہونے کے بعد بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور فتنہ پردازیوں میں مصروف رہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا۔ آنحضور کے بعد حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو شہید کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اور بہت سی تکلیف دہ مفسدانہ حرکتیں کرتے رہے جن کی وجہ سے بالآخر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں انہیں وہاں سے بھی جلاوطن کرنے پر مجبور ہوئے۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور خلافت اول تو بہت مختصر تھا، دوسرے اس میں اگرچہ مسلمانوں کے قدم ایران و شام وغیرہ کے حدود میں داخل ہو چکے تھے مگر فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع نہ ہوا تھا کہ ایسے یہود جزیرۃ العرب سے نکلنے کے بعد اپنی مفسدہ پردازیوں کی

جولانگاہ بنا سکتے۔ تیسرے جنگ جاری تھی اور شیرانِ اسلام ان ممالک پر پوری قوت کے ساتھ حملہ آور اور کفار سے نبرد آزما تھے۔ ایسے وقت میں یہود کی ایسی بزدل قوم کے لئے جو اس وقت سیاسی اعتبار سے بھی بہت پستی میں پہنچ چکی تھی اطمینان سے بیٹھ کر سازشیں کرنا بہت مشکل تھا۔ چوتھی اہم بات یہ تھی کہ اس وقت تک ایسے نومسلموں کی کوئی معتد بہ تعداد نہ تھی جن کے دلوں میں اسلام راسخ نہ ہوا اور جو ان کے لئے آلۂ کار بن سکتی اسی طرح پختہ مسلمانوں کی وہ نئی نسل بھی ابھی تیار نہیں ہوئی تھی جو باوجود پختہ مسلمان ہونے کے اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہودی فریب کا شکار ہو سکتی۔ ان اسباب کی وجہ سے سیدنا صدیق اکبرؓ کے عہد معدلت مہد میں بھی یہود کی یہ ناپاک تحریک ابھر نہیں سکی۔ ان اسباب کے ساتھ سیدنا صدیق اکبرؓ کے حسن انتظام، اعلیٰ تدبر و تدبیر کو بھی مفسدوں کی ہمت شکنی میں خاصا دخل تھا۔ تاریخ اسلام کے طالب علم سے یہ نکتہ مخفی نہیں رہ سکتا کہ ممدوح فتنوں کو فرو کرنے اور مفاسد کو مٹانے میں ایک امتیازی شان رکھتے تھے اور حق تعالیٰ جل شانہٗ نے اس کا ایک خاص سلیقہ اور ملکہ انہیں عطا فرمایا تھا۔

تاہم اگر تحقیق کی جائے تو کچھ عجب نہیں کہ فتنۂ ارتداد، اور فتنۂ انکار ادائے زکوٰۃ کے پس منظر میں بھی یہود کی ریشہ دوانیاں اور دسیسہ کاریاں کارفرما نظر آئیں۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آخری دورِ خلافت میں یہود کی اس تحریک نے پھر انگڑائی لی اور فتنہ پیدا کرنے کے لئے تیاری شروع کر دی۔ کوفہ کے بعض افراد کی طرف سے جو شکایت وہاں کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں کی گئی تھی جس کا تذکرہ ہم بخاری شریف کے حوالے سے کر چکے ہیں وہ اس مفسد پارٹی کے وجود کی ایک علامت کہی جا سکتی ہے لیکن سیدنا فاروق اعظمؓ کا اعلیٰ تدبر اور ان کی بے نظیر تدبیر حکمت اور فہم و فراست نے اسے سر اٹھانے اور نشو و نما پانے کا موقع نہیں دیا۔ حدیث بخاری سے ثابت ہے کہ ان کی مقدس ذات

اس فتنہ کے لئے بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ بالآخر انہیں شہید کر کے ان مفسدہ پردازوں نے اپنا راستہ صاف کر لیا۔

سیدنا عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے مبارک دورِ خلافت کے آخری حصہ میں یہود کی اس تحریک نے مزید ترقی کی جس کے متعدد اسباب تھے۔ پہلا سبب یہ تھا کہ اسلامی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا اور نومسلموں کی تعداد بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ ایران، مصر، عراق کے لوگ اسلامی پرچم کے سائے میں امن و امان کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی ایک نئی نسل جوان اور صاحب شعور ہو چکی تھی، جن میں سے بعض نے صحابہ کی گود میں پرورش تو پائی تھی مگر خود صحابی نہ تھے اور ایک کثیر تعداد ایسے مسلمانوں کی بھی تھی جنہوں نے آنکھیں تو کسی مسلمان گھرانے میں کھولیں مگر اس گھرانے میں کوئی صحابی نہ تھا۔ یہود کے کید و فریب سے نہ واقف تھے نہ ان کے والدین ان کا یہود کے دامِ فریب میں گرفتار ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا۔

ایران و مصر وغیرہ مفتوحہ ممالک میں نومسلموں کی ایک خاصی تعداد ایسے افراد کی بھی تھی جو مسلمان تو ہو گئے تھے مگر اسلام کو پورے طور پر سمجھے نہ تھے، وہ اسلام کی صداقت و حقانیت سے متاثر ہو کر اسلام نہیں لائے تھے بلکہ مسلمانوں کے ذہنی و اخلاقی تفوق اور ان کی سیاسی و حربی برتری سے مرعوب ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ باوجود مسلمان ہونے کے ان کا ذوق غیر اسلامی ہی تھا۔ اپنے پرانے مذہب کے بہت سے افکار باطلہ اور رسوم شنیعہ مسلمان ہونے کے بعد بھی ان کے اندر موجود رہے۔ درحقیقت انہوں نے اپنے مذہب کے افکار و عقائد باطلہ سے اپنے دل و دماغ کو آزاد نہیں کرایا تھا، نہ اسلامی افکار سے انہیں مغلوب و مقہور کرنے کی کوئی کوشش کی تھی بلکہ انہوں نے اسلامی افکار اور کافرانہ افکار میں بزعم خود ایک قسم کی مصالحت[1] کرا دی تھی۔ ان احوال کی وجہ سے یہود کی اس

---

[1] اس حالت کو موجودہ زمانے کی بعض مثالوں سے بہت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔
(باقی حاشیہ صفحہ ۳۲۱ پر)

ناپاک تحریک کو وہ خام مواد معتدبہ مقدار میں میسر ہو گیا جسے وہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے تھے اور جو انہیں عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں میسر نہیں ہو سکا تھا۔ اس سلسلہ میں ایران[1] کو اگر سر فہرست پر جگہ دی جائے تو بجا ہے اس لئے کہ وہاں اس تحریک کو قبول کرنے کی صلاحیت دوسرے مقامات سے بہت زیادہ تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ علاوہ ان نو مسلموں کے جو سمجھ بوجھ کر اسلام قبول کرنے کے بجائے محض مرعوبیت کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے، ایسے

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۲۰ کا) ہندوستان میں خاصی تعداد ایسے مسلمانوں کی پائی جاتی ہے جنہیں اسلام قبول کئے ہوئے کئی پشتیں گذر چکی تھیں مگر اب تک وہ بہت سے ہندوانہ رسوم و رواج پر عامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے بہت سے افکار و اعتقادات بھی ہندوانہ ہیں۔ اسی طرح انگریزی دور میں بکثرت نیچی ذات کے ہندو عیسائی ہو گئے تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ان کی اغلب اکثریت نے دوبارہ ہندو مذہب اختیار کر لیا حالانکہ مسیحیت اختیار کئے ہوئے انہیں ایک صدی سے زائد زمانہ گذر چکا تھا اور ان کی کئی پشتیں اسی مذہب پر گذر چکی تھیں۔ آج ہندوستان کے پڑھے لکھے مسلمانوں میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جس نے ہندو مذہب کے شعار کو (مثلاً قشقہ لگانا) کھلم کھلا اختیار کر لیا ہے یہاں تک کہ وہ لوگ اپنی اولاد کے نام بھی ہندوانے رکھنے لگے ہیں۔ حالانکہ اب بھی خود کو مسلمان ہی کہتے ہیں۔ وحدت ادیان کے داعیوں اور قائلوں کو بھی بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں صرف غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہونے والے افراد ہی نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو نسلی مسلمان ہیں۔ ان مثالوں سے اُس وقت کے اُن حالات کو سمجھا جا سکتا ہے جس کی نشان دہی ہم نے کی ہے ۱۲۔

---

[1] تاریخ شاہد ہے کہ ایران کی دوستی نے خلافت عباسیہ کا خاتمہ کیا۔ سلطنت مغلیہ کو بھی گھن بھی ایران دوستی کا گھن کھا گیا۔ اب پاکستان سے دوستی کے پینگ بڑھ رہے ہیں خدا خیر کرے۔ افسوس ہے برادران اہل سنت کی غفلت پر ۱۲۔

مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی تھی جو گو بوجہ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے مگر قبول اسلام کی وجہ سے کیانی جاہ و جلال سے ان کے جذبات کی وابستگی ختم نہیں ہو سکی تھی۔ ماضی کی ظاہری شان و شوکت پر فخر بے جا اور نسلی و قومی غرور و تکبر، باوجود حلقہ بگوش اسلام ہونے کے ان کے دماغ سے زائل نہیں ہوا تھا وہ باوجود مفتوح ہونے کے ایک غرور بے جا میں مبتلا تھے اپنے فاتح عربوں کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور زمانہ دراز گذر جانے پر بھی ان کے قدموں کے نیچے تاج کیانی کی پامالی کی کسک ان کے دل میں موجود تھی[1]۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ بہت آسانی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود کی پُر فریب اور منافقانہ تحریک میں شعوری طور پر نہیں تو غیر شعوری طور پر آلہ کار بنائے جا سکتے تھے۔

ان اسباب کے وجود نے دشمن اسلام یہود کے لئے میدان ہموار کر دیا تھا۔ اور دور عثمانی میں انہیں وہ ذرائع حاصل ہو گئے جو دور رسالت مآب اور اخبا فداہ یا دور شیخین میں نہیں حاصل ہو سکے تھے اس لئے انہوں نے اپنی تحریک کو نظم و عزم کے ساتھ آگے بڑھایا اور اپنے ناپاک و مفسدانہ مقاصد کے لئے نیا خاکہ تیار کر لیا۔ عمال عثمانی کے خلاف شورش، خلیفہ رسول کا قتل، حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جنگ و جدال، واقعہ کربلا، بنو امیہ پھر بنو عباس کے خلاف شورش وغیرہ سب اسی خاکے کے نقوش تھے اور سچ یہ ہے کہ ان باکمال فریب کار یہود نے ایسی ہوشیاری کے ساتھ اس شجرہ فتنہ کی کاشت کی تھی کہ آج تک اس کے

---

[1] دیکھئے ایران کا مشہور شیعہ شاعر فردوسی پشتینی مسلمان ہونے کے باوجود عربوں کا شکر گزار ہونے کے بجائے جن کی وجہ سے اسے دولت اسلام میسر ہوئی تھی تحقیر کے لہجہ میں ان کی فتح پر اظہار افسوس کرتا ہے ملاحظہ ہو۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیانی کند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

(شاہنامہ فردوسی) ۱۲

تلخ ثمرات مستقل فتنوں کی صورت میں باقی ہیں اور امت کے کام و دہن کو تلخ کرتے رہتے ہیں۔

تحریک کی ساخت اور شرکاء طریق کار

مودودی صاحب نے قاتلین عثمانؓ کا جرم ہلکا کرنے کی امکانی کوشش کی ہے اور دو صاف طریقے سے شورش کا اصل ذمہ دار خود سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو قرار دینا چاہتے ہیں اس لئے انہوں نے شورش کے اس پس منظر کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

"حضرت عثمانؓ کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی یا وہ محض اہل عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے" ص ۳۲۸

گویا موصوف کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ یہ ہے کہ اس فتنے کا پورا ذمہ دار سیدنا حضرت عثمانؓ کو قرار دیا جائے چنانچہ صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں :-

"فتنے کے آغاز کی اصل وجہ وہ بے اطمینانی ہی تھی جو اپنے اقرباء کے معاملہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی وجہ سے عوام اور خواص میں پیدا ہو گئی تھی اور یہی بے اطمینانی ان کے خلاف سازش کرنے والے فتنہ پرداز گروہ کے لئے مددگار بن گئی" ص ۳۲۲

عوام و خواص میں کسی بے اطمینانی کا وجود تھا بھی یا نہیں اس مسئلہ پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور حسب ضرورت انشاء اللہ آئندہ بھی گفتگو کرینگے۔ یہاں تو ہمیں یہ دکھانا ہے کہ مودودی صاحب نے عوام و خواص کی مفروضہ "بے اطمینانی" کو ثابت کرنے کی سعی لاحاصل میں تو کئی صفحے سیاہ کر دیئے لیکن اس بحث کو تشنہ ہی چھوڑ دینا مناسب خیال فرمایا کہ یہ سازش کرنے والا فتنہ پرداز

گروہ" کون تھا؟ اس کی ساخت اور اس کا طریق کار (تکنیک) کیا تھا؟ اور سازش سے اس کا مقصد کیا تھا؟

اگر مودودی صاحب ان سوالات کا جواب دیتے تو ان کا پورا طلسم ٹوٹ جاتا۔ نہ حضرت عثمانؓ پر الزام لگایا جاسکتا نہ سبائیوں کا جرم ہلکا کیا جاسکتا۔ عوام و خواص کی بے اطمینانی کا افسانہ تو انھوں نے صرف اس لئے تراشا ہے کہ ناظرین پر یہ اثر ڈالیں کہ اگر زیر بحث فتنہ صرف ابن سبا اور دیگر یہود کی مفسدانہ سازش کا نتیجہ ہوتا تو مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی کیوں کر حضرت عثمانؓ کے مخالف اور شورش پسندوں کے کسی نہ کسی درجہ میں ہم نوا ہو جاتے۔

مودودی صاحب کے اس دقیق مغالطہ کی قلعی خود بخود کھل جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کہ اس مفسدانہ تحریک کی زمام کار درحقیقت یہود کے ہاتھ میں تھی اور چوٹی کے لیڈر وہی تھے ان میں بعض تو بالکل پس پردہ تھے اور بعض نفاق کی نقاب چہرے پر ڈال کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے یہی وہ لوگ تھے جن کے ہاتھ میں جماعت کی پالیسی تھی اور یہی فتنہ و فساد کے غلغلے تیار کرتے تھے ان کے بعد وہ طبقہ تھا جن کا لقب کچھ مدت کے بعد شیعہ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے دینی و مذہبی عقائد و خیالات کو ان یہود نے بگاڑ کر عام مسلمانوں سے انہیں الگ کر دیا تھا۔ تیسرا طبقہ ان مسلمانوں کا تھا جو عقائد و افکار کے اعتبار سے تو عام اہل اسلام سے مختلف نہ تھے مگر یہود کے اغوا کے اثر سے حضرت عثمانؓ کے دشمن ہو گئے تھے۔ درحقیقت تحریک کی اصل باگ ڈور تو یہود ہی کے ہاتھ میں تھی اور یہ دونوں گروہ ان کے لئے صرف آلہ کار تھے۔ دوسرا طبقہ اپنی متاع دین کا بھی معتد بہ حصہ یہود کی نذر کر چکا تھا اس لئے وہ ان سے قرب و مناسبت بھی زیادہ رکھتا تھا اور بہت سے مفسدانہ کاموں کا خاکہ بنانے میں بھی اسے کبھی کبھار حصہ مل جاتا تھا۔ لیکن تیسرا طبقہ تو بالکل کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتا تھا اور یہود اسے حسب مرضی مناسب مواقع پر استعمال کرتے تھے۔

یہ تھی ساخت اور شکل اس جماعت کی جس کی بے راہ روی اور فساد انگیزی نے ملت اسلامیہ پر ایسا کاری زخم لگایا جو آج تک مندمل نہ ہو سکا۔ اس ڈھانچہ کی صحیح تصویر سامنے لانے کے لئے موجودہ زمانے کی ایک یہودی جماعت کو بطور مثال و نمونہ پیش کرنا مفید ہوگا۔ یہ جماعت فری میسن (FREEMASSON) کے نام سے مشہور ہے جس کے لاکھوں ارکان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں یہ تحریک درحقیقت اسلام اور عیسائیت دونوں کے خلاف ہے اور دونوں کو نقصان پہنچانا ہی اس کا مقصد ہے مگر لاکھوں مسلمان اور عیسائی اس کے ممبر ہیں اور یہود کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ اس کی پالیسی اور لائحہ عمل یہود کا وہ حلقہ مقرر کرتا ہے جس سے عام ممبران بالکل ناواقف ہوتے ہیں اور یہ مسلمان و مسیحی بسا اوقات غیر شعوری طور پر اپنے دین اور اپنی قوم کو نقصان پہنچانے میں ان کے معاون ہو جاتے ہیں۔

یہ تحریک درحقیقت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف نہ تھی۔ نہ مخصوص طور پر بنی امیہ کو نشانہ بنانا ان فتنہ پردازوں کا مقصد تھا بلکہ اس تحریک کا حقیقی مقصد اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ کی جگہ حضرت علیؓ ہوتے تو اس تحریک کا رخ ان کے خلاف ہوتا۔ یہ مفسد یہود ایک طرف تو مسلمانوں کو صحابہ کرام سے بدگمان بنا کر اور انہیں عقائد باطلہ کی تعلیم دے کر گمراہ کرنا چاہتے تھے اور ان میں نئے نئے فرقے پیدا کر کے دین حق سے انہیں بیگانہ بنانا چاہتے تھے، دوسری طرف خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچا کر مسلمانوں کے مجتمع شیرازے کو پراگندہ اور ان میں سیاسی اختلافات پیدا کر کے ان کی اجتماعی طاقت کو توڑنا چاہتے تھے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اعلیٰ تدبر، مثالی تدبیر مملکت، بہترین حکمت عملی اور اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت نے مدت دراز تک اس مفسد اور فتنہ انگیز یہود کی تنظیم و تحریک کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا لیکن جب ان مفسدوں نے دیکھا کہ سیدنا عثمانؓ کی موجودگی میں ہماری کوئی چال

کامیاب نہیں ہو سکتی ہے تو اچانک انہیں شہید کر کے اپنا راستہ صاف کر لیا۔ اس حادثہ کے بعد بھی دین اسلام کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے البتہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو منتشر کرنے اور ان کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

عہد عثمانی میں اس منافقانہ تحریک کی قوت میں اضافہ ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ایک بہت مکار اور پرفن لیڈر میسر ہو گیا تھا جس کا نام عبداللہ ابن سبا تھا، اور ابن السوداء کے نام سے بھی معروف تھا۔ یہ شخص یہودی تھا مگر اس نے منافقانہ طور پر عہد عثمانیؓ میں اسلام قبول کر لیا یعنی باطن میں تو یہودی ہی رہا، لیکن مسلمانوں کو فریب دینے اور اپنی ناپاک تدبیروں کو بروئے کار لانے کے لئے بظاہر مسلمان بن گیا۔

لے مشہور مصری ملحد ڈاکٹر طہ حسین نے جو خود بھی سیدنا حضرت عثمانؓ کے ویسے ہی مخالف ہیں جیسے مودودی صاحب، ابن سبا کی شخصیت ہی کا انکار کیا ہے ان کے نزدیک یہ ایک فرضی کیرکٹر تھا لیکن انہوں نے شیعوں اور یہود کو خوش کرنے کے لئے یہ خلاف حقیقت دعویٰ کیا ہے ورنہ تاریخ کا کوئی طالب علم اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ تاریخ طبری میں ابن سبا کا تذکرہ متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً ۳۵ھ کے احوال میں اس کا اور اس کے مشن کا تذکرہ ہے۔ یہ روایت عنقریب ہم نقل کریں گے اسی طرح اس سن کے احوال میں جہاں مفسدین اور باغیوں کی آمد مدینہ کا تذکرہ ہے وہاں لکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ابن السوداء بھی تھا۔ البدایہ والنہایہ میں جنگ جمل کے موقع پر بھی اس کی موجودگی کا تذکرہ ہے۔ مشہور شیعی عالم اور شیعی فن رجال کے ماہر علامہ محمد کشی نے اپنی کتاب میں جو رجال کشی کے نام سے مشہور ہے لکھتے ہیں وذکر اہل العلم ان عبد اللہ بن سبا کان یہودیا فاسلم ووالی علیا وکان یقول وہو علی یہودیتہ فی یوشع بن نون وصی موسیٰ فقال فی اسلامہ فی علیؓ مثل ذالک۔

اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا اس کے بعد مسلمان ہو گیا اور حضرت علیؓ سے اس نے موالاۃ کا اظہار کیا وہ اپنی یہودیت کے زمانہ میں اس بات کا قائل تھا کہ حضرت یوشع بن

(باقی اگلے صفحے پہ ملاحظہ فرمائیے)

ہیں اسے اس خوفناک اور قابلِ نفرت تحریک کا بانی تو نہیں تسلیم کرتا البتہ اس کا مجدد مانتا ہوں وہ تحریک جو مشہور منافق عبداللہ بن ابی ابن سلول نے شروع کی تھی اس میں اس شخص نے نئی جان ڈال دی اور اسے نیا رخ دیا۔ بانی تحریک تو دنیا سے ناکام و نامراد گیا مگر اس کا یہ ہوشیار جانشین خاصی حد تک کامیاب ہو گیا۔

مودودی صاحب کا دعویٰ ــــــ فتنہ کی ابتداء

مودودی صاحب کا مندرجہ بالا دعویٰ درحقیقت دو دعووں پر مشتمل ہے (۱) فتنہ کا سبب اپنے اقربا کے بارے میں حضرت عثمانؓ کی پالیسی تھی اور (۲) ان کی اس پالیسی سے عوام و خواص ناراض تھے یعنی رائے عامہ ان کے خلاف ہو گئی تھی۔ آئیے دونوں دعووں کو دلائل کی روشنی میں پرکھیں۔ انہوں نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ کسی نہ کسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شورش کا ذمہ دار قرار دیں اور سبائیوں کے جرم کو امکانی حد تک ہلکا کر دیں۔ اس لئے وہ طبری کی ان روایتوں کو تو ذکر کرتے ہیں جن کی زد حضرت عثمانؓ پر پڑتی ہے اور ان روایتوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری شورش بدباطن سبائیوں کی کارستانی تھی بیڈ حضرت عثمانؓ کے کسی فعل کو بھی اس میں دخل نہ تھا۔ طبری کی مندرجہ ذیل روایت ملاحظہ ہو اس سے زیر بحث شورش کی بنیاد اور اس کے اصل سبب پر خوب روشنی پڑتی ہے اور بانی فساد کا مکروہ چہرہ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

(ص ۳۲۶ سے آگے) ذون (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے وصی ہیں۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے (حضرت) علیؓ کے متعلق بھی یہی کہا۔ ان تذکروں کے بعد اس کے وجود کا انکار کرنا عجیب دیدہ دلیری ہے۔

"عبد اللہ بن سبا ایک یہودی تھا جس کا وطن صنعاء (یمن کا ایک شہر) میں تھا اس کی ماں سوداء (کلوٹی) تھی وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں (منافقانہ) مسلمان ہوگیا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے مختلف اسلامی شہروں میں اس نے دورے شروع کر دیئے (پہلے حجاز آیا۔ پھر بصرہ۔ کوفہ اور شام گیا۔ شام میں اسے کوئی معاون نہ مل سکا اور وہاں کے لوگوں نے ملک بدر کر دیا تو وہ بھاگ کر مصر پہنچا ....

اس نے ناواقف نومسلموں میں جو عقائد باطلہ پھیلائے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:—

"ایک ہزار انبیا گذرے ہیں اور ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور (حضرت) علیؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے؟ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں اور (حضرت) علیؓ خاتم الاولیاء۔ اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس نے وصی رسول کے حق پر دست درازی کی .... پھر اس نے کہا کہ (حضرت) عثمانؓ نے (خلافت) پر بغیر استحقاق کے قبضہ کر لیا ہے اور یہ (حضرت علیؓ) وصی رسول ہیں تو اس بارے میں تم لوگ اٹھو اور انہیں ہلا دو جس کی ابتداء اپنے امراء (عمال عثمانیؓ) پر طعن و تشنیع سے کرو اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرو ..... پھر اس نے اپنے داعیوں کو مختلف اسلامی ممالک میں بھیجا جو خفیہ طور پر تو اس کی (اباوت اور مندرجہ بالا عقیدۂ فاسدہ کی) تبلیغ کرتے تھے اور ظاہر میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے تھے (یعنی ظاہر میں مصلح و مبلغ بنے ہوئے تھے)۔"

اپنے مفسدانہ عزائم کی تکمیل کے لئے جو طریقہ انہوں نے استعمال کیا وہ یہ تھا:—

ہر شہر کے یہ مفسد دوسرے شہر کے مفسدوں کو خطوط لکھتے تھے جس میں اپنے امراء و حکام کی مذمت کرتے تھے۔ (تاریخ طبری جلد پنجم مطبوعہ مصر ص ۹۸ احوال ۳۵ھ)

اسی طویل روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس پروپیگنڈے کی خبر شدہ شدہ حضرت عثمان رضی تک پہنچی تو انہوں نے ایک کمیشن مقرر کر کے بھیجا تاکہ یہ معلوم کریں کہ ان کے عمال کے متعلق مبینہ شکایتیں صحیح ہیں یا غلط؟ کمیشن نے ان سب ممالک کا دورہ کر کے رپورٹ پیش کی کہ سب شکایتیں بالکل بے اصل اور جھوٹی ہیں عوام وخواص ان حکام وعمال سے بالکل مطمئن اور خوش ہیں۔ (حوالہ مذکورہ)

اس روایت سے مودودی صاحب کے پہلے دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے اور ان کا باطل ہونا اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔ روایت صاف صاف کہہ رہی ہے کہ فتنہ کا سبب یہ تھا کہ مفسدوں کی ایک جماعت فتنہ پیدا کرنا چاہتی تھی حضرت عثمان رضی نے نہ کوئی غلطی کی نہ ان کے طرزِ عمل کو اس میں دخل تھا۔ بنو امیہ کو عہدے دینے کے معاملہ کو محض بہانہ بنایا گیا تھا۔ اگر عمالِ عثمان رضی اموی نہ ہوتے تو کسی اور چیز کو بہانہ بنا لیا جاتا "خوئے بد را بہانہ بسیار"

اس روایت کے علاوہ مندرجہ ذیل دلائل بھی اس حقیقت کو عیاں اور مودودی صاحب کے دعوے ابطال کر رہے ہیں۔

(۲) مودودی صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۲۹ پر جو روایت[1] اپنی تائید میں طبقات ابن سعد

---

[1] صفحات سابقہ میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ واقدی کی روایت ہے اور بالکل جعلی ہے لیکن چونکہ مودودی صاحب نے اس سے استدلال کیا ہے اس لئے ان پر حجت ہے۔ اس کے علاوہ اس سے اس موضوع پر راویوں کے اختلافِ بیان بلکہ تناقض روایات پر بھی روشنی پڑتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقدی وغیرہ دشمنانِ صحابہ نے مختلف اوقات میں وقتی مصالح کے لحاظ سے اس قسم کی روایتیں گھڑی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تناقض واختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قابلِ ذکر لطیفہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے اس روایت کے ایک فقرہ لتخذ الاموال

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

جلد ۴ ص۳۲ سے نقل کی ہے اس کے ابتدائی حصے میں (جسے مودودی صاحب نے نقل نہیں کیا ہے) اس بات کی صراحت ہے کہ خلافت کے ابتدائی چھ سالوں میں عوام و خواص حضرت عثمان سے بہت خوش رہے اور ان سے انہیں کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ روایت کا جو حصہ مودودی صاحب نے نقل کیا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ روایت کی عبارت یہ ہے۔ "استعمل اقربا و اہل بیتہ فی الست الاواخر" اور اپنے اقربا اور گھرانے والوں کو (خلافت کے) آخری چھ سال میں عہدے دیئے۔ اس کا مفہوم واضح ہے کہ ابتدائی چھ سال میں عہدے نہیں دیئے اور کسی کو کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔ اس روایت سے قطع نظر یہ بات تقریباً تواتر سے ثابت اور ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خلافت عثمانی کے ابتدائی چھ سالوں میں حضرت عثمانؓ کے خلاف کسی نے کسی شکایت کا اظہار نہیں کیا۔

اس مسلمہ واقعہ کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد واقعات کے اوقات[۱] پر نظر ڈالئے۔ سیدنا عثمان ذی النورین باختلاف روایت ذی الحجہ ۲۳ھ یا محرم ۲۴ھ میں سریر آرائے خلافت ہوئے کوفہ کی گورنری سے حضرت سعدؓ کی معزولی اور ان کی جگہ حضرت ولیدؓ کے تقرر کا واقعہ ۲۶ھ میں ہوا۔ افریقہ کی فتح، حضرت عمرو بن العاص کی مصر سے معزولی اور ان کی جگہ حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا تقرر یہ سب واقعات ۲۷ھ کے ہیں۔ بصرے سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی معزولی اور ان کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن عامر کا تقرر ۲۹ھ کا واقعہ ہے حضرت معاویہؓ تو حضرت عمرؓ کے زمانہ ہی سے گورنری پر فائز چلے آرہے تھے۔ خمس افریقہ حضرت مروانؓ کو عطا فرمانے کا واقعہ اگر بالفرض صحیح

(پچھلے صفحہ سے آگے) "واستسلف من بیت المال" کا ترجمہ یہ کیا ہے "انہوں نے بیت المال سے قرض بھی لیا اور قرض رقمیں بھی لیں" حالانکہ "استسلف الاموال" کا ترجمہ صرف یہ ہے کہ "روپیہ لیا یا حاصل کیا" لفظ بیت المال مودودی صاحب نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ معلوم نہیں اس کارروائی کو جماعت اسلامی کے اخلاقی ضابطوں میں کیا کہتے ہیں؟ ہم گنہگار تو اسے خیانت کہتے ہیں۔

[۱] جملہ طبری جلد پنجم سے نقل کئے گئے ہیں۔

مانا جائے تو اسے بھی ۳۲ھ ہی میں جگہ دینا پڑے گی۔ گویا وہ سب واقعات جن کے مجموعے کو مودودی صاحب نے "اپنے اقرباء کے متعلق حضرت عثمانؓ کی پالیسی" کے مختصر عنوان سے تعبیر کیا ہے، ان کی خلافت کے ابتدائی چھ سال کے اندر پیش آچکے تھے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب یہ واقعات پیش آئے اس وقت بلکہ اس کے بعد بھی سال دو سال تک کسی کو کوئی شکایت نہ پیدا ہوئی، شکایت پیدا ہوئی تو چھ سال کے بعد جبکہ یہ واقعات پرانے ہو چکے تھے؟ جس شخص میں ذرا بھی عقل و انصاف ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ درحقیقت حضرت عثمانؓ نے اپنے اقربا کے معاملہ میں کوئی قابل اعتراض پالیسی نہیں اختیار کی تھی اور نہ کسی کو ان سے کوئی شکایت تھی۔ سبائی مفسدوں نے یہ جھوٹا الزام ان پر محض فتنہ پیدا کرنے کے لئے اپنی طرف سے گڑھا تھا۔ عام پبلک بالکل مطمئن تھی۔ اس کی طرف سے شکایت کی حکایت محض جھوٹ اور افترا ہے۔

(۳) صفحات سابقہ میں ہم عرض کر چکے ہیں۔ مگر یہاں مناسبت مقام کے لحاظ سے اس امر کی پھر یاد دہانی کرتے ہیں کہ ان مفسد سبائیوں کو اگر حضرت عثمانؓ کی زیر بحث پالیسی سے واقعی شکایت تھی تو حضرت علیؓ سے کیوں شکایت نہیں پیدا ہوئی؟ انہوں نے بھی تو اپنے اعزا و اقارب کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا۔ ہم نے مانا کہ بقول مودودی صاحب ان کا عذر یہ تھا کہ بہت سے صحابہ کرام کی غیر جانبداری کی وجہ سے انہیں ان خدمات کے لئے موزوں آدمی نہیں ملے تھے۔ لیکن اول تو ان مفسدین یعنی قاتلین عثمانؓ کے مزاج خبیث سے بعید تھا کہ وہ اس عذر کو قبول کر لیتے، وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم میں سے کچھ افراد کو ان کی جگہ مقرر کیا جاتا۔ ان کے دل میں صحابہ کرام کی قدر ہی کیا تھی، دوسرے بقول مودودی صاحب جنگ صفین میں تو آٹھ سو[1] ایسے صحابی حضرت علیؓ کی طرف سے شریک جنگ تھے جو بیعت

---

[1] یہ بات انہوں نے استیعاب سے نقل کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صاحب استیعاب کی ذہنی اختراع ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے اس کی کوئی سند انہوں نے نہیں ذکر کی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

رضوان میں شرکت کر چکے تھے۔ پھر اس جنگ کے بعد یا اس کے قریب ان سبائیوں نے حضرت علیؓ سے
یہ مطالبہ کیوں نہ کیا کہ اپنے خاندان والوں کو عہدوں سے ہٹا کر ان میں سے عہدیدار مقرر کیجئے؟ اس سے
صاف ظاہر ہے کہ ان مفسدوں کو درحقیقت حضرت عثمان کے طرزِ عمل سے کوئی شکایت نہ تھی اور ان کا
طرزِ عمل ہرگز موجبِ اشتعال نہیں تھا بلکہ سبائیوں کو فتنہ بپا کرنا مقصود ہی تھا اس کے لئے انہوں
نے یہ بہانا تراشا تھا۔

(صـ ٣٣١ سے آگے) بیعت رضوان میں شرکا کی کل تعداد کیا تھی؟ روایات حدیث کے بموجب کل چودہ سو تھی ان میں
سے بکثرت اس وقت تک غزوات و حوادث میں شہید ہو چکے تھے۔ خاصی تعداد میں انتقال
فرما چکے تھے۔ اس وقت بھی ان میں سے ایک تعداد ضعیف یا بیمار تھی (مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر
رضی اللہ عنہما) ان سب کو چودہ سو سے تفریق کرنے کے بعد یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ جنگ صفین میں اس
جماعت کے آٹھ سو حضرات شریک ہوں۔ اتنی تعداد اس وقت تک باقی رہنا بھی بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے
جنگ میں ان کی شرکت۔ اس کے ساتھ اس کو بھی ملحوظ رکھئے کہ ان میں سے کچھ حضرات حضرت معاویہؓ کے
ہمدرد بھی تھے تو یہ تعداد اور بھی بعید از قیاس ہو جاتی ہے۔ پھر کیا کسی نے جنگ صفین کے موقع پر مخصوص
طریقے سے انہیں شمار کیا تھا؟ یا ان کی کوئی فہرست تیار کی گئی تھی؟ تاریخ میں اس کا کوئی نشان نہیں
ملتا یہ تعداد کیسے متعین ہو گئی؟ اور چار سو برس کے بعد صاحب استیعاب کو اس کی خبر کیسے ہو گئی؟
صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی سبائی کی اڑائی ہوئی ہوائی ہے جو صاحب استیعاب نے اپنی کتاب میں ڈال لی ہے
صحیح روایت جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی ہے اور جس کی سند کو امام ابن تیمیہ نے
روئے زمین پر صحیح ترین فرمایا ہے یہ ہے کہ طرفین سے جنگ میں شریک ہونے والے صحابہؓ کی مجموعی
تعداد صرف تیس تھی۔ حالانکہ اس وقت دس ہزار اصحاب نبیؐ روئے زمین پر موجود تھے لیکن ان
کے علاوہ سب غیر جانبدار رہے۔

(۴) اگر امویوں کا عہدوں پر تقرر ہی سبائی مفسدوں کے لئے باعث شکایت بنا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ غیر اموی عمال کے خلاف بھی انہوں نے شورشیں برپا کیں؟ مثلاً سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اہل کوفہ نے حضرت سعدؓ کی جھوٹی شکایت کی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بصرے والوں نے حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کی شکایت کی[1] اور وہ بھی درحقیقت غلط تھی۔ یہ لوگ تو اموی نہ تھے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ شورش و فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ درحقیقت انہیں کوئی شکایت نہ تھی اور حضرت عثمانؓ کا طرز عمل ہرگز ان کا معاون یا موجب شکایت نہ تھا۔

(۵) طبری وغیرہ کتب تاریخ سے ظاہر ہے کہ ان مفسدوں نے حضرت عثمانؓ پر صرف یہی الزام نہیں لگایا تھا کہ وہ اقربا پروری کر رہے ہیں بلکہ بعض دوسرے بے اصل اور لغو الزامات بھی لگاتے تھے مثلاً منیٰ میں اتمام صلوٰۃ یا بیعت رضوان میں عدم شرکت یا غزوۂ بدر میں شریک نہ ہونا۔ یہ سب الزام ذاتی اور شخصی تھے، اس کے ساتھ بہت ہی مہمل اور لغو تھے انہیں دیکھ کر ہر منصف مزاج یہ فیصلہ کرے گا کہ الزام لگانے والوں کو سیدنا عثمانؓ سے صرف ذاتی پرخاش تھی۔ درحقیقت کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ ان کے خلاف ہر قیمت پر شورش برپا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے اعتراضات اور شکایتیں اختراع کر رہے تھے واقعتاً ان میں کوئی ایسی کمزوری نہیں تھی جو قابل اعتراض ہوتی۔

(۶) فتنہ کی ابتدا کے وقت ان مفسدوں نے حضرت عثمانؓ کے اموی عمال کی کوئی شکایت نہیں کی بلکہ فتنہ پردازوں کے بعض نمایاں لیڈر کوفہ میں اموی گورنر حضرت سعیدؓ کی مجلس میں شریک ہوتے تھے اور ان کے دربار کے حاشیہ نشین تھے ان میں مالک اشتر بھی تھا جو اپنی خباثت نفس کی وجہ سے

---

[1] حضرت ابوموسیٰ اشعری کی شکایت جس عنوان سے کی گئی اور ان پر اتہام کرنے کا جو الزام لگایا گیا اسی قسم کی شکایت کرنے والوں سے جس طرح سے گفتگو کی ان سب امور کو جو شخص غور سے دیکھے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ شکایت کرنے والے یا تو خود سبائی تھے یا سبائیوں کے بہکائے ہوئے تھے دیکھئے طبری وغیرہ۔

راس المفسدین کے لقب کا مستحق ہے طبری کی مندرجہ ذیل روایت بتا رہی ہے کہ ابتداءِ فتنہ میں ان بد باطن سبائیوں کو بنو امیہ کے اقتدار پر نہیں بلکہ قریش کے اقتدار و تفوق پر اعتراض اور غیظ و غضب تھا۔

روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سعیدؓ کی مجلس میں مالک اشتر اور کچھ اس کے دوسرے مفسد رفقاء بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا :۔

"کہ یہ سرزمین قریش کا باغ ہے۔" اس پر اشتر بولا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ جو زمین اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری تلواروں کے ذریعہ سے عطا فرمائی ہے وہ تمہارے اور تمہاری قوم کے لئے باغ ہے ؟۔ خدا کی قسم تم میں سے بڑے سے بڑا حصہ پانیوالے کو بھی ہم میں سے کسی فرد سے زائد حصہ نہیں مل سکتا۔"

(طبری جلد پنجم احوال ۳۳ھ)

اس روایت سے پہلے ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ جب ان سبائیوں کو حضرت سعیدؓ بن العاص نے بحکم حضرت عثمانؓ حضرت معاویہؓ کی خدمت میں شام بھیجا تو ممدوح نے ان کے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ کیا اور انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش فرمائی اس گفتگو میں حضرت موصوف فرماتے ہیں :۔

وقد بلغنی انکم نقمتم	اور مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم قریش کی
قریشا۔	مذمت کرتے ہو۔ (حوالا بالا)

سبائیوں کا ایک نمائندہ جوابی تقریر میں کہتا ہے۔

واما ما ذکرت من قریش	اور تم نے جو قریش کا تذکرہ کیا ہے ان سے
فانها لم تکن اکثر العرب	ہمیں کیا ڈراتے ہو وہ جاہلیت کے زمانہ میں
ولا امنعها فی الجاهلیة	عرب میں تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ تھے
فتخوفنا۔	اور نہ زیادہ حربی قوت رکھتے تھے (حوالہ بالا)

ان روایتوں سے ظاہر ہے کہ اس سبائی پارٹی کو قریش ہی سے مخالفت تھی اور صرف بنو امیہ میں بلکہ پورے قبیلہ قریش کے خلاف شورش برپا کرنا چاہتے تھے لیکن جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ قریشی و غیر قریشی کا سوال مصنوعی طور پر پیدا کر کے تفریق بین المسلمین اور فتنہ و فساد کا مقصد نہیں حاصل کیا جا سکتا تو انہوں نے اپنے نعرے میں تغیر کیا اور اپنی "تکنیک" میں تبدیلی کی اور اموی و غیر اموی کی بحث چھیڑ کر تفریق و انتشار پھیلانے کی کوشش کی، اس میں بھی ناکامی ہوئی تو عمال عثمانیؓ کی جھوٹی شکایتیں کر کے فتنہ برپا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے[1]

سوال یہ ہے کہ اگر واقعی اموی عمال مقرر کرنا سعید نا حضرت عثمانؓ کی غلطی تھی اور اسی غلطی نے کچھ لوگوں (سبائیوں) کو فتنہ و فساد پر آمادہ کیا تھا تو ابتدا ہی سے اسی بات کا انہوں نے کیوں نہ اٹھایا کیا؟ پہلے قریش کی مخالفت کیوں ظاہر کی؟

یہاں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ مودودی صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ چونکہ سبائیوں نے اپنے فتنہ کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے خاندان والوں کو عہدے دیئے ہیں اور ان سے زیادہ مستحق حضرات کو نظر انداز کیا ہے اس لئے آپ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ حضرت عثمانؓ کی غلطی تھی جو درحقیقت فساد کا سبب بنی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آپ ہی کے استدلال سے کام لیکر یہ کہے کہ چونکہ فتنہ کی ابتدا قریش کی مخالفت اور ان کے تفوق و برتری سے ہوئی تھی اس لئے

---

[1] نسلی و وطنی وغیرہ غیر اسلامی عصبیتیں ابھار کر مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا اور اس سے فائدہ اٹھا کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنا یہود اور ان کے شاگرد ابن رشید سبائیوں کی پرانی تکنیک ہے۔ آج بھی پاکستان میں بنگالی و غیر بنگالی، سندھی و پنجابی وغیرہ کے سوالات درحقیقت انہیں سبائیوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ لوگ عموماً ہیں پردہ رہتے ہیں۔ عوام اہل سنت کی غفلت اور ان کے لیڈروں کی خیانت کی وجہ سے یہ لوگ کامیاب ہو رہے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

قریش کو مناصب عالیہ دینا غلطی تھی اور ایسی غلطی تھی جس کی وجہ سے اتنا بڑا اور منحوس ہنگامہ برپا ہوا اور فتنہ کا سبب امویوں کا غلبہ نہ تھا بلکہ قریش کا غلبہ تھا، تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

یہ بات بالکل واضح ہے کہ قریش کو ترجیح خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی ان کا غلبہ خود آنحضور کے حکم اور آپ کی مرضی کا رہین منت تھا اور یہ ترجیح صرف وقتی نہ تھی بلکہ الائمۃ من قریش فرما کر آنحضور نے ان کے لئے ایک دائمی وجہ ترجیح مقرر فرما دی تو کیا معاذ اللہ آپ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی غلطی کا امکان تھا؟ غور کیجئے کہ موصوف کا طرز فکر انہیں کدھر لئے جا رہا ہے اور ان کے باطل استدلال سے کیسا باطل اور ہولناک نتیجہ نکلتا ہے جس کا تصور بھی کوئی مومن گوارا نہیں کر سکتا۔

مندرجہ بالا دلائل سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اس فتنہ و شورش کا سبب حضرت عثمانؓ کی کوئی پالیسی نہ تھی نہ ان کی کوئی غلطی اس کا باعث تھی بلکہ یہ صرف یہود اور سبائیوں کی سازش تھی جو فتنہ برپا کر کے مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو پراگندہ کرنا اور دین وملت کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کہ اس فتنہ کا سبب حضرت عثمانؓ کی وہ پالیسی تھی جو انہوں نے اپنے اقرباء کے حق میں اختیار کی تھی بالکل باطل، لغو، سیدنا ذی النورینؓ پر بہتان اور تاریخ کو مسخ کرنے کے مرادف ہے۔ مودودی صاحب کا یہ قول:-

> "کیا اس بات کو ماننے میں بھی تامل کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے ہٹ کر جو پالیسی اختیار کی وہ بلحاظ تدبیر نامناسب بھی تھی اور عملاً سخت نقصان دہ بھی ثابت ہوئی:" ص ۳۲۲

صراحۃً باطل، بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہونے کے علاوہ ان کی ضد اور سخن پروری کی علامت ہے صفحات سابقہ میں ہم دکھا چکے ہیں کہ حضرات شیخین کی اقرباء کے معاملہ میں کوئی ایسی پالیسی نہ تھی جس سے ہٹنے کا سوال

پیدا ہو۔ یہ پالیسی صرف مودودی صاحب کی ذہنی اختراع ہے۔ رہا یہ لحاظ تدبیر نامناسب ہونا تو یہ بھی موصوف کا دعویٰ بلا دلیل ہے اس کا بار ثبوت ان پر ہے مگر وہ اسے ثابت نہیں کر سکے نہ کر سکتے ہیں مندرجہ بالا دلائل تو اس کی لغویت کو اور زیادہ روشن کر دیتے ہیں۔ اس طرح "عملاً نقصان دہ ثابت ہونے" کا دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد و محروم دلیل ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے یہ ثابت کیجئے کہ جو نقصان پہنچا (یعنی جو فتنہ پیدا ہوا) وہ اس مبینہ پالیسی کا نتیجہ تھا۔ اسے آپ نہ ثابت کر سکے ہیں اور نہ قیامت تک ثابت کر سکتے ہیں دعوے کو بار بار دہرانے سے وہ ثابت نہیں ہو جاتا۔ اس کے برعکس مندرجہ بالا دلائل سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو جو نقصان پہنچا وہ ہرگز حضرت عثمانؓ کی کسی پالیسی کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ سبائیوں کی خبیثانہ سازش اور فتنہ پردازی کا نتیجہ تھا۔ اس کا رشتہ حضرت عثمانؓ کی کسی پالیسی سے جوڑنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ہندوستان کے ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا رشتہ اسلام سے جوڑ کر یہ کہے کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہ تو شریعت کی غلطی ہے کہ اس نے ایسے ماحول میں اسلام کے اظہار ہی کا کیوں حکم دیا؟ یہ کیوں نہیں کیا کہ ایسے وقت میں اسلامی احکام چھوڑ کر ظاہر میں بالکل ہندو بن جانا اور مشرکانہ اعمال و شعائر اختیار کر لینا بالکل جائز کر دیتی۔ جس طرح یہ طرز فکر غلط سراپا باطل اور فساد خالص ہے، اسی طرح مودودی صاحب کا اس فتنہ کو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کرنا سراپا کذب و بطلان اور مضحکہ خیز حد تک لغو نظریہ ہے۔

اسی سلسلہ میں موصوف نے اپنے اس غلط دعوے کی ایک عجیب دلیل پیش کی ہے فرماتے ہیں:

> اگر لوگوں میں ناراضی پیدا ہونے کے واقعی اسباب موجود نہ ہوتے اور ناراضی فی الواقع موجود نہ ہوتی تو کوئی سازشی گروہ شورش برپا کرنے صحابی[1] اور صحابی زادوں تک

---

[1] یہ بالکل غلط ہے۔ حق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف اس شورش میں ایک صحابی بھی شامل نہ تھا

کو اس کے اندر شامل کر لینے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ (ص ۳۲۸-۳۲۹)

گویا قاعدہ کلیہ یہ بنا کہ جہاں بھی اقتدار کے خلاف کوئی شورش پیدا ہو وہاں یہ لازم ہے کہ صاحب اقتدار کی کوئی غلطی ضرور ہو گی اس عجیب و غریب قاعدہ کلیہ کا باطل ہونا اہل فہم کے نزدیک تو اس قدر واضح ہے کہ اس کی تردید و تنقید کی حاجت ہی نہیں ہے لیکن یہ کم فہموں اور ناواقفوں کے لئے دام فریب ثابت ہو سکتا ہے اس لئے جواباً چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

اول۔ اتنا وسیع قاعدہ تو وضع فرما دیا گیا مگر اس کی بنیاد کسی عقلی یا نقلی دلیل پر نہیں رکھی گئی ہے، جس کے بغیر اس کی حیثیت ایک مشورہ منشور سے زیادہ نہیں باقی رہتی۔

دوم۔ اگر عام پبلک میں حضرت عثمانؓ یا ان کے مقرر کردہ عمال و حکام سے ناراضگی پائی جاتی، اس وقت تو کسی درجہ میں یہ شبہ ہو بھی سکتا تھا کہ شاید حضرت عثمانؓ سے بھی تقرر عمال میں غلطی ہوئی ہو لیکن واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے اس کا کوئی بھی ثبوت نہیں ملتا کہ رائے عامہ ان کے یا ان کے عمال کے خلاف تھی بلکہ تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے کہ عام پبلک جس میں عوام و خواص سب شامل ہیں، ان سے اور ان کے عمال سے بالکل راضی اور مطمئن تھی۔ طبری کے حوالے سے ہم یہ واقعہ ذکر کر چکے ہیں کہ جب عمال کے متعلق شکایتیں دربار خلافت میں پہنچیں تو خلیفۃ المسلمین نے بعض اکابر رجال کو بطور کمیشن تحقیق احوال کے لئے ممالک محروسہ کی طرف بھیجا۔ واپسی پر ان کی رپورٹ یہ تھی کہ عام پبلک حکام و عمال سے خوش اور مطمئن ہے۔ چند مفسدوں کے علاوہ کوئی بھی ان کا شاکی نہیں ہے اور سب شکایتیں بالکل بے اصل اور غلط ہیں۔ اس کے علاوہ خود مودودی صاحب قاتلین عثمانؓ کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ ان کی تعداد دو ہزار سے زائد نہ تھی اور وہ کسی علاقے کے بھی نمائندے نہ تھے (ص ۱۱۰) سوال یہ ہے کہ اگر ناراضگی عام تسلیم کی جائے تو کیا وجہ ہے کہ پبلک نے انہیں اپنا نمائندہ نہیں بنایا؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ یہ کہہ کر تو آئے نہ تھے کہ ہم حضرت عثمانؓ کو معزول یا شہید کرنے جا رہے ہیں اگر عموم الناس حضرت عثمانؓ کی زیر بحث پالیسی سے ناراض تھے یا ان کے عمال کو ناپسند کرتے تھے تو ان کے لئے عام پبلک کا نمائندہ

بن جانا بہت آسان بھی تھا اور مفید بھی۔ مگر انہوں نے اس کی جرأت کیوں نہ کی؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ درحقیقت پبلک کے عوام و خواص حضرت عثمانؓ ان کے عمال اور ان کی پالیسی سے بالکل مطمئن اور خوش تھے۔

مزید یہ کہ مودودی صاحب خود لکھتے ہیں :۔

"انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جو زیادہ تر بے بنیاد یا ایسے کمزور الزامات پر مشتمل تھی جن کے معقول جوابات دیئے جا سکتے تھے اور بعد میں دیئے بھی گئے" (ص۱۱۵) آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"اور حضرت علیؓ نے ان کے ایک ایک الزام کا جواب دیکر حضرت عثمانؓ کی پوزیشن صاف کی" (ص۱)

اگر عوام میں ناراضگی ہوتی تو انہیں ان کمزور الزاموں کی کیا ضرورت تھی؟ اور بے بنیاد باتیں گھڑنے کی کیا حاجت پیدا ہوتی صحیح الزام اور رائے عامہ کی پشت پناہی کو وہ اپنے اقدام کے لئے وجہ جواز نہ بنا سکتے تھے؟ یہ معمہ بھی فہم سے بالاتر ہے کہ اگر زیر بحث الزام صحیح تھا تو حضرت علیؓ نے جواب دیکر انہیں خاموش کیسے کر دیا؟ اس سے ظاہر ہے کہ رائے عامہ ہرگز حضرت عثمانؓ کے خلاف نہیں ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں تھوڑے سے مفسدوں کی شورش کو امام المسلمین کی غلطی کی علامت قرار دینا سراپا غلط اور بے دلیل جھوٹا دعویٰ ہے۔

سوم۔ احادیث و تاریخ شاہد ہیں کہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی نے خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس عہد میں بغاوت کی اور نبوت کا دعویٰ کیا۔ مودودی صاحب اپنے قاعدے کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ کیا معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی غلطی ہوئی تھی جس کی وجہ سے یہ حوادث پیش آئے؟ یا معاذ اللہ جمہور مسلمین میں آنحضور سے ناراضگی پائی جاتی تھی اور اس کے کچھ صحیح اسباب تھے؟ حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد معدلت مہد میں بعض قبائلی عرب مرتد ہو گئے بعض نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا ان بغاوتوں کو کچلنے میں امام المسلمین اور دوسرے صحابہ

ــــــــــ

لہ حضرت علیؓ تو مطمئن تھے بلکہ انہوں نے ان اعتراضات کے جوابات دیکر سبائیوں کو بھی لاجواب کر دیا مگر مودودی صاحب کو کسی طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک سیدنا ذی النورینؓ کی پوزیشن صاف ہو تب انہیں اصرار ہے کہ حضرت ممدوح سے غلطی ہوئی۔

کہ خاصی محنت و مشقت اٹھانا پڑی اس معاملہ میں سیدنا صدیق اکبرؓ کی غلطی کی نشاندہی فرمائی جائے کہ کیا تھی؟ کیا عوام الناس صدیق اکبرؓ سے ناراض تھے اور اس ناراضگی کے کچھ صحیح اسباب تھے؟ حضرت علی مرتضیٰؓ کے خلاف ان لوگوں نے بغاوت کی جو مدت تک ان کے ساتھ رہے تھے اور ان کی حمایت میں جدال و قتال بھی کر چکے تھے مودودی صاحب فرمائیں کہ ان کی اس بغاوت کے کیا اسباب تھے؟ اور حضرت علیؓ کی کس غلطی کی وجہ سے یہ تکلیف دہ حادثہ پیش آیا؟ اور کیا وہ اسباب جن کی بناء پر انہوں نے بغاوت کی واقعی صحیح تھے؟

چہارم۔ اگر کوئی شخص الزاماً یہ کہنے لگے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ سے جو اختلاف کیا اور ان کے مقابلے میں آ گئے اس شورش میں آپ کے قاعدے کے اعتبار سے ضرور کچھ واقعی اسباب ناراضگی کارفرما ہوں گے اور ضرور حضرت علیؓ سے کوئی ایسی غلطی ہوئی ہو گی جس کی وجہ سے پورا ملک شام بلکہ اور بھی بہت سے بلاد و امصار ان کے خلاف ہو گئے تھے اور حضرت معاویہؓ کے ساتھ صرف صحابی زادے ہی نہیں بلکہ بہت سے صحابی بھی شریک ہو گئے تھے مودودی صاحب فرمائیں کہ وہ اس کا کیا جواب دیں گے[1]۔

پنجم۔ اصولی بات یہ ہے کہ فتنہ پرداز لوگ کسی نہ کسی چیز کو اس کا محرک اور سبب قرار دیتے ہیں اور اپنے فتنہ انگیزی کو اس سے وابستہ کرتے ہیں لیکن دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ چیز نفس الامر اور واقعے کے لحاظ سے اس فتنہ کا سبب بن بھی سکتی ہے یا نہیں؟ مودودی صاحب نے دعویٰ تو ضرور کیا ہے مگر اس چیز کو ثابت نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی مبینہ پالیسی واقعے کے لحاظ سے فتنہ کا سبب بن سکتی تھی جب تک یہ ثابت ہو اس وقت ان کی بات بالکل بے جان رہتی ہے۔

ان دلائل سے صاف ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کا قول مذکور بالکل غلط اور ان کی دلیل بالکل بیجا ہے رہا یہ امر کہ اس میں صحابی اور صحابی زادے بھی شریک تھے تو بعض صحابی زادوں مثلاً محمد بن ابی بکرؓ کے متعلق تو یہ صحیح ہے کہ وہ مفسدوں کے فریب میں آ کر فتنہ و فساد میں شریک ہو گئے تھے لیکن صحابی تو ایک بھی اس

---

[1] تکفیر الحق کہنے لئے گذارش ہے کہ خود مودودی صاحب کی جماعت کے بعض اکابر ان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ کیا مودودی صاحب اپنے قاعدے کے مطابق اپنی غلطیوں کا اعتراف فرمائیں گے؟

فتنہ میں شریک نہ تھے انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ہم دکھائیں گے کہ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے۔ مودودی صاحب نے اپنی فہرست مطاعن کی تکمیل اس طرح فرمائی ہے۔

" اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں ایسی تھیں جو بڑے دور رس اور خطرناک نتائج کی حامل ثابت ہوئیں۔ (ص ۱۱۵) ان میں سے پہلی چیز ملاحظہ ہو۔

" ایک یہ کہ حضرت عثمان رضؓ نے حضرت معاویہؓ کو مسلسل بڑی طویل مدت تک ایک ہی صوبے کی گورنری پر مامور کئے رکھا۔ وہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں چار سال سے دمشق کی ولایت پر مامور چلے آ رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ایلہ سے سرحد روم تک اور الجزیرہ سے ساحل بحر ابیض تک کا پورا علاقہ ان کی ولایت میں جمع کر کے اپنے پورے زمانہ خلافت (۱۲ سال) میں ان کو اسی صوبے پر برقرار رکھا یہی چیز ہے جس کا خمیازہ آخرکار حضرت علیؓ کو بھگتنا پڑا (")

اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

حضرت معاویہؓ اس صوبہ کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھے گئے کہ انہوں نے یہاں اپنی جڑیں پوری طرح جما لیں اور وہ مرکز کے قابو میں نہ تھے بلکہ مرکز ان کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا (")

حضرت معاویہؓ کے تعلیے منصب پر پچھلے صفحات میں ہم کافی وشافی بحث کر چکے ہیں یہاں خصوصیت عنوان کی مناسبت سے کچھ مزید گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

تغیر عنوان اور اعتراض کا رخ بدلنے سے مودودی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ جنگ جمل و صفین اور حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کے اختلاف و آویزش کا بانی اور ذمہ دار بھی سیدنا عثمانؓ ہی کو قرار دیں اور سبائیوں کو جن کے جرائم کا بوجھ ہلکا کرنے کا شدید جذبہ موصوف کے قلب میں موجزن ہے شہادت عثمانی کے بعد کے فتنوں سے بالکل بری الذمہ قرار دیں اگر انہیں سبائیوں کے ساتھ ہمدردی ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اس لئے

کہ ان کے تشیع کا طبعی تقاضا ہے لیکن افسوسناک چیز یہ ہے کہ وہ تحقیق کا نام لیکر تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس معاملہ میں مغالطوں اور غلط بیانیوں سے بھی نہیں چوکتے امور ذیل پر نظر ڈالئے تو موصوف کی شان تحقیق کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

اول۔ عام مورخین کا بیان ہے کہ حضرت معاویہؓ کو ان کے بھائی حضرت یزید بن ابی سفیانؓ کے انتقال کے بعد ۱۸ھ میں حضرت عمرؓ نے شام کا گورنر بنایا اور فاروق اعظمؓ کی شہادت ۲۳ھ میں ہوئی ہے اس حساب سے عہد فاروقی میں وہ چھ سال تک اس عہدہ پر مامور رہے مودودی صاحب نے چھ سال کو اپنی طرف سے چار سال بنا دیا۔

دوم۔ حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کا گورنر مقرر فرمایا اور وہ عہد فاروقیؓ تک مسلسل اسی عہدے پر قائم رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

اسی طرح حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو ۸ھ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کا گورنر مقرر فرمایا اور وہ مسلسل چودہ برس تک اسی عہدے پر فائز رہے (بخاری وغیرہ کتب حدیث نیز کتب تاریخ و رجال) پھر اگر حضرت عثمانؓ نے اس سنت نبوی و سنت شیخین پر عمل کیا تو کیا غلطی کی؟

سوم۔ استیعاب (تذکرہ عمرو بن العاصؓ) اور البدایہ والنہایہ سے معلوم ہوتا ہے، شام کے علاوہ اردن اور فلسطین کا علاقہ بھی حضرت فاروق اعظمؓ ہی نے حضرت معاویہؓ کی ولایت اور گورنری کے ماتحت کر دیا تھا طبری جلد ثانی ص ۲۲۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فاروقی میں حضرت معاویہؓ شام۔ اردن۔ فلسطین انطاکیہ وغیرہ کے گورنر مقرر ہو چکے تھے اس لئے مودودی صاحب کا حضرت عثمانؓ پر یہ اعتراض بالکل غلط ہے لیکن اگر ہم ان تصریحات سے قطع نظر کر کے صرف اتنی بات پر نظر کریں جو خود انہوں نے تسلیم کی ہے تو بھی ان کا اعتراض غلط اور لغو ہی نظر آتا ہے وہ خود تسلیم کرتے ہیں۔

" طبری نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت حضرت معاویہؓ دمشق اور

اردن کے گورنر تھے ۔

اس کے بعد حافظ ابن کثیر کا یہ قول البدایہ سے نقل کرتے ہیں :-

والصواب ان الذی جمع لمعاویۃ الشام کلہا عثمانؓ بن عفان واما عمرؓ فانما ولاہ بعض اعمالہا ۔ ص ۳۲۳

اسی صفحہ پر خود تسلیم کرتے ہیں کہ دمشق سے مراد شام کا وہ علاقہ ہے جس کا دار الحکومت دمشق تھا ۔

گویا انہیں خود تسلیم ہے کہ حضرت عمرؓ نے انہیں شام اور اردن کا گورنر بنایا تھا نیز یہ کہ فلسطین الجزائر وغیرہ کے بعض انتظامی شعبے بھی ان کے سپرد کر دیئے تھے اب میری گذارش یہ ہے کہ کیا بقول مودودی صاحب "جڑیں پوری طرح جمانے کے لئے" اتنا کافی نہ تھا ؟ پھر آپ یہ اعتراض سیدنا فاروق اعظمؓ پر کیوں نہیں کرتے کہ انہوں نے انہیں اپنی "جڑیں جمانے" کا موقع فراہم کر دیا حضرت عثمانؓ پر یہ اعتراض آخر کس نقلی عقلی، اخلاقی اصول و قاعدے کی بنا پر کیا جا رہا ہے ؟

چہارم ۔ حضرت علیؓ کے متعلق مودودی صاحب خود اقرار کرتے ہیں :-

" اور بعد میں شام کے سوا تمام بلاد اسلامیہ نے ان کو خلیفہ تسلیم کیا ۔ ص ۳۴

اگر یہی بات تھی تو ان کے حدود ولایت میں توسیع سے کیا اثر پڑا ؟ اگر وہ صرف شام کے گورنر رہتے تو بھی اتنا ہی ہو سکتا تھا اگر حضرت عثمانؓ نے انہیں بعض دیگر مقامات کا بھی گورنر بنا دیا تو اس سے نقصان کیا ہوا ؟ اور آپ کے اعتراض کی بنا کیا باقی رہ جاتی ہے ؟-

پنجم ۔ میں جناب معترض سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اس دور میں نظام خلافت ختم ہو کر نوابی نظام (FUDAL SYSTEM) کا رواج ہو گیا تھا جو کسی گورنر کے کسی ایک صوبے پر زیادہ مدت تک برقرار رہنے سے جڑیں جما لینے، اور بغاوت کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا ؟ حقیقت یہ ہے کہ نظام خلافت میں کوئی گورنر اپنے عہدے سے فائدہ اٹھا کر بغاوت نہیں کر سکتا تھا خصوصاً خلافت راشدہ کے دور میں تو یہ چیز اور بھی زیادہ بعید از

قیاس بھی اس لئے کہ فوجی نظام ایسے طرز کا نہیں تھا کہ گورنر اسے اپنے ذاتی اغراض کیلئے استعمال کر سکتا عساکر کی وفاداری خلیفۃ المسلمین سے وابستہ تھی نہ کہ گورنر سے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ خلفائے راشدین کا معمولی سا فرمان گورنر کی معزولی کیلئے کافی ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی آویزش کے اسباب دوسرے تھے جن پر ہم انشاء اللہ مناسب موقع پر روشنی ڈالیں گے اور یہ بتائیں گے کہ اسے بغاوت کہنا حضرت معاویہؓ پر ظلم ہے۔ عقلاً اس دور مسعود میں بغاوت صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ گورنر اپنی رعایا میں بہت مقبول ہو اور خلیفہ سے بیک نا راض ہو۔ دورِ عثمانی میں اگرچہ ان کے عمال عوام و خواص میں بہت مقبول و محبوب تھے لیکن خلیفۂ وقت ان سے بھی زیادہ مقبول و محبوب تھے اس لئے بغاوت کا ادنیٰ احتمال بھی نہ تھا۔

ششم - جناب مودودی صاحب نے "جڑیں پوری طرح جمالیں" کا گول مول فقرہ تحریر فرمایا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ کیا حضرت معاویہؓ نے کوئی بہت بڑی ذاتی فوج بھرتی کر لی تھی؟ اگر یہ ہے تو یہ تاریخ نویسی کے بجائے تاریخ سازی اور افسانہ طرازی ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا اور اگر یہ مطلب ہے کہ وہ عام پبلک میں بہت مقبول و محبوب ہو گئے تھے تو یہ بالکل صحیح ہے لیکن اس کے جواب میں سوا اس کے کیا کہا جائے کہ ؎ ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است

یہ تو ان کے کمال کی دلیل اور ان کی فضیلت و منقبت ہے بلاشبہ وہ اپنی روحانی و اخلاقی بلندیوں اور اپنے دینی خدمات و فیوض و برکات کی وجہ سے رعیت میں بیحد مقبول و محبوب تھے اور یقیناً یہ چیز ان کیلئے باعث فخر بھی جائیگی معترض صاحب کو خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ہفتم - مودودی صاحب کا یہ دعویٰ کہ حضرت معاویہؓ مرکز کے قابو میں نہ رہے تھے بلکہ مرکز ان کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا تھا ایسا غلط اور سراپا کذب و دروغ دعویٰ ہے جس کے ثبوت میں وہ ایک واقعہ بھی نہیں پیش کر سکتے اور نہ قیامت تک اسے ثابت کر سکتے ہیں اس کے جواب میں ہم سوا اس کے کیا کہیں کہ "ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین" موصوف کوئی ایک ہی واقعہ ایسا ثابت کر دیں جس میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کی نافرمانی

کی ہو یا جس سے بقول موصوف مرکز کا ان کے رحم و کرم پر منحصر ثابت ہوتا ہو قسم ہے مالک عرش بریں کی وہ قیامت تک اس کا ثبوت نہیں پیش کر سکتے یہ تو سبائی کارخانے کا ڈھلا ہوا بہتان تھا اس ہے جو انہوں نے صرف اس لئے گھڑا تھا کہ معاذ اللہ حضرت عثمانؓ کو ایک کمزور غیر مدبر اور نا اہل حکمران ظاہر کریں۔ مودودی صاحب نے بھی بغیر سوچے سمجھے انکی ہمنوائی زمادی اور تحقیق کے مدعی ہونے کے باوجود ایسی بے اصل و بے بنیاد بات لکھدی حیرت ہے کہ انہیں ایسی غلط بیانی کی جرأت کیسے ہوئی؟ ایک چیز کی حقیقت تو واضح ہو چکی اب مودودی صاحب کی بیان کردہ دوسری چیز بھی ملاحظہ ہو لکھتے ہیں:۔

> "دوسری چیز جو اس سے زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی وہ خلیفہ کے سکریٹری کی اہم پوزیشن پر مروان بن الحکم کی ماموریت تھی ان صاحب نے حضرت عثمانؓ کی نرم مزاجی اور ان کے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر بہت سے کام ایسے کئے جن کی ذمہ داری لامحالہ حضرت عثمانؓ پر پڑتی تھی حالانکہ ان کی اجازت اور ان کے علم کے بغیر ہی وہ کام کر ڈالے جاتے تھے علاوہ ازیں یہ صاحب حضرت عثمانؓ اور اکابر صحابہؓ کے باہمی خوشگوار تعلقات کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے تاکہ خلیفہ برحق اپنے پرانے رفیقوں کے بجائے ان کو اپنا زیادہ خیر خواہ اور حامی سمجھنے لگیں۔"
>
> (صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

حضرت مروان رضی اللہ عنہ کے پاکیزہ حالات اور مناقب ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور اسی سلسلہ میں سبائیوں کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی دے چکے ہیں لیکن یہاں چونکہ مودودی صاحب نے ذرا پیرایہ بدل کر وار کیا ہے اس لئے اس مسئلہ پر ہمیں کچھ اور لکھنا پڑا حضرت مروان کے عہدہ کتابت (سکریٹری) پر موصوف کو اعتراض ہے مگر اس کا جواب واضح ہے یعنی وہ اس کے اہل اور مستحق تھے اس لئے اس منصب پر فائز کئے گئے۔ خلیفہ راشد نے انہیں اس کا اہل سمجھا یہ خود ان کی اہلیت کی دلیل ہے جو انہیں نا اہل کہے وہ درحقیقت اپنی نا اہلی کا پردہ فاش کرتا ہے۔ اس کے بعد موصوف کے لگائے ہوئے الزاموں پر نظر ڈالئے سب کے سب دلیل و ثبوت سے تہی دست

نظر آتی ہیں کہ سبائیوں نے جو گول مول باتیں کہیں اور جن کی حیثیت جھوٹے پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں ہے انہوں نے انہیں سے اپنی کتاب کے اوراق سیاہ کرنے کا کام لے لیا کیا اسی کا نام تحقیق ہے۔؟

سوال یہ ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے؟ آپ نے کوئی ایک بھی واقعہ ثبوت کے ساتھ بطور دلیل و مثال ذکر کیا ہوتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فلاں کام حضرت عثمانؓ کے علم اور ان سے دریافت کئے بغیر کیا تھا اور وہ کام دینی و شرعی اعتبار سے معیوب یا سیاسی و اجتماعی اعتبار سے خلاف مصلحت تھا؟ آپ نے دلیل میں طبقات ابن سعد سے جو بقول خود ابن سعد کا بیان نقل کیا وہ اول تو ان کا بیان نہیں بلکہ دشمن صحابہ اور کذاب واقدی کی روایت ہے اور جس میں "الناس" سے مراد وہی خناس سبائی دشمنان عثمانؓ ہیں یہ تو ان کا وہی دعویٰ ہے جسے آپ نے اپنے الفاظ میں دہرا دیا ہے۔ یہ خود محتاج دلیل ہے۔ آپ کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟ حیرت ہوتی ہے مودودی صاحب کی جرات پر کہ خود سبائیوں کا بیان حضرت مروانؓ کے متعلق دہراتے ہیں اور طبقات ابن سعد میں جب یہی اعتراض انہیں مخالفین عثمانؓ (جو درحقیقت صرف معدودے چند کی ایک ٹولی تھی) سے نقل کیا جاتا ہے تو اسے اپنی دلیل بنا لیتے ہیں گویا ایک ہی بات جب اردو میں لکھی جائے تو دعویٰ ہے اور جب عربی میں لکھی جائے تو دلیل ہے۔ کیا خوب استدلال ہے؟ اسی طرح حضرت مروانؓ پر خلیفہ رسول اور دیگر اکابر صحابہ کے تعلقات خراب کرنے کا الزام بہتان کے علاوہ کسی لقب کا مستحق نہیں ہے۔ مودودی صاحب کی جرات داد کے قابل ہے کہ ایسا بے اصل الزام جس کا کوئی ثبوت بھی وہ نہیں پیش کر سکے اور نہ پیش کر سکتے ہیں۔ کس بے باکی کے ساتھ انہوں نے لگا دیا الزام کے غلط ثابت ہونے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ وہ بے ثبوت ہے لیکن اس کے غلط ہونے کی مزید دلیل یہی ہے کہ قاتلین حضرت عثمانؓ نے جب حضرت مروانؓ کو حوالہ کر دینے کا مطالبہ کیا ہے تو ان پر صرف اتنا الزام لگایا کہ،

ان يسلم بعضهم مروان بن الحكم فيما قيل كما زور على عثمانؓ كتابه الى مصر

(البدایہ والنہایہ جلد ہفتم بیان شہادت عثمانؓ)

اگر مودودی صاحب کا زیر بحث الزام صحیح ہوتا تو وہ لوگ اس کا تذکرہ کرتے صرف ایک واقعہ پر کیوں اکتفا کرتے مودودی صاحب سبائیوں سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے پھر فرماتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ متعدد مرتبہ انہوں نے صحابہ کے مجمع میں ایسی تہدید آمیز تقریریں کیں جنہیں طلقاء کی زبان سے سننا سابقین اولین کے لئے بمشکل ہی قابل برداشت ہو سکتا تھا" ص ۱۱۶

لیکن شاید وہ تقریریں مودودی صاحب تک سینہ بسینہ پہنچی ہیں اس لئے کہ کتب تاریخ میں تو ان کا کوئی نشان ملتا نہیں ہے۔ طبری وغیرہ میں حضرت مروانؓ کی جو ایک آدھ تہدید آمیز تقریر منقول ہے تو ان روایتوں کا ثبوت اور قابل قبول ہونا خود محتاج ثبوت ہے اس کے علاوہ اس کے مخاطب سابقین اولین تو کیا عام صحابہ بھی نہیں ہیں بلکہ اس کی مخاطب سبائیوں اور مفسدوں کی وہ ٹولی ہے جو حضرت عثمانؓ پہ غلط اعتراضات کرنے اور ہنگامہ کرنے کے لئے آئی تھی اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

" اسی بنا پر دوسرے لوگ تو درکنار خود حضرت عثمانؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ بھی یہ رائے رکھتی تھیں کہ حضرت عثمانؓ کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری مروانؓ پر عائد ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شوہر محترم سے صاف صاف کہا کہ اگر آپ مروانؓ کے کہے پر چلیں گے تو یہ آپ کو قتل کرا کے چھوڑے گا۔ اس شخص کے اندر نہ اللہ کی قدر ہے نہ ہیبت نہ محبت (ص ۱۱۶ بحوالہ طبری)

اس روایتؔ کا سند کے اعتبار سے حال یہ ہے کہ خود ابن جریر طبری شیعہ ہیں اور روایت ابی محمد بن عمر

سلہ یہ ایک طویل روایت ہے جسے سبائیوں نے بہت چرب سیاری سے گھڑا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

واقدی کی ہے جو بالاتفاق اول درجہ کا دروغ گو اور جھوٹا ہے۔ اس کے ساتھ صحابہ خصوصاً بنو امیہ کا سخت مخالف بھی۔ ان باتوں کے معلوم ہونے کے بعد مودودی صاحب کے استدلال میں جان ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت سراسر جعلی اور موضوع ہے جو واقدی اور کسی سبائی ذہن والے نے گھڑی ہے۔ بطور لطیفہ یہ بھی سنتے چلئے کہ مودودی صاحب کی عبارت مذکورہ میں آخری جملہ طبری کی عبارت ذیل کا ترجمہ ہے:

لیس لہ عند الناس قدرٌ او لا ھیبۃ و لا محبۃ

ہر عربی داں سمجھ سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ یہ ہے "لوگوں کے دلوں میں نہ ان کی قدر ہے نہ ہیبت نہ محبت"۔ معلوم نہیں موصوف نے "اس شخص کے اندر" "اللہ کی" کن الفاظ کا ترجمہ کیا ہے؟ اور اپنے ترجمہ میں لغت کی کس کتاب سے امانت حاصل کی ہے؟ مودودی صاحب عربی زبان سے اس قدر نابلد ہیں؟ اگر نہیں تو سوائے بغض مرداں کے اور کس جذبہ سے اس کی توجیہ کی جا سکتی ہے؟

مودودی صاحب نے "طلقاء" کا لفظ بھی یہاں تحقیر کے انداز میں استعمال کیا ہے۔ افسوس ہے کہ بنو امیہ کی عداوت کے جوش میں انہیں اس کا ہوش بھی نہ رہا کہ یہ لفظ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یوم فتح مکہ میں ان حضرات کی دلدہی اور تالیف قلب کے لئے محبت و شفقت سے استعمال فرمایا تھا اور مودودی صاحب اسے تحقیر کے لئے استعمال کر رہے ہیں! فیا للعجب! وہ جو جی چاہے سمجھیں لیکن درحقیقت یہ تو بنو امیہ کے لئے باعث فخر ہے کہ وہ طلقاء الرسول ہیں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کی خاطر اتنی عزیز تھی کہ اس فتح کے موقع پر بھی آنحضور نے ان کی دلدہی و دلداری کی کوشش فرمائی۔ اس فضیلت عظیمہ پر بنو امیہ جس قدر فخر و مسرت کا اظہار کریں کم ہے۔

(بقیہ صفحہ سے آگے) مودودی صاحب نے اس کے علاوہ بھی دوسرے مقامات میں یہی کام لیا ہے انشاء اللہ ان مواقع پر حسب ضرورت اس پر مزید نقد کیا جائے گا۔ ۱۲

بجائے و لو کرہ المحاسد و ن ۔ کیا مودودی صاحب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق
یہ گمان رکھتے ہیں کہ آپ نے یہ لفظ معاذ اللہ بطور طنز استعمال فرمایا ہوگا ؟ اگر ایسا ہے تو یہ انتہائی
درجہ کی پست خیالی ہے ۔ رحمۃ العالمین کی ذات اقدس اس قسم کے عیوب سے بہت بلند و برتر تھی
آپ کے متعلق اس قسم کا وہم و گمان کرنا بھی سوء ادب ہے ۔

اگر اس سے مراد متوقع غلامی سے آزادی بھی ہو تو آنحضور کی غلامی میں داخل ہونا بھی باعث
فخر ہے اور آپ کی لسان اقدس سے آزادی کا مژدہ سننا بھی باعث مباہات ۔ اسے سبب عار سمجھنا خود
باعث ننگ و عار ہے ۔ ان حضرات کو تو غلام بنایا بھی نہیں گیا تھا ۔ موصوف ان صحابہ کے متعلق کیا
کہیں گے جو واقعی غلام تھے اور آنحضور نے یا کسی نے آزاد فرمایا کیا ان کے نزدیک یہ سب حضرات حقیر تھے ؟
حضرت زید حضرت بلال حضرت بریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم کے متعلق ان کا کیا خیال ہے ؟ لیکن حقیقت
یہ ہے کہ اپنے خاندان والوں اور اپنے اعزا و اقارب کو غلام بنانے کا وسوسہ بھی آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم
کے قلب کریم میں نہ گذرا ہوگا ۔ آخر آپ نے اسیران بدر میں سے کسے غلام بنایا تھا ؟ اور نہ کسی صحابی
کے ذہن میں یہ خیال آسکتا تھا کہ اپنے آقا سید الاولین و الآخرین کے اعزا و اقارب اور عرب کے سب سے
معزز قبیلہ کے افراد کو غلام بنائیں اور نہ خود مفتوح قریش کو آنحضور سے یہ بدگمانی ہو سکتی تھی کہ آنحضور
صلے اللہ علیہ وسلم انہیں غلام بنالیں گے ۔ البتہ انہیں یہ خیال طبعاً پیدا ہوا ہوگا کہ ہم سے حالت کفر میں جو بے
ادبیاں صرزد ہوئی تھیں ان کا اثر اب بھی قلب مبارک میں باقی ہوگا ۔ اس لئے ہمارے اوپر پورا اعتماد نہ ہوگا
اس لئے بہ نظر احتیاط آنحضور کی خدمت میں حاضری اور دربار رسالت سے وابستگی کے بارے میں

ف ان حضرات کو بھی فدیہ لیکر رہا کر دیا گیا تھا ۔ طلقاء کے اگر یہی معنی ہیں کہ غلام بنانے کے بجائے آزادی
تو یہ حضرات بھی طلقاء تھے ۔ ان میں عم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سید نا حضرت عباس
رضی اللہ عنہ بھی تھے ۔ مودودی صاحب ان حضرات کے متعلق کیا فرماتے ہیں ؟ ۔

ہمارے اوپر کچھ پابندیاں عائد ہوں گی۔ ہمارے ساتھ عزیزداری کا برتاؤ نہ ہوگا، بلکہ معاشرت کا برتاؤ ہوگا۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلقا، فرما کر ان کی تشفی فرمائی کہ تم سے عزیزوں ہی کی طرح برتا ہوگا۔ تم پر پورا اعتماد و اطمینان ہے۔ اور کوئی پابندی تم پر نہ لگائی جائے گی سابقہ باتیں سب میرے قلب سے نکل چکی ہیں، تمہارے اسلام لانے کے بعد ان کا کوئی اثر میرے دل میں نہیں ہے۔ خدارا کوئی بتائے کہ اس میں کونسا پہلو ان کی تحقیر کا پیدا ہوتا ہے؟ تحقیر کا پہلو پیدا کرنا مودودی صاحب کی خوش فہمی نہیں تو اور کیا ہے؟ اسی لئے ان کی تالیف قلب آپ نے ہمیشہ ملحوظ رکھی، اور مولفۃ القلوب کا لقب بھی اسی وجہ سے انہیں ملا۔ اس تالیف میں حکمت یہی تھی کہ انہیں بھول کر بھی کبھی اس کا خیال نہ ہو کہ آنحضور کے قلب مبارک میں سابقہ تلخیوں کا کچھ اثر باقی ہے۔ بلکہ وہ یہ سمجھیں کہ ان کے ساتھ بھی اسی محبت و شفقت کا تعلق ہے جو دوسرے حضرات صحابہ کے ساتھ ہے۔

مودودی صاحب کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت عثمان کی مبینہ پالیسی سے عوام و خواص ناراض تھے۔ اس ناراضگی کی تصویر موصوف نے اس طرح کھینچی ہے کہ اس میں صرف عوام و خواص ہی نہیں بلکہ اخص الخواص حضرات یعنی اکابر صحابہ بھی سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض نظر آتے ہیں اپنے اس دعوے پر بھی انہوں نے دو طرح سے استدلال کیا ہے۔ یعنی کچھ تاریخی روایتیں پیش کی ہیں اور کچھ علماء کے اقوال نقل کئے ہیں۔ پہلے ہم ان تاریخی روایتوں پر نظر ڈالتے ہیں طبری ابن کثیر ابن اثیر کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ان کا بیان ہے کہ مدینہ میں جب ہر طرف حضرت عثمانؓ پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں، اور حالت یہ ہوگئی کہ چند صحابہ کے سوا شہر میں کوئی صحابی ایسا نہ رہا جو حضرت والا کی حمایت میں زبان کھولتا تو لوگوں نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ حضرت عثمانؓ سے مل کر ان معاملات پر بات کریں، چنانچہ وہ ان کی خدمت میں تشریف لے گئے اور ان کو

وہ پالیسی بدل دینے کا مشورہ دیا جس پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نے عہدے دیئے ہیں انہیں عمرؓ بن الخطاب نے بھی تو عہدوں پر مامور کیا تھا۔ پھر میرے ہی اوپر لوگ کیوں معترض ہیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا عمرؓ جس کو کسی جگہ کا حاکم مقرر کرتے تھے اس کے متعلق اگر انہیں کوئی قابل اعتراض بات پہنچ جاتی تھی تو وہ بری طرح اس کی خبر لے ڈالتے تھے مگر آپ ایسا نہیں کرتے۔ اپنے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ کیا عمرؓ نے معاویہؓ کو گورنر نہیں بنایا تھا۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا عمرؓ کا غلام یرفا بھی ان سے اتنا نہ ڈرتا تھا جتنا معاویہؓ ان سے ڈرتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ معاویہؓ آپ سے پوچھے بغیر جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ عثمانؓ کا حکم ہے مگر آپ انہیں کچھ نہیں کہتے (صفحہ ۳۳۰، ۳۳۱)

مودودی صاحب نے ناواقف ناظرین کو مرعوب کرنے کے لئے اس روایت کے متعدد حوالے دیئے ہیں ورنہ درحقیقت یہ روایت طبری کی ہے اور مابعد کے مورخین ابن اثیر وغیرہ نے وہیں سے اخذ کی ہے اس لئے ابن اثیر و ابن کثیر و ابن خلدون وغیرہ کا اسے نقل کرنا یکساں ہے ان کے نقل کرنے سے روایت کو کوئی قوت نہیں حاصل ہوتی اس کے بعد روایت پر نظر ڈالئے کہ یہ کہاں تک پہنچی ہے؟ اس کی سند دیکھئے تو سر فہرست جانے پہچانے کذاب اور وضاع واقدی کا نام نظر آئے گا۔ یہ اسی کی روایت ہے جس کا جھوٹا اور من گھڑت باتیں گھڑنے میں ماہر ہونا علماء رجال کے یہاں مسلم اور متفق علیہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی من گھڑت روایتوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ صحابہ خصوصاً اموی صحابہ کا دشمن اور سبائیوں کے مفسدانہ افکار کا ناشر تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سند کے اعتبار سے یہ روایت بالکل ناقابل قبول جعلی، موضوع اور مردود قرار پاتی ہے۔

درایت کی کسوٹی پر پرکھئے تو اس کا کھوٹا ہونا اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اہل فن کے نزدیک قابل التفات بھی نہیں رہتی چہ جائیکہ کہ قابل قبول ہو۔

(۱) روایت پر نظر کرنے سے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت علیؓ یہ جانتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کی پالیسی غلط ہے اور صرف غلط ہی نہیں بلکہ موجب فتنہ و فساد اور امت اسلامیہ کے لئے سخت مضر ہے۔ ادھر مملکت اسلامیہ کے عوام و خواص کی اغلب اکثریت بھی خلیفۂ امت سے ناراض اور ان کی پالیسی سے نالاں تھی یہاں تک کہ خود مدینہ میں یہ حال ہو گیا تھا کہ سوا چند صحابہ کے (جنکی تعداد بقول طبری و مودودی صاحب صرف چار تھی) کوئی حضرت عثمانؓ کی حمایت میں زبان کھولنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ دوسری طرف ایک گروہ بزور قوت اس پالیسی کو تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ ایسے حالات میں کیا حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ وغیرہم اکابر صحابہ پر شرعاً اخلاقاً اور سیاستاً یہ فرض نہیں عائد ہوتا تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ کو معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو خلیفہ منتخب کرتے؟ اسی روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا:۔

وانی احذرك ان تكون امام هذه الامة المقتول فانه يقال يقتل فی هذه الامة امام فيفتح عليها القتل والقتال الى يوم القيامة وتلبس امورها عليها وتتركهم شيعا فلا يبصرون الحق لعلو الباطل (طبری جلد پنجم احوال ۳۴ھ)

(ترجمہ) اور میں آپ کو اس بات سے ڈراتا ہوں کہ آپ اس امت کے مقتول امام بنیں اس لئے کہ مشہور ہے کہ امت کا ایک امام قتل کیا جائیگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس پر قتل و قتال کا دروازہ قیامت تک کے لئے کھل جائیگا اور اس کی وجہ سے امت کے معاملات مشتبہ ہو جائیں گے اور گروہ بندی پیدا ہو جائیگی اور وہ باطل کے غلبہ کی وجہ سے حق کو نہ دیکھ سکیں گے۔

یہ اسی طویل روایت کا ایک ٹکڑا ہے جس کا ایک حصہ مودودی صاحب نے نقل کیا ہے اور جس پر بحث ہو رہی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ خوب واقف تھے کہ حضرت عثمانؓ کی پالیسی ان کے قتل پر ختم ہوگی جس کے نتائج پورے

امت کے لئے ہولناک اور مضرت رساں ہوں گے۔ یعنی مسلمانوں میں اجتماع و اتحاد ختم ہو جائیگا، ان میں گروہ بندی ہو جائیگی ان میں خانہ جنگیاں ہوں گی اور وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹیں گے، معاملات میں حق و باطل کی تمیز کی قوت ان کا ساتھ چھوڑ دے گی باطل کا غلبہ ہوگا اور حق امت کی نظر سے اوجھل ہو جائیگا۔ کیسے ہولناک نتائج ہیں؟ لیکن حیرت ہے کہ حضرت علیؓ اور دیگر اکابر صحابہ نے ان سے واقف ہونے کے باوجود حضرت عثمانؓ کو معزول نہیں کیا، حالانکہ جب رائے عامہ ان کے خلاف تھی تو معزول کرنا بہت آسان تھا کیا شرعی، اخلاقی سیاسی ہر اعتبار سے یہ ان کے اوپر فرض نہ تھا؟ کیا یہ حدیث انہیں نہیں معلوم تھی جو شخص تم میں سے کوئی امر منکر دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے منع کرے اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کم درجہ کا ایمان ہے۔ یقیناً ان حضرات میں ہاتھ سے عملی طور پر تبدیلی کی استطاعت تھی تو کیا یہ حضرات اس ترک فرض سے وہ گناہگار نہیں ہوتے؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کذاب واقدی کی اس روایت کو ہم صحیح تسلیم کر لیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ حضرت علیؓ اور جملہ اکابر صحابہؓ معاذ اللہ حضرت عثمانؓ کے جرم میں شریک بلکہ ان سے زیادہ گناہگار رہے۔ اس لئے کہ حضرت ذی النورینؓ تو فعل کی توجیہ و تاویل کرتے تھے اور ان حضرات کے نزدیک اس کی کوئی تاویل صحیح نہیں تھی (اعاذنا اللہ)۔

(۲) اس روایت کی ابتدا میں مذکور ہے کہ

"سنہ ۳۴ھ میں صحابہ کرام نے دوسرے (مقامات کے) صحابہ کو لکھا ہے کہ یہاں آجاؤ اگر تم جہاد کے خواہشمند ہو تو جہاد ہمارے پاس ہے" (حوالہ بالا)

ظاہر ہے کہ اس سے اگر مفسدین کے خلاف جہاد اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے مدافعت مراد ہوتی تو اس کا یہ رویہ کیوں ہوتا کہ وہ خلیفہ وقت کی مدافعت میں زبان کھولنے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد سے مراد یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ پر پالیسی بدلنے کے لئے دباؤ ڈالا جائے لیکن اس شوراشوری کے ساتھ یہ بے نمکی

ملاحظہ ہو کہ وہ حضرت موصوف پر کوئی دباؤ نہیں ڈالتے ہیں نہ انہیں معزول کرتے ہیں نہ ان سے استعفے کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کے آخر کیا معنی ہیں؟ روایت کے یہ دونوں متعارض گوشے بتا رہے ہیں کہ یہ حکایت کسی سبائی کارخانے میں گھڑی گئی ہے اور اسے حقیقت واقعہ سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔

٣۔ اس روایت کے بموجب حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ پر تین الزام لگائے تھے۔

اول۔ انہوں نے اپنے جن اقارب کو مناصب دیئے ہیں ان کی غلطیوں پر گرفت نہیں کرتے بلکہ ان کی رعایت کرتے ہیں۔

دوم۔ حضرت معاویہؓ ان کے قابو سے باہر ہیں۔

سوم۔ حضرت معاویہؓ اپنی حسب مرضی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور اس کی نسبت ان کی طرف کر دیتے ہیں طبری وغیرہ

جس شخص نے سبائیت زدہ اور شیعیت آمیز کتب تاریخ اسلام کا بھی مطالعہ کیا ہے وہ بھی ان الزاموں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے گا اور ان میں صداقت کا شائبہ بھی اسے نظر نہ آئے گا۔

تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ سیدنا حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کے بارے میں کبھی کسی رعایت سے کام نہیں لیا خواہ وہ ان کے اقارب ہوں یا غیر جب ان کے عمال کے خلاف شکایتیں کی گئیں تو انہوں نے تحقیق حال کے لئے دیانتدار اور معاملہ فہم حضرات کا کمیشن مقرر فرمایا۔ خود ان عمال سے جواب طلب کیا جو ان کے اقارب بھی تھے لیکن تحقیق سے ظاہر ہوا کہ شکایتیں بالکل غلط اور بے اصل تھیں مفسدوں کا ایک گروہ ان حضرات پر بہتان باندھ رہا تھا ورنہ عام پبلک ان حضرات سے خوش اور مطمئن تھی۔ کسی کو کوئی شکایت نہ تھی۔ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر اگرچہ الزام بالکل غلط تھا لیکن جعلی گواہوں کی گواہی کی وجہ سے ظاہری اعتبار سے قانوناً جرم ثابت ہو گیا اس لئے حضرت عثمانؓ نے ان پر حد خمر جاری کر دی حالانکہ وہ خود جانتے تھے کہ وہ بے قصور ہیں۔ ان واقعات کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے رشتہ دار عمال

کی رعایت کرتے تھے؟ پوری تاریخ کھنگال ڈالئے ایک واقعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس میں انہوں نے اپنے کسی رشتہ دار عامل کے بارے میں اس قسم کی رعایت کی ہو۔

دوسرا اور تیسرا الزام بھی بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک واقعہ بھی اس قسم کا ثابت ہے جس میں حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے سرتابی کی ہو یا اپنے حدود اختیار سے باہر کوئی قدم اٹھایا ہو اور اس کام کی نسبت حضرت عثمانؓ کی طرف کر دی ہو؟ سچ یہ ہے کہ یہ دعوٰی بے دلیل انتہائی ذلیل اور جھوٹ کا شاہکار ہے بلکہ واقعات تو اس کے خلاف اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ حضرت معاویہؓ حضرت عثمانؓ کے اسی قدر زیر اثر تھے جس قدر فاروق اعظمؓ کے زیر اثر تھے بطور نمونہ طبری میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمایئے کہ جب حضرت عثمانؓ کے حکم سے مالک اشتر وغیرہ مفسدوں اور سبائیوں کا ایک گروہ کوفہ سے اصلاح کے لئے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں بھیجا گیا ہے تو وہ وہاں پہنچکر موصوف کے ساتھ بے ادبی سے پیش آیا اور باوجود ہر طرح کی تالیف قلب اور افہام و تفہیم کے اپنے مفسدانہ خیالات و افعال سے باز نہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے اس کی بے ادبیوں پر صبر کیا اور سزا نہیں دی حالانکہ گروہ مفسدین یقیناً سخت سزا کا مستحق تھا اور انہیں اپنے حدود حکومت سے بھی نکالا جا سکتا تھا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے لکھکر دریافت کیا اور ان کے حکم کے مطابق انہیں مصر بھیجدیا یہ روایت بہت طویل ہے اور طبری جلد پنجم میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے کس قدر مطیع تھے اور کوئی اہم کام بغیر ان سے پوچھے نہ کرتے تھے

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے غلط اور جھوٹے الزام جن کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا حضرت علی مرتضیٰ کی طرف سے عائد کئے جا سکتے ہیں؟ کوئی ناصبی و خارجی ہی اس غلط بیانی اور کذب صریح کو جناب مرتضیٰ کی طرف منسوب کر سکتا ہے ہم اہلسنت کے نزدیک تو وہ سرتاج اولیاء اللہ تھے اس لئے ہم یقینی طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ کسی سبائی کی گھڑی ہوئی جعلی روایت ہے اور یقیناً یہ حضرت علی مرتضیٰؓ پر بہتان و افتراء ہے نہ وہ حضرت عثمانؓ کی زیر بحث پالیسی پر معترض تھے اور نہ انہوں نے ان پر

مندرجہ بالا الزامات لگا کے کسی سبائی جعلساز نے اپنے فاسد خیالات کو ان کی طرف منسوب کر دیا ہے وہ ان سے بالکل بری ہیں[1]۔

وضع اور جعلسازی کی علامتیں تو اس روایت میں اور بھی ہیں لیکن بخوف طوالت ہم انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا مقصد سے مودودی صاحب نے ایک اور روایت طبری سے نقل کی ہے کہ ایک دوسرے موقع پر حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے فتنہ کو فرو کرنے میں امداد کی فرمائش کی حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ سب فلاں فلاں آپ کے اقرباء و عمال کی وجہ سے ہو رہا ہے آپ ان کی سنتے ہیں میری نہیں سنتے ہیں۔ ص ۳۳۱-۳۳۲

اسی طرح طبری سے نقل کرتے ہیں کہ:۔

- اسی زمانہ فتنہ میں ایک اور موقع پر حضرت علیؓ سخت شکایت کرتے ہیں کہ میں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور مروان انہیں پھر بگاڑ دیتا ہے۔ ص ۳۳۲

یہ دونوں روایتیں سیف بن عمر کی بیان کردہ ہیں جس کا کذاب اور وضاع ہونا خود انہوں نے تسلیم کیا ہے ایسے جھوٹے شخص کی روایت ہرگز قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔

---

[1] اگر اس روایت کو صحیح سمجھا جائے تو مودودی صاحب کی تحقیق یہ ہونا چاہیے کہ خلافت کو ملوکیت کی طرف لے جانے میں حضرت علیؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ حضرت عمارؓ وغیرہم جلیل صحابہ مہاجرین و انصار شریک تھے اس لئے کہ باوجود ضرورت انہوں نے حضرت عثمانؓ کو معزول نہیں کیا اگر وہ انہیں معزول کر دیتے تو نہ وہ شہید ہوتے نہ جمل و صفین کی لڑائیاں ہوتیں نہ حضرت معاویہؓ خلیفہ بن سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ خلافت کبھی ملوکیت کی شکل نہ اختیار کرتی۔ معلوم نہیں مودودی صاحب نے حضرت عثمانؓ ہی کو کیوں اس جرم کا مرتکب سمجھا؟ اور ان سب حضرات کو بھی کیوں ذمہ دار نہیں قرار دیا؟ اور ان سب پر ذمہ داری ڈالنے کے بعد آخر بچا کون ہے؟

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ؎ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

درایت کی روشنی میں دیکھئے تو اس روایت کا دروغ اور جعلی ہونا اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ وہی سوال یہاں بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مبینہ طرز عمل اور اس پر اصرار دیکھنے کے بعد حضرت علیؓ و دیگر صحابہ نے انہیں معزول کیوں نہ کیا؟[1]

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاملات کو سلجھانے کے کیا معنی ہیں؟ یہی نا کہ حضرت علیؓ نے ان مخالفین سیدنا عثمانؓ کو ان کے اعتراضات و الزامات کے مسکت جوابات دیکر واپس کر دیا۔ حالانکہ جو الزام ان کے نزدیک بھی صحیح تھا اس کے متعلق ان کا یہ طرز شرعاً و اخلاقاً کیسے صحیح کہا جا سکتا ہے؟ اس صورت میں تو یہ گروہ حق پر تھا حضرت علیؓ کو حق کی حمایت کرنا چاہیے تھی اور حضرت عثمانؓ کو مجبور کرنا چاہیے تھا کہ ان کے مطالبات تسلیم کریں۔ ہاں کوئی ناصبی ہی یہ باور کر سکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے باطل کی حمایت کی ہوگی اور مظلوموں کو ان کی جائز شکایتوں اور الزاموں کے ایسے جوابات دیکر ساکت کر دیا ہوگا جن سے وہ خود مطمئن نہیں تھے۔ ہم اہلسنت کے نزدیک حضرت علیؓ اس قسم کے ذلیل طرز عمل سے بہت بلند و برتر ہیں۔ واضح رہے کہ مودودی صاحب کا یہ استدلال اس موقع پر کام نہیں دے سکتا کہ موصوف نے یہ طریقہ محض حضرت عثمانؓ کو قتل سے بچانے اور فتنہ و فساد کو روکنے کے لئے اختیار فرمایا تھا اس لئے کہ جس موقع کا ان روایتوں میں تذکرہ ہے اس میں یہ گروہ مفسد حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے نہیں آیا تھا نہ اس نے اس قسم کا کوئی ارادہ ظاہر کیا تھا

---

[1] ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے اس سلسلہ میں البدایہ والنہایہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ مخالفین سیدنا عثمانؓ نے کچھ لوگوں کو اہل مدینہ سے ان کے طرز عمل کے متعلق بحث و مباحثہ کیلئے بھیجا اور انہوں نے سیدنا عثمانؓ پر سخت الفاظ میں اپنے اقرباء کے معاملہ میں ان کی پالیسی پر اعتراض کیا مگر [illegible] اس سے مودودی صاحب نے استدلال کیا ہے یہ تو [illegible] دلیل [illegible] مصنف البدایہ نے نقل کر دیا ہے حقیقت واقعہ سمجھنا مودودی صاحب ہی کے ایسے محقق کا کام ہو سکتا ہے ورنہ کوئی صاحب عقل و انصاف [illegible] دلیل نہیں بنا سکتا اس کا ماحصل تو یہ ہے کہ چونکہ مخالفین حضرت عثمانؓ ان پر الزام لگاتے تھے اس لئے وہ صحیح ہیں کیا خوب استدلال ہے

وہ توجیسا کہ روایت میں ظاہر کیا گیا ہے خلیفۃ المسلمین پر و حضرت صحابہ کا دباؤ ڈلوا کر ان کی روش میں تبدیلی پیدا کرانے کے لئے آیا تھا۔ فتنہ کو روکنے کی بھی یہی صورت تھی کہ جناب مرتضیٰؓ و دیگر صحابہؓ حضرت عثمانؓ پر دباؤ ڈال کر ان کی مبینہ پالیسی تبدیل کرادیتے یا انہیں معزول کردیتے یا کم از کم باہر سے آنیوالے اس مفسد گروہ سے مناظرہ کرنے کے بجائے اس سے وعدہ کرتے کہ ہم تمہارے جائز مطالبات پورے کرادیں گے۔ تم واپس جاؤ اس بحث سے بالکل واضح ہوگیا کہ یہ روایتیں محض من گھڑت افسانے اور بالکل موضوع قصے ہیں حضرت علیؓ و دیگر صحابہؓ ہرگز حضرت عثمانؓ کی پالیسی سے ناراض نہ تھے حضرت علیؓ کی طرف ان باتوں کی نسبت ان پر اور حضرت عثمانؓ دونوں پر بہتان و افتراء ہے مودودی صاحب نے حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کا جو قول طبری سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم انہیں اپنی پالیسی ترک کرنے پر آمادہ کرنا چاہتے تھے ان دونوں حضرات پر افتراء ہے اور سبائیوں کی وضع کی ہوئی روایت ہے، روایت کے لحاظ سے بھی یہ ناقابل قبول ہے اور درایت کے اعتبار سے بھی اس پر مذکورہ بالا اعتراضات وارد ہوتے ہیں علاوہ بریں اگر ان دونوں حضرات یا حضرت عائشہؓ کے نزدیک حضرت عثمانؓ کی مبینہ پالیسی ناپسندیدہ ہوتی تو قطعاً یہ قاتلین عثمانؓ کے اس قدر سخت مخالف نہ ہوتے اور حضرت علیؓ سے بیعت کرنے کے بعد ان کے مخالف کیمپ میں نہ پہنچ جاتے۔ یہ بالکل فطری اور نفسیاتی بات ہے کہ کسی کو مظلوم سمجھنے کے باوجود اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اس ظلم کا اصل محرک خود یہی شخص تھا تو انسان کی ہمدردی مظلوم کے ساتھ کم ہوجاتی ہے اور اس کا انتقام لینے کا جذبہ اول تو ابھرتا ہی نہیں ہے اور اگر ابھرتا بھی ہے تو اتنا شدید نہیں ہوتا کہ آدمی جدال و قتال میں شریک ہوکر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے۔ ام المومنینؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ کا مابعد کا طرز عمل اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ ان کی طرف یہ اقوال غلط منسوب کئے گئے ہیں وہ ہرگز ان کے قائل نہ تھے یہ کسی سبائی کی گھڑی ہوئی روایت ہے یا خود طبری کا وضع کیا ہوا بہتان اور جھوٹ ہے۔

آراء و اقوال

مودودی صاحب نے اپنے باطل دعوے کی سند میں چند اکابر علماء کے

اقوال بھی نقل کئے ہیں ان میں سرفہرست علامہ محب الدین طبری کی کتاب الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ سے حضرت سعید بن المسیب کا قول ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے اقرباء کو منصب دینے کے بارے میں حضرت عثمانؓ کی پالیسی سے عام طور پر صحابہ کرام ناراض تھے (ص ۳۳۳) اس روایت کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

علامہ محب طبری اور امام ابن شہاب زہری کے درمیان کئی صدیوں کا فاصلہ حائل ہے لیکن روایت عن ابن شہاب سے شروع ہوتی ہے ان دونوں کے درمیان کے راویوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے دوسرے الفاظ میں بے سند غیر مستند روایت ہے جو ہر سمجھدار آدمی کے نزدیک ساقط الاعتبار رہے۔

یہ تو روایت کا پہلو ہوا۔ درایت کے زاویہ سے تو اس پر سبائی کارخانے کی چھاپ بہت صاف نظر آتی ہے پہلا سفید جھوٹ تو اس میں یہ ہے کہ:

لما ولی عثمانؓ کرہ ولایتہ نفر من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لان عثمانؓ کان یحب قومہٗ	جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو صحابہ کرام کی ایک جماعت نے ان کی خلافت کو اس لئے ناپسند کیا کہ وہ اپنی قوم سے محبت رکھتے تھے۔ (ص ۳۳۳)

حدیث و تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنانا کسی صحابی کو بھی ناپسند نہ تھا سب خوش تھے اور سب نے بہت خوشی و مسرت و اطمینان کے ساتھ ان کی خلافت کو قبول کیا۔

دوسرا جھوٹ تو اس سے بھی زیادہ سفید اور جعلی ہے لکھتے ہیں:

وکان کثیراً ما یولی بنی امیہ من لم یکن لہ صحبۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اور (حضرت عثمانؓ) بکثرت بنی امیہ کے ایسے لوگوں کو گورنر بنایا کرتے تھے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل نہ تھا (حوالہ بالا)

یہ تو اس قدر غلط بات ہے کہ آج کا کوئی سبائی بھی اسے صحیح کہنے کی جراءت نہیں کرسکتا جس شخص کو

حدیث و تاریخ سے ذرا بھی مس ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت سعیدؓ بن العاص حضرت عبد اللہ بن ابی سرح حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہم سب حضرات صحابی تھے حضرت مروانؓ کے متعلق اختلاف ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ بھی صحابی تھے اور اعتراض انہیں حضرات کے متعلق کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ بے اصل و بے سند روایت ہر طرح مہمل اور لغو ہی ٹھہرتی ہے اسے جھوٹ کی پوٹ کہئے تو بجا ہے واقدی وغیرہ کسی سبائی نے اسے گڑھنے میں اس قدر شغف سے کام لیا کہ اس کی قوت حافظہ جواب دے گئی اور " دروغ گو را حافظہ نہ باشد " کی مثل اس پر چسپاں ہوگئی ابن شہاب و سعید بن المسیب اس روایت و قول سے بالکل بری ہیں کسی سبائی کا ان پر افترا اور بہتان ہے۔ محب طبری نے اس کا تذکرہ استطراداً کر دیا ہے یعنی انہیں یہ دکھانا ہے کہ اس فتنۂ عظیمہ کے بارے میں کیسی کیسی افواہیں اور جھوٹی روایتیں مشہور ہوگئی تھیں ان میں ایک یہ بھی ہے کتاب میں درج کرنے کے ہرگز معنی نہیں ہیں کہ وہ اسے صحیح بھی سمجھتے ہیں اور اگر صحیح بھی سمجھتے ہوں تو ان کے کہہ دینے سے غلط بات صحیح نہیں ہو جائے گی۔

مولانا نے علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہما اللہ کے اقوال بھی اپنی تائید میں نقل کئے ہیں ان کے متعلق چند باتیں عرض کر دوں تاکہ ناظرین اس مغالطہ سے محفوظ رہیں جس میں انہیں مودودی صاحب نے مبتلا کرنا چاہا ہے۔

اوّل۔ یہ ان حضرات کی رائے ہے روایت نہیں ہے تاریخی واقعات روایت سے ثابت ہوتے ہیں نہ کہ رائے سے، اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ وہی رائے رکھتے ہیں جو مودودی صاحب نے ظاہر فرمائی ہے تو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انہوں نے بھی یہ رائے انہیں روایتوں کی بنا پر قائم کی ہے جو موصوف کا سرمایہ استدلال ہیں جب ان روایات کا غلط ہونا ثابت ہوگیا تو موصوف کی رائے کے ساتھ ان حضرات کی رائے کا غلط ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

دوّم:۔ عربی کی ایک مثل ہے۔ لکل فن رجال، ہر علم و فن کے مسئلہ میں اس کے ماہرین کی رائے

وزنی ہوتی ہے یہ دونوں بزرگ حدیث کے ماہر تھے تاریخ کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا نہ اس علم میں ان کا کوئی خاص درجہ ہے مسئلہ کا تعلق تاریخ سے ہے اس لئے ان حضرات کی رائے اس مسئلہ میں بالکل بے وزن ہے۔

مصوم: یہ باتیں تو میں نے تسلیم کر کے عرض کی ہیں کہ یہ ان حضرات کی رائے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی کوئی رائے اس معاملہ میں نہیں ظاہر کرتے ہیں بلکہ تاریخ (طبری وغیرہ) میں جو درج ہے اسی کو نقل کر دیتے ہیں اور باوجود اس کے یہ بیان مودودی صاحب کی رائے سے خاصا اختلاف رکھتا ہے علامہ ابن حجرؒ یہ تو فرماتے ہیں ذکان من حج منہم تشکوا من ا ـــــــ ۳۴۴) اور ان میں سے جو حج کرنے آتے تھے وہ اپنے امیر کی شکایت کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ شکایت کرنیوالے کون تھے؟ اور منہم سے کیا مراد ہے؟ اس اختصار سے مودودی صاحب فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں حالانکہ اس واقعہ کا انکار علامہ کیسے کر سکتے تھے کہ شکایت کرنیوالے یہی سبائی یا ان کے ایجنٹ ہوتے تھے۔ علامہ یہاں اس کی تصریح نہیں کرتے ہیں لیکن ان کی مراد وہی سمجھی جائے گی جو واقعہ کے مطابق ہے اور تاریخی روایات سے ثابت ہے یعنی ان کا اشارہ سبائیوں کی طرف سمجھا جائے گا اس کے بعد علامہ لکھتے ہیں وکان یستبدل ببعض امراءہ خشیۃ منہم ثم یعیدہ لا بعد ... وہ اپنے بعض امراء کو بدل دیتے تھے اور اس طرح انہیں راضی کر دیتے تھے اور پھر انہیں امراء کو دوبارہ مقرر کر دیتے تھے۔ مودودی صاحب سے گزارش ہے کہ آخر اس میں کون سی بات آپ کے موافق ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ شکایت کرنیوالے سبائیوں اور مفسدوں کی اس قدر رعایت فرماتے تھے کہ اپنے عامل کو معزول کر کے انہیں خوش کر دیتے تھے پھر اگر کسی مصلحت سے دوبارہ مقرر کر دیتے تھے تو یہ اعتراض کا سبب نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ دوبارہ شکایت ہوتی تو پھر معزول کر دیتے تاریخ شاہد ہے کہ یہ شکایتیں بالکل جھوٹی اور غلط تھیں اور شاکی صرف مٹھی بھر مفسد سبائی تھے عوام ہرگز شاکی نہ تھے پھر بھی ان مفسدوں کی اتنی رعایت، یہ خوبی ہوئی یا عیب؟ علامہ انور شاہ صاحب کی عبارت سمجھنے میں بھی مودودی صاحب کو مغالطہ ہوا۔ مگر یہ مغالطہ بہت تعجب خیز ہے اس لئے انہوں نے پہلے تو بعض مورخین کا بیان نقل کیا ہے۔ یہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہے پھر آخری جملے میں تو انہوں نے اس کی غلطی واضح فرما دی؛

تحریر فرماتے ہیں: ثم ان عثمانؓ وان لم یعزل اقاربہ من عمل شکایات الناس لکنہ لم یحمھم ص ٣٣٥ "پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اگرچہ اپنے رشتہ داروں کو لوگوں کی شکایتوں پر معزول نہیں کیا مگر آپ نے ان کی حمایت بھی نہیں کی:

مودودی صاحب فرمائیں کہ اس عبارت سے ان کی رائے فاسد کی تائید کدھر سے نکلتی ہے؟ مولانا کاشمیری تو یہ فرما رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ بالکل بے قصور تھے اور اس فتنہ کو برانگیختہ ہونے میں ان کے کسی فعل کو دخل نہ تھا اگر وہ اپنے اقرباء کی بے جا حمایت کرتے تو ان پر الزام لگانا صحیح ہوتا مگر انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا اس لئے وہ بری الذمہ ہیں اور مودودی صاحب اپنی محققانہ خوش فہمی سے اس تردید کو اپنی تائید قرار دے رہے ہیں۔ ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

ان کے بعض مقلد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ کے متعلق کہتے ہیں کہ انہوں نے بھی تحفۂ اثنا عشریہ میں حضرت عثمانؓ اور ان کے بارے میں وہی لکھا ہے جو مودودی صاحب نے تحریر کیا ہے یہ محض ان لوگوں کی خوش فہمی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے ہرگز وہ بات نہیں لکھی، نہ انہوں نے ان عمال پر مبینہ الزامات کو صحیح فرمایا ہے اور نہ حضرت عثمانؓ کو ان کی طرف سے چشم پوشی کا مرتکب قرار دیا ہے، بلکہ وہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے طعن کا جواب عمال پر مبینہ الزامات کی صحت فرض کر کے دے رہے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو الزامات سبائی ان کے عمال پر لگا رہے تھے اگر انہیں صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو بھی ان پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انہوں نے عمال عثمانی پر مبینہ الزاموں کو تسلیم کر لیا۔ اس کی صراحت فرما رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ان شکایات پر توجہ فرمائی۔ ان حضرات کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

اگر از ان اشخاص در بعضے امور خلاف ظن عثمانؓ ظاہر شد عثمان را چہ تقصیر؟

اگر ان اشخاص سے بعض امور میں حضرت عثمانؓ کے گمان کے خلاف باتیں سرزد ہوئیں تو حضرت عثمانؓ کا کیا قصور ہے؟

(تحفہ اثنا عشریہ بیان مطاعن عثمانؓ ص ٣٠٥)

شرط کے ساتھ بیان کرنا اس کی علامت ہے کہ یہ جواب عمال پر مطاعن کو صحیح فرض کر کے دیا گیا ہے، نہ کہ ان کی صحت تسلیم کر کے اور اس فرضی صورت میں بھی حضرت عثمانؓ کو بے قصور کہا گیا ہے۔ آگے چل کر حضرت عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

ایں ہمہ شکایات کہ اکثر بے حقیقت بودند	ان کی یہ سب شکایتیں جو خلافت مدینہ طیبہ پہنچائی تھی،
طوفان ہائے عبد اللہ بن سبا و اخوان او بود	عبد اللہ بن سبا کی طوفانیاں اور اس کی پارٹی کے
(ص ۸۸)	آدمی تھے۔

بہر حال انہوں نے مجموعی حیثیت سے جملہ عمال کے خلاف مبینہ شکایات کو کم از کم مشکوک بلکہ در حقیقت غلط قرار دے دیا۔ ظاہر ہے کہ جب ابن سبا کے چیلے ان کی جھوٹی شکایتیں کرنے میں مصروف تھے تو کس شکایت کو صحیح کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔

تنویر مزید

مودودی صاحب کا دعویٰ تھا کہ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ نے جو اپنے بعض اقارب کو مناصب عطا فرمائے تھے اس کی وجہ سے ممالک اسلامیہ میں عام بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ بھی ان سے ناراض تھے اور ان کے اس طرز عمل کو ناپسند فرماتے تھے مگر مندرجہ بالا ابحاث و تحقیق سے آفتاب کی طرح روشن ہو گیا کہ ان کا دعویٰ بالکل باطل ہے اور وہ اس کی ایک دلیل بھی نہیں پیش کر سکے۔ ان کے دعوے کی بنیاد سبائیوں کی وضع کی ہوئی جھوٹی روایتوں پر ہے جن کی کوئی اصل نہیں ہے اور جن کا مدار واقدی سیف بن عمر وغیرہ اول درجہ کے جھوٹے اور بد ترین درجے کے کذاب اور وضاع راویوں پر ہے جو در حقیقت سبائیوں اور یہودیوں کے ایجنٹ اور ان کے پانچویں کالم میں داخل تھے[1]۔ اس قسم کی بعض

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

روایتیں اس وقت گھڑی گئی ہیں جب دولت بنوامیہ کا نیّر اقبال غروب ہو چکا تھا، اور ان کا مقصد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک اکرو وظیفہ ثابت کرنا اور اس نفرت کو کم کرنا تھا جو ان مفسد سبائیوں سے عام مسلمانوں کو پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے علاوہ بھی بعض سیاسی اور بعض ذاتی مقاصد ان لوگوں کے پیش نظر تھے جن کی تفصیل موجب طوالت ہوگی۔

مودودی صاحب کے نظریہ کے ابطال کے لئے اتنا ہی کافی ہے لیکن بحث پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے ہم چند باتیں اور عرض کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ ممالک اسلامیہ کے عوام و خواص اور اخص الخواص یعنی صحابہ کرام سب سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے عمال سے

ف ۱ طبری وغیرہ میں اس قسم کے راویوں سے بہت سی ایسی روایتیں بھی منقول ہیں جن سے حضرت عثمانؓ اور بعض دیگر اموی صحابہ کرام کی منقبت ظاہر ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود دشمن صحابہ اور سبائیوں کے ایجنٹ ہونے کے یہ ایسی روایتیں کیوں بیان کرتے تھے؟ لیکن جو شخص سبائیوں کی فریب کاریوں اور ان کی تکنیک سے باخبر ہے اسے اس قسم کا خلجان نہیں پیدا ہو سکتا۔ انہوں نے اہل سنت کو شیر بنی میں زہر ملا کر پلانے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس قسم کی روایتیں اس لئے بیان کرتے تھے تاکہ ان کی سبائیت آشکارا نہ ہو جائے۔ یورپ و امریکہ کے بہت سے مستشرقین بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور اسلام کے ساتھ ہمدردی کے اظہار اور اس کی تعریف و توصیف پر سینکڑوں صفحات لکھ کر بیچ میں الحاد، زندقہ اور عداوت اسلام کے جراثیم خفیہ چھپا دیتے ہیں، دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ روایتیں اہل سنت میں اتنی مشہور تھیں کہ انہیں چھپانا ان کذابوں کی استطاعت سے باہر تھا اس لئے انہیں بیان کرنے پر مجبور رہے۔ ہاں اگر کہیں ان میں بھی مخالفانہ آمیزش کا موقع مل گیا تو اس سے چوکے بھی نہیں۔ بالکل اصول بات ہے کہ دشمن کی شہادت اگر اپنے موافق ہو تو واجب القبول ہوتی ہے۔ اس لئے ان دشمن صحابہ اور سبائیت کے ایجنٹ راویوں کی جو روایتیں حضرت عثمانؓ یا دیگر صحابہؓ کی تعریف و منقبت میں ہیں اور جن سے ان حضرات کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ یا بنی امیہ کی تائید میں ہیں وہ یقیناً قبول کی جائیں گی۔

خوش اور مطمئن تھے اور کوئی بھی ان سے ناراض نہ تھا بس مفسدوں اور سبائیوں کی ایک پارٹی تھی جو شورش اور فتنہ پیدا کرنا چاہتی تھی، اور جس کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اس سلسلہ میں طبری کی مندرجہ ذیل روایت ملاحظہ فرمائیے۔ جب یہ سبائی جمع ہو کر حضرت عثمانؓ کے پاس آئے تاکہ ان پر کچھ اعتراضات کریں اور واپس جاکر عوام میں ان کے جوابات کو توڑ مروڑ کر ان کے خلاف پروپیگنڈہ کریں اس طرح ان کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے زمین ہموار ہو جائے تو حضرت عثمانؓ نے مسجد نبوی میں بلایا اور منادی کرا کے اہل مدینہ کو بھی جمع کیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :۔

فاقبل اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واحاطوبہ محمد اللہ اثنی علیہ واخبرھم خبر القوم وقام الرجلان فقالوا جمیعًا اقتلھم۔	صحابہ کرام جمع ہو گئے اور سب حضرت عثمانؓ کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ حضرت عثمانؓ نے اللہ تعالٰی کی حمد و ثنا کے بعد ان (مفسدوں) کے بارے میں انہیں مطلع فرمایا اور وہ دونوں شخص (مفسدوں میں سے) کھڑے ہو گئے
(طبری جلد پنجم احوال ۳۵ھ مطبوعہ مصر)	(اس کے بعد) سب صحابہ کرام نے کہا کہ آپ ان سب کو قتل کر دیجئے۔

اس روایت سے عیاں ہے کہ صحابہ کرام ہرگز حضرت عثمانؓ سے ناراض نہ تھے ورنہ کبھی ان مفسدوں کے قتل کا مشورہ نہ دیتے اگر وہ ان کی شکایتوں کو صحیح سمجھتے تو یقیناً کہتے کہ امیر المومنین ہم تو آپ سے پہلے ہی کہتے تھے کہ اپنی پالیسی بدل دیجئے اور ان کی شکایتوں کو دور کر دیجئے۔

۲۔ اسی روایت میں مندرجہ بالا مضمون سے کچھ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مصر کے مفسد والیٔ کوفہ و بصرہ کے مفسدوں کو مدینہ میں جمع ہونے کے لئے لکھا لیکن ،

ولم ینہض الا اھل الکوفۃ	اور سوا اہل کوفہ کوئی کھڑا نہیں ہوا۔
(حوالہ بالا)	

اگر بقول مودودی صاحب حضرت عثمانؓ کے خلاف عوام و خواص میں بے اطمینانی تھی تو مخالفت کرنے والوں میں یہ کمی کیوں نمایاں ہوئی کہ عوام تو عوام خود مفسدین کی پارٹی کے قلیل التعداد افراد نے بھی موقع پر پیٹھ دکھا دی۔

۳۔ مودودی صاحب نے خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق طبقات ابن سعد (ج ۳) سے نقل کیا ہے۔

• جب شورش برپا کرنے والوں کی طرف سے معزولی کا مطالبہ شدت پکڑ گیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ انہوں نے کہا۔ آپ مسلمانوں پر یہ دروازہ نہ کھولیں کہ جب کچھ لوگ اپنے امیر سے ناراض ہوں تو اسے معزول کردیں۔"

(ص ۱۱۹)

سوال یہ ہے کہ اگر بقول مودودی صاحب صحابہ کرام اور سب خواص و عوام حضرت عثمانؓ اور ان کی پالیسی سے ناراض تھے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے انہیں منصب خلافت پر قائم رہنے کا مشورہ کیوں دیا؟ یہ تو اس کا بہترین موقع تھا کہ وہ انہیں مستعفی ہو جانے کا مشورہ دیتے تاکہ ان کے قتل تک نوبت نہ پہنچتی اور بقول مودودی صاحب ان کی غلط پالیسی بھی ختم ہو جاتی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب ان کے خلاف ناراضگی عام تھی، یہاں تک کہ صحابہ بھی (جن میں ابن عمرؓ بھی شامل تھے) ان سے ناخوش تھے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ جب کچھ لوگ اپنے امیر سے ناراض ہوں۔ کیا مودودی صاحب کی لغت میں "کچھ" کے معنی "سب" کے ہیں؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مودودی صاحب

کا دعویٰ بالکل غلط اور باطل ہے، سوا تھوڑے سے شورش پسندوں کے کوئی بھی ان سے ناراض نہ تھا اور ان کے طرز عمل سے عوام و خواص سب مطمئن تھے۔

(۴) اگر صحابہ کرام حضرت عثمانؓ کی مبینہ پالیسی سے ناراض ہوتے تو مفسدوں کو ان کی طرف سے جعلی خطوط لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے صحابہ کرام کے نام سے خود جعلی خطوط لکھکر اس طرح بہت سے لوگوں کو فریب دے کر مدینہ بلایا تھا۔

وزورت کتب علی لسان الصحابۃ الذین بالمدینۃ وعلی لسان علیؓ وطلحۃؓ والزبیرؓ یدعون الناس الی قتال عثمانؓ ونصر الدین وانہ اکبر الجہاد الیوم۔	مدینہ میں رہنے والے حضرات صحابہ کی جانب سے ان دسیانی مفسدوں نے جعلی خطوط لوگوں کو لکھے جس میں انہیں حضرت عثمانؓ سے قتال کی دعوت دی اور اسے نصرت دین اور اکبر الجہاد ظاہر کیا۔ حضرات علیؓ و طلحہؓ و زبیر کی جانب سے بھی ایسے ہی جعلی خطوط لکھے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ہفتم ذکر مجئی الاحزاب الی عثمان المرۃ الثانیہ)

اسی سلسلہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ کی جانب سے بھی ایسے ہی خطوط لکھے گئے، جب ان سے عرض کیا گیا تو انہوں نے انکار کیا حضرت زبیرؓ کا انکار تو خود مودودی صاحب نے طبری سے نقل کیا ہے (ص ۳۳۲) مگر معلوم نہیں ان کے استفہام انکاری سے یہ الٹا نتیجہ کس قاعدے اور اصول کی بناء پر نکالا کہ انہوں نے ایسے خطوط لکھے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے بھی اس کا اقرار نہیں کیا ہے۔ مفسدوں نے ان سے کہا تھا کہ آپ نے ایسے خطوط لکھے، لیکن انہوں نے تو اس کا اعتراف نہیں کیا۔ مگر مودودی صاحب کی خوش فہمی ملاحظہ ہو کہ مفسدوں کے اس افترا

کو حجت بنا رہے ہیں۔ فیا للعجب۔